(بگاڑ، جھگڑا، خرابی، تباہی) **تبادلۂ خیال:** (دو یا دو سے زائد اشخاص کا باہم اظہارِ رائے) **غیر معمولی:** (اہم، جو عام اور معمولی نہ ہو) **خلافِ معمول:** (خلافِ دستور) **تمتمانا:** (خارجی یا اندرونی گرمی یا کسی جذبے کے اثر سے چہرے کا سُرخ ہو جانا) **چمک جانا:** (روشن ہو جانا) **مفکرانہ:** (مفکروں جیسا، غور و فکر والا) **درویش:** (فقیر، صاحبِ معرفت، خدا رسیدہ) **سر پٹکنا:** (تلملانا، پیچ و تاب کھانا، افسوس کرنا، ہاتھ ملنا) **بابت:** (بارے میں، باب میں) **تگڑا:** (تندرست، تنومند، موٹا تازہ، ہاتھ پاؤں سے مضبوط) **سدا:** (ہمیشہ، دائم) **راج کرنا:** (حکومت کرنا، فرماں روائی کرنا، عیش کرنا) **نفرت:** (کسی چیز سے بھاگنا، بے زاری، انتہائی ناپسندیدگی، کراہت) **سکہ چلانا:** (رُعب قائم کرنا، حکومت جمانا) **تنفر:** (نفرت، کراہت، بے زاری) **ذلیل:** (بے عزت، بے وقعت، حقیر) **متلی:** (جی متلانا، قے کی خواہش ہونا) **جھریاں:** (بڑھاپے کی وجہ سے جلد پر پڑ جانے والی لکیریں یا شکنیں، سلوٹیں) **جھلی:** (باریک پردہ جو گوشت کے مختلف حصوں پر مختلف صورتوں میں منڈھا ہوتا ہے) **مکدر:** (کدورت آمیز، ناراض، غمگین، رنجیدہ، اداس)

نمبر 61 **سمیت:** (ساتھ، ہمراہ، بشمول) **آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک ہی بن بیٹھے:** (مثل: ذرا سا بہانہ بنا کر قبضہ جمالینا) **ناک میں دم کرنا:** (پریشان کرنا، ستانا، عاجز کرنا، تنگ کرنا) **رُعب گانٹھنا** (رُعب جمانا، حکم چلانا) **باوا:** (باپ، والد) **سینے کی آگ اُگلنا:** (دل کی بھڑاس نکالنا، غضب ناک ہونا، غصہ نکالنا) **دھپ:** (دھول، تھپڑ، گھونسا) **گٹ پٹ:** (ایسی بات جو سمجھ نہ آسکے، نامانوس گفت گو) **ملعون:** (جس پر لعنت کی گئی ہو، پھٹکارا ہوا، مردود) **ٹلنا:** (جگہ سے ہٹنا، اِدھر اُدھر ہو جانا، کسی طرف نکل جانا) **مردود:** (رد کیا گیا، رد کیا ہوا، بے عزت کیا گیا، کم بخت، بدذات) **ہتک** (بے عزتی، توہین، کسی کی شان میں گستاخی) **بُڑبُڑانا:** (زیرِ لب کسی کو بُرا کہنا، بوڑھوں کی طرح چپکے چپکے بولنا) **لاٹ صاحب:** (لیفٹیننٹ گورنر، یا گورنر جنرل، وائسرائے، بڑے عہدے دار یا صاحبِ اقتدار کے لیے طنزاً بولتے ہیں) **ناز اٹھانا:** (ناز نخرے برداشت کرنا، چونچلے گوارا کرنا، بدمزاجی سہنا) **منحوس:** (نحس، بدقسمت، بدنصیب، جس کی نحوست کا کسی کے حالات پر اثر پڑ سکے، نامبارک) **خون کھولنا:** (طیش آنا، بہت زیادہ غصہ آنا) **نفاذ:** (اجرا، فرمان یا حکم جاری ہونا) **بیاج:** (سود، بڑھوتری، زیادتی) **دریافت کرنا:** (پتہ لگانا، ڈھونڈنا، کھوج لگانا، معلوم کرنا) **چابک:** (تازیانہ، کوڑا، ہنٹر، لکڑی یا بید وغیرہ کی چھوٹی سی چھڑی جس میں چمڑا یا سوت وغیرہ کی ڈوری بندھی ہوتی ہے) **پیٹنا:** (مارنا، جسمانی سزا دینا) **باگ:** (لگام، راس، عنان) **ہوا سے باتیں کرنا:** (نہایت تیزی سے آگے بڑھنا، بہت تیز دوڑنا، تیز رفتار ہونا) **ڈکار:** (وہ آواز جو معدے سے منہ کی راہ ہوا خارج ہوتے وقت نکلتی ہے) **ایسی کی تیسی:** (بات چیت میں برہمی کے موقع پر ایک طرح کی توہین و تشنیع کا فقرہ) **خلافِ معمول:** (توقع کے برخلاف، حیران کن، چونکانے والا) **جان پہچان:** (واقفیت، آشنائی، شناسائی، صاحب سلامت) **طوفان برپا کرنا:** (جھگڑا کرنا، غُل غپاڑہ کرنا) **آہنی:** (لوہے یا فولاد سے بنی ہوئی چیز، مضبوط، سخت)

نمبر 62 **اندیشہ:** (خطرہ، شک، شبہ، کھٹکا) **کھٹیا:** (چھوٹی چارپائی، چھوٹا پلنگ) **کھٹمل:** (ایک سُرخ رنگ کے کیڑے کا نام جو اکثر موسم برسات میں پلنگ اور چارپائی وغیرہ میں پیدا ہو کر آدمی کا خون پیتا ہے) **مسرور:** (خوش، شاد، شادماں، مگن) **تھوتھنی:** (جانور کا منہ، حقارتاً انسان کا منہ، گھوڑے یا اُونٹ کا منہ) **خلط ملط:** (گڈمڈ، مخلوط، ملا جلا، بکھرا، بے ترتیب) **بغاوت:** (حکومتِ وقت کے خلاف اجتماعی قانون شکنی، لوٹ مار، تشدد، فساد) **پیش خیمہ:** (کسی واقعہ کی تمہید) **بیرسٹر:** (وہ وکیل جس نے ولایت سے وکالت کی ڈگری لی ہو) **فیڈریشن:** (اجتماع، وفاقیت، وفاقی انجمن یا جماعت) **حقارت کی نظر سے دیکھنا:** (ذلیل سمجھنا، کم درجے کا سمجھ کر توجہ نہ دینا) **ٹوڈی:** (ذلیل، خوشامدی، چاپلوس) **تمیز:** (جدا کرنا، علیحدہ کرنا) **اہلیت:** (قابلیت، لیاقت، صلاحیت)

نمبر 63 **مزنگ** (جسے مُزنگ چونگی بھی کہا جاتا ہے، لاہور کے ایک علاقہ کا نام) **گریجویٹ** (ماسٹر ڈگری سے نیچے کا سند یافتہ جیسے: بی اے، بی کام، بی ایس سی، بی ایڈ وغیرہ) **مارے مارے پھرنا:** (آوارہ و سرگرداں پھرنا، دھکے کھاتے پھرنا) **گھوڑے کا ساز:** (گھوڑے اور دیگر جانوروں کی آنکھوں پر باندھنے کا پردہ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جانور کو عقب کا منظر دکھائی نہ دے، جسے اندھیری اور چشم بند بھی کہتے ہیں) **نکل:** (یہ ایک کیمیائی عنصر ہے جو دھات میں شمار ہوتا ہے) **دمکنا:** (چمکنا، درخشاں ہونا، تاباں ہونا) **درخشاں:** (چمکتا ہوا، روشن چمکیلا، پُرنور) **تاباں:** (روشن، منور، چمک دار، نورانی) **اصطبل:** (گھوڑے، خچر وغیرہ کو باندھنے اور رکھنے

کا مکان، گھوڑوں کا تھان) **دُھندلکا:** (صبح کاذب، جب فضا تاریک ہو، ہلکا اندھیرا، نیم تاریکی) **کلغی:** (پرندوں کے خوش نما پر جو بادشاہ اپنے تاج، ٹوپی یا پگڑی میں لگاتے ہیں، گھوڑے کے چہرے کے ساز کا زیور جو خوش نمائی کے لیے سر کے اوپر کے چمڑے پر لگایا جاتا ہے) **آنہ:** (پُرانے روپے کا سولہواں حصہ، پرانے چار پیسے، پرانا سکہ جو چار پیسوں کے برابر ہوتا تھا) **جھنجھناہٹ:** (جھن جھن کی آواز، گھنگروؤں کی آواز، جھانجھ یا پاؤں کے زیور کی آواز، جھنکار)

نمبر 64 **رعونت:** (غرور، گھمنڈ، ناز) **خوش پوش:** (صاف اور عمدہ لباس پہننے والا، خوش لباس، خوش پوشاک) **خیرہ کن:** (چکا چوند پیدا کرنے والا، حیرت میں ڈالنے والا، حیرت انگیز) **بھیڑ:** (مجمع، آدمیوں کا جماؤ، جمگھٹا) **دعوتِ نظارا:** (دیکھنے کی دعوت دینا، زیارت کی دعوت دینا) **انگ:** (جسم، بدن) **سبب:** (وجہ، علت، موجب) **برسنا:** (ڈانٹنا، غصہ کرنا، جھڑکنا) **تشکیل:** (شکل بنانا، صورت بنانا، شکل دینا) **نڈھال:** (تھکا ماندہ، ناتواں، کمزور) **نشست:** (بیٹھنے کی جگہ، بیٹھنے کا طور طریقہ) **باگ:** (لگام، راس)

نمبر 65 **ہنہنانا** (گھوڑے کا بولنا، گھوڑے کا اپنی قدرتی آواز نکالنا) **قیاسات** (اندازے، گمان، فکری عمل) **سوچ بچار** (غور و فکر، خیال) **غرق** (ڈوبنا، ڈوبا ہوا، کھویا ہوا، محو) **بیدار** (جاگتا ہوا، ہوشیار جو سویا یا مدہوش نہ ہو) **بھسم کر دینا:** (نذرِ آتش کر دینا، جلا ڈالنا، راکھ کرنا) **لرزش:** (لرزنے کی کیفیت، رعشہ، جنبش، کپکپی) **نوکیلا:** (نوک دار، چبھنے والا) **غیر مرئی:** (جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے، محسوساتی، خیالی) **طوعاً و کرہاً:** (چار و ناچار، خواہ مخواہ) **چلانا:** (چیخنا، غُل مچانا، شور کرنا، زور زور سے آواز نکالنا) **پست قد:** (چھوٹے قد کا، کوتاہ قامت، ٹھگنا) **چشم زدن میں:** (ذرا سی دیر میں، لمحہ بھر میں)

نمبر 66 **ششدر:** (عاجز، حیران، متحیر، پریشان) **متحیر ہونا:** (حیران ہونا، دنگ رہ جانا، ہکا بکا ہونا) **گھونسا:** (مُکا، دھموکا، گھوسا) **اکڑفوں:** (شان و شوکت کا اظہار، اینٹھ اور گھمنڈ) **وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے:** (وہ دن نکل گئے جب خلیل خاں عیش کرتے تھے۔ وہ مزے کے دن تو نکل گئے، اب تو پھٹے حال ہیں۔)

توضیحات

اسپین: ہسپانیہ (ہسپانوی: Espana اسپانیا) سرکاری طور پر مملکت ہسپانیہ، کاستین، کتالان، باسک سمیت بہت سی قدیم قوموں کا ملک ہے۔ مغرب کی جانب یہ پرتگال، جنوب سے جبل الطارق اور مراکش اور شمال مشرق میں انڈورا اور فرانس کے ساتھ ملتا ہے۔

اسپین کی جنگ: اسپین میں خانہ جنگی تھی جو 1936ء سے 1939ء تک جاری رہی۔ جس کی سربراہی ایسے فوجی گروپ کے ذریعے کی گئی تھی جس میں جنرل فرانسسکو فرانکو نے جلد ہی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس وقت کی بین الاقوامی سیاسی آب و ہوا کی وجہ سے، اس جنگ کے بہت سے پہلو تھے اور اسے طبقاتی جدوجہد مذہب کی جنگ، آمریت اور جمہوری جمہوریہ کے مابین جدوجہد، انقلاب اور انسدادِ انقلاب کے درمیان اور فاشزم اور اشتراکی نظریہ کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے لیے اسے اکثر "ڈریس ریہرسل" کہا جاتا ہے۔ نیشنلسٹوں نے جنگ جیت کر نومبر 1975ء میں فرانکو کی موت تک اسپین پر حکمرانی کی۔

چھاؤنی: وہ مقام جہاں فوج مستقل یا عارضی طور پر رہے۔ لشکر گاہ سپاہیوں کی بیرکیں، کیمپ، پڑاؤ۔

کوڑھ: ایک مرض جو فسادِ خون سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں یا تو بدن پر سفید دھبے پڑ جاتے ہیں یا اعضا پر ورم ہو کر انگلیاں وغیرہ گرنے لگتی ہیں۔ جذام، برص۔

کچہری: وہ جگہ یا عمارت جہاں حاکم بیٹھ کر انصاف کرتا ہے۔ عدالت اور کورٹ کے ساتھ بھی مستعمل ہے۔

دیوانی مقدمہ: انسان کے لین دین کے مسائل حل کرنے کے لیے جو مقدمہ دائر کیا جاتا ہے، وہ دیوانی مقدمہ کہلاتا ہے۔

انڈیا ایکٹ: ایکٹ 1935ء کے تحت برطانوی صوبوں اور نوابی ریاستوں پر مشتمل وفاق کا وجود عمل میں آنا تھا۔ اس پر اُس وقت تک عمل درآمد ناممکن تھا جب تک نوابی ریاستوں کے حکمرانوں کی ایک معین تعداد الحاق کی دستاویز پر دستخط نہ کرتی۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ لہٰذا مرکزی حکومت کے معاملات ایکٹ 1919ء کے تحت ہی چلتے رہے۔ 1935ء کے ایکٹ کا تعلق صوبائی حکومتوں سے تھا۔ صوبے تحویل شدہ اُمور کی حد تک خود مختار تھے۔ اب دوعملی ختم ہوگئی تھی اور صوبائی حکومتیں پوری ذمے داری کی حامل ہوگئی تھیں۔ البتہ صوبائی گورنروں کو اقلیتوں، سول سروس کے تحفظ اور اَمن وامان کو کسی ''شدید خطرے'' سے محفوظ رکھنے کے لیے خاص ذمے داری سونپی گئی تھی۔ مرکزی حکومت اور صوبوں کو تفویض کیے جانے والے اُمور اس قدر تفصیل سے درج تھے کہ باقی ماندہ اختیارات کا پرانا جھگڑا اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا۔ اس ایکٹ کا نفاذ یکم اپریل 1937ء سے ہوا۔

مارواڑی: بھارتی ریاست راجھستان میں بولی جانے والی ایک راجھستانی زبان ہے۔ مارواڑی گجرات، ہریانہ، پاکستان اور نیپال میں بھی بولی جاتی ہے۔ مارواڑی کو لگ بھگ دو کروڑ آبادی بولتی ہے اور راجھستان کی سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ زیادہ تر بولنے والے راجھستان میں رہتے ہیں۔ سندھ میں تقریباً ڈھائی لاکھ اور نیپال میں تقریباً پچیس ہزار بولنے والے ہیں۔ مارواڑی کے دو درجن لہجے ہیں۔

انارکلی بازار: انارکلی بازار جنوبی ایشیا کا قدیم بازار ہے جو دو سو سال سے زیادہ پُرانا ہے۔ یہ لاہور کی مال روڈ پر واقع ہے۔ اس کا نام مغلیہ عہد کے مشہور کردار انارکلی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ لاہور کا پُرانا انارکلی بازار پہلے وجود میں آیا۔ جب کہ بارونق اور نئے بازار کا قیام بعد کا ہے۔

اشتراکیت: اشتراکیت یا سوشلزم ایسے سماجی نظام کو کہتے ہیں جس میں پیداواری ذرائع (زمین، معدنیات، کارخانے، بنک، تجارت وغیرہ) معاشرے کی اجتماعی ملکیت ہوتے ہیں اور ان کی پیداوار ذہنی یا جسمانی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے۔

سُرخ پوش: سُرخ لباس پہنے ہوئے۔ سُرخ لباس والا شخص۔ برصغیر پاک و ہند کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی سیاسی پارٹی جو رُوسی اشتراکی نظام کی حامل رہی اور جس کے لیڈر خان عبدالغفار خاں تھے۔ خان عبدالغفار خاں نے مدارس سے فارغ التحصیل نوجوانوں کی مدد سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے پشتون علاقوں میں خدائی خدمت گار تحریک شروع کی۔ بنیادی طور پر خدائی خدمت گار پشتون علاقوں میں سماجی اور فلاحی کاموں کے لیے تشکیل دیے گئے تھے اور سفید لباس زیب تن کرتے تھے جو جلدی میلا ہو جاتا تھا بعد میں سرخ لباس زیب تن کرنے لگے اور پشتون حلقوں میں سرخ پوش کے نام سے مشہور ہوئے۔

گاندھی: بھارت کے سیاسی اور روحانی رہنما اور آزادی کی تحریک کے اہم کردار تھے۔ انھوں نے ستیہ گرہ اور اہنسا (عدم تشدد) کو اپنا ہتھیار بنایا۔ ستیہ گرہ، ظلم کے خلاف عوامی سطح پر منظم سول نافرمانی ہے جو عدم تشدد پر مبنی ہے۔ یہ طریقۂ کار ہندوستان کی آزادی کی وجہ بنی اور ساری دنیا کے لیے حقوقِ انسانی اور آزادی کی تحاریک کے لیے روحِ رواں ثابت ہوئی۔ بھارت میں انھیں احترام سے مہاتما گاندھی اور باپو کہا جاتا ہے۔ 30 جنوری 1948ء کو ایک ہندو قوم پرست نتھو رام گوڈسے نے ان کا قتل کر دیا۔

جواہر لعل نہرو: جواہر لعل نہرو بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے رہنما اور تحریکِ آزادیٔ ہند کے اہم کردار تھے۔ اپنی زندگی میں وہ پنڈت نہرو یا پنڈت جی کے نام سے بھی جانے جاتے رہے۔

حوالات: قید، تحویل، حراست، نظر بندی، پہرے میں رکھنا۔ وہ جگہ جہاں ملزم کو کیس یا مقدمے کا فیصلہ ہونے تک نظر بند رکھا جائے۔

1935ء کا ایکٹ: حکومتِ برطانیہ نے اپنی نوآبادی ہندوستان کے عوام کو چند آئینی مراعات دی تھیں۔ عوام اسے ''نیا قانون'' کہتے تھے۔

سبق کا خلاصہ

منگو ایک کوچوان تھا جسے اپنے اڈے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا کیوں کہ وہ کبھی سکول نہیں گیا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود وہ ہر چیز کا علم رکھتا تھا۔ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے منگو کو اس کی معلومات تھیں۔ اڈے کے اکثر کوچوان اس کی معلومات سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ منگو نے ایبسین میں جنگ چھڑنے کی پیش گوئی کی تھی جو سچ ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے اڈے کے دوسرے کوچوان اس کی عقل مندی کے معترف ہو گئے۔

ایک دن منگو کسی سواری کے ساتھ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے پر آیا تو باتوں باتوں میں ہندو مسلم فساد پر بحث چھڑ گئی۔

منگو کوچوان کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کی وجہ وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور مقامی لوگوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ دراصل انگریزوں سے متنفر ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ جب وہ کسی شرابی انگریز سے اُلجھتا یا کسی سے ذلیل ہوتا تو اڈے پر موجود لوگوں کے سامنے ان کی برائیاں کرتا، گالیاں بکتا اور کسی نئے قانون جس سے انگریز ٹل جائیں، کا انتظار کرتا۔

اسے معلوم ہوا کہ یکم اپریل سے آئین نافذ ہوگا۔ تھوگنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو منگو نے اسے نئے قانون کے متعلق بتایا اور اپنی خوش فہمی سے بھی آگاہ کیا۔ ایک روز دو بیرسٹروں کے مابین نئے قانون کی باتیں سنتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا کہ یہ نئے قانون کے خلاف ہیں اور آزادی نہیں چاہتے۔ اس نے دبے الفاظ میں ان کو ''ٹوڈی بچے'' کہا۔ اس واقعے کے تیسرے روز گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ اس کے تانگے میں سوار ہوئے اور انھوں نے نئے قانون کے فوائد پر روشنی ڈالی کہ نئے قانون کے تحت ڈگری ہولڈرز کو روزگار ملے گا۔ سرکار نوکریاں پیدا کرے گی۔ منگو کے نظریات میں اب نئے قانون کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس نے نئے قانون کے متعلق مثبت اور منفی دونوں آرا سن رکھی تھیں، مگر وہ اپنی خود ساختہ سوچ کو ہی سب پر ترجیح دیتا تھا۔

ایک دن منگو کو دو مارواڑیوں کی باتوں سے پتا چلا کہ ہندوستان میں نیا قانون نافذ ہونے والا ہے، جس سے اسے یہ امید تھی کہ انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس نے نئے قانون کے بارے میں بہت کچھ سنا اور اپنے ذہن میں روشن تصور قائم کر لیا تھا۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور یکم اپریل آ گئی۔ یکم اپریل کو وہ صبح سویرے ہی نئے قانون کا نظارہ کرنے نکلا۔ اسے ہر چیز پرانی ہی نظر آئی۔ مایوسی میں اسے خوش پوش طلبہ کے کپڑے میلے میلے نظر آئے۔ تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر خوب بھیڑ تھی۔ بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لعل نہرو کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔ نئے قانون سے کوئی تبدیلی نظر نہ آنے کے باوجود بھی وہ ناامید نہیں تھا اور نئے قانون کے نافذ ہونے کے بعد کی تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسی دوران میں چھاؤنی میں ایک گورے کے ساتھ استاد منگو کی مڈبھیڑ ہو گئی اور اس نے گورے کو دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

وہاں لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس نے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر ہانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''وہ دن گزر گئے، جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔۔۔ اب نیا قانون ہے میاں۔۔۔۔ نیا قانون!''

استاد منگو کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ وہ سارے راستے اور تھانے میں نیا قانون چلّاتا رہا۔ مگر کسی نے ایک نہ سنی اور بالآخر اُسے یہ سننے کو ملا: ''نیا قانون، کیا بک رہے ہو۔۔۔ قانون وہی ہے پرانا!'' اور اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

مرکزی خیال

اس افسانے کا مرکزی خیال ایک آدمی کے دِل و دِماغ میں آزادی کے حصول کی تمنا اور اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے آزادی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنے کا جذبہ ہے۔ سعادت حسن منٹو نے اس افسانے کے ذریعے عام لوگوں کے نئے قانون کے بارے میں خیالات اور داخلی و خارجی کشمکش کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اُستاد منگو ہے۔ استاد منگو کو آزادی کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ استاد منگو کی کہانی کے ذریعے سعادت حسن منٹو نے ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ افسانہ ''نیا قانون'' برصغیر کے عام آدمی کی انگریزوں سے نفرت اور نئے قانون سے امید کی عکاسی کرتا ہے۔ منگو کی انگریزوں سے نفرت کی بنیادی وجہ ان کا ظلم اور ذلت آمیز سلوک ہے۔ وہ نئے قانون سے یہ امید وابستہ کر لیتا ہے کہ اس کے لاگو ہونے سے انگریزوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن کوئی نیا قانون نہیں ہے۔ قانون تو وہی پرانا ہے جس کے مطابق ہندوستان انگریزوں کا غلام ہے۔ ان کا ہر حکم بجالانے کا پابند اور ان کے ظلم سہنے کا عادی ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق و سباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق و سباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق و سباق

منگو کو چوان اپنے اڈے میں نہایت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا بالکل نہیں تھا۔ وہ کبھی اسکول تک نہیں گیا تھا مگر اس سب کے باوجود وہ ہر چیز کا علم رکھتا تھا۔ اس کے علم و فہم کا ذریعہ سواریوں سے ملنے والی خبریں اور افواہیں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ ان کی بدسلوکی سے نہایت تنگ اور عاجز تھا۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے منگو نئے قانون کا خواہاں تھا۔ آخر کار وہ سواری سے نئے قانون کی خبر سنتا ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ وہ اس قانون سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیتا ہے لیکن کم اپریل کو جب وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہی ہوتا ہے۔ اسی دوران میں منگو کا ایک انگریز سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور پولیس اسے گرفتار کر کے تھانے لے جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون کہتا رہتا ہے، جس کے جواب میں اسے کہا جاتا ہے کہ قانون وہی ہے، پرانا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے اور منگو کی ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں۔

عبارت نمبر 1

منگو کو چوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کو چوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی: ''دیکھ لینا گاما چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب سبق کی پہلی عبارت ہے، اس میں مصنف نے ایک عام ہندوستانی منگو کو چوان کا ذکر کیا ہے جو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ ایک روز منگو نے اسپین میں جنگ چھڑنے کی پیش گوئی کی تھی، جو سچ ثابت ہوئی۔ جس کی وجہ سے اڈے کے دوسرے کو چوان اس کی عقل مندی کے قائل ہو گئے۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز ناجائز طور پر ہندوستان پر قابض ہیں۔ ان سے نفرت کی وجہ ان کا ظلم و ستم اور بدسلوکی تھی۔ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نئے قانون کا خواہاں تھا۔ ایک دن وہ سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ وہ نئے قانون سے بہت سی توقعات وابستہ کر لیتا ہے۔ بالآخر کم اپریل آ جاتی ہے۔ وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے، لیکن ہر شے پرانی اور پہلے جیسی ہوتی ہے۔ اسی دوران میں اس کا ایک انگریز سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ پولیس منگو کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیتی ہے اور وہ چلّاتا رہتا ہے، ''نیا قانون، نیا قانون'' اسے جواب ملتا ہے کہ قانون تو وہی پرانا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف نے منگو کو چوان کی شخصیت کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ منگو کو چوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ وہ سکول نہیں گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ دنیا کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ وہ معلومات کتابوں سے حاصل نہیں کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے بات چیت کر کے اور مشاہدہ کر کے سیکھتا تھا۔ وہ تانگا چلاتے ہوئے اپنی سواریوں کی باتیں دھیان سے سنتا اور ان پر غور کرتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی نئی بات سنتا تو اسے یاد رکھتا اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کا تجزیہ کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اڈے کے دوسرے کو چوان اس کی باتوں کو اہمیت دیتے تھے اور اسے ''استاد منگو'' کہتے تھے۔ اڈے کے تمام کو چوان جو کہ دنیا کے تازہ ترین حالات جاننے کی خواہش رکھتے تھے، استاد منگو کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم — بات کہنے کا سلیقہ چاہیے (کلیم عاجز)

منگو کو سیاست میں خاصی دل چسپی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا اثر کسی نہ کسی طرح عام آدمی کی زندگی پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ قوانین، حکومتوں اور جنگوں کے اثرات عام لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ اس نے یہ سب کچھ کتابوں کے ذریعے نہیں بلکہ روزمرہ کی بات چیت اور تجربے سے سیکھا تھا۔ وہ کوئی نئی بات سنتا تو اسے اڈے کے دوسرے کو چوانوں کو بھی بتاتا۔ اس کے بیان کرنے کے انداز میں اعتماد اور بے باکی ہوتی تھی۔ اسی لیے دوسرے کو چوان اس کی باتوں کو غور سے سنتے تھے۔ ایمرسن کا قول ہے کہ:

''خود اعتمادی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔''

ایک دن منگو اپنے معمول کے مطابق تانگے پر سواریاں لے کر جا رہا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی سواریوں کی گفت گو بڑے غور سے سنتا تھا کیوں کہ سواریوں کی گفت گو سے اسے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ اس نے اپنی ایک سواری سے سنا کہ اسپین میں جنگ ہونے والی ہے۔ یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی خبر تھی۔ اسے اسپین اور اسپین میں ہونے والی جنگ کی وجوہات کا کچھ علم نہیں تھا۔ پھر بھی اڈے پر پہنچتے ہی اس نے گاما چودھری کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پُر اعتماد انداز میں بہت بڑی خبر دی۔ اس نے کہا: ''دیکھ لینا چودھری! تھوڑے ہی دنوں میں اسپین میں جنگ چھڑ جائے گی۔'' اسے یقین تھا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں اپنی مرضی سے حکومتیں بناتی اور گراتی ہیں۔ وہ جنگ کی وجوہات کو نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن عام آدمی کی زندگی پر جنگ کے اثرات کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ جنگ دنیا کے خواہ کسی کونے میں ہو، عام آدمی کے لیے بہت بڑی خبر ہوتی ہے۔ اسی یقین کے تحت اس نے گاما چودھری کے سامنے اسپین کی جنگ کی پیش گوئی کی تھی۔ گاما چودھری نے بھی دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ اسپین کہاں ہے؟ منگو نے فوراً جواب دیا ''ولایت میں اور کہاں؟'' اس کا یہ جواب بظاہر غلط تھا لیکن اس کی سادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس وقت عام لوگ یورپ

کے تمام ملکوں کو ''ولایت'' ہی سمجھتے تھے۔ برطانوی حکومت کے دور میں زیادہ تر ہندوستانیوں کے لیے ولایت کا مطلب ''انگلستان'' ہوتا تھا کیوں کہ انگریزوں کی زیادہ تر تعداد انگلستان سے تھی اور زیادہ تر حکمران، افسران اور حکومتی فیصلے لندن سے آتے تھے۔

اسپین کی جنگ دراصل ایک خانہ جنگی تھی جو 1936ء سے 1939ء تک جاری رہی۔ اسپین یورپ کا ایک ملک ہے جس کا دارالحکومت میڈرڈ ہے۔ اسپین کی جنگ دو گروہوں کے درمیان تھی۔ ایک طرف جمہوریت کے حامی تھے جو عوام کی حکومت چاہتے تھے۔ دوسری طرف فاشسٹ تھے جو سخت حکمرانی کے حامی تھے۔ مزدور، کسان اور عام لوگ غربت کا شکار تھے۔ جب کہ امیر طبقہ مزید امیر ہو رہا تھا۔ جب اسپین میں انتخابات ہوئے تو جمہوریت پسندوں کی حکومت بنی۔ فاشسٹ گروہ نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ یوں اسپین میں ایک بڑی خانہ جنگی چھڑ گئی۔ جنگ تین سال تک جاری رہی۔ لاکھوں لوگ مارے گئے۔ کئی شہروں کو تباہ کر دیا گیا اور اسپین کو شدید نقصان پہنچا۔ جنگ ہمیشہ تباہی لاتی ہے۔ جنگ سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی:

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے — جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی — بھوک اور احتیاج کل دے گی

منگو کو ان تفصیلات کا علم نہیں تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ جب دنیا میں جنگ ہوتی ہے تو غریب عوام اس کا شکار ہوتے ہیں۔ منگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سیاست میں گہری دل چسپی رکھتا تھا۔ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتا تھا اور اس انداز سے دوسروں کو بتاتا تھا کہ وہ بھی ان پر یقین کرنے لگتے تھے۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا بڑے سلیقے سے — میں اعتبار نہ کرتا تو اور کیا کرتا

منگو کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عام کوچوان بھی سیاست کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ رسمی تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود دنیا کے معاملات پر رائے رکھ سکتا ہے۔ منگو کا علم سننے، دیکھنے اور سوچنے کا نتیجہ تھا۔ وہ سیاست اور دنیا کے حالات کو اپنی نظر سے دیکھتا تھا اور اپنی زبان میں بیان کرتا تھا۔ یہی چیز اسے دوسروں سے منفرد بناتی تھی۔

منگو کے کردار میں ایک عام آدمی کی معصومیت اور سادگی دکھائی گئی ہے۔ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبا ایک عام آدمی زندگی، دنیا اور آس پاس کے ماحول کو کس طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے، منگو کے کردار میں اس کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اس کی ہر بات سادہ نظر آتی ہے لیکن سادہ ہے نہیں۔

باندھا ہر اِک خیال بڑی سادگی کے ساتھ — لیکن کوئی خیال بھی سادہ نہیں کہا (عاصم واسطی)

عبارت نمبر 2

اسپین کی جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگا چلاتے ہوئے کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کوچوان اپنے اڈے میں نہایت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ حالاں کہ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ ہر چیز کا علم رکھتا تھا۔ اس کے علم و فہم میں اضافے کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں جن کی باتیں غور سے سنتا رہتا تھا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ اس نفرت کی بڑی وجہ ان کی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی اور حقارت تھی۔ انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ نئے قانون کا خواہاں تھا۔ ایک دن سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سُن کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ وہ یکم اپریل کو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا

ہے لیکن ہر شے پرانی اور پہلے جیسی ہوتی ہے۔ اسی دوران میں اس کا جھگڑا ایک انگریز سے ہو جاتا ہے۔ پولیس منگو کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دیتی ہے اور وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلاّتا رہتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ ایک دن استاد منگو نے ایک سواری سے سنا کہ اسپین میں جنگ چھڑنے والی ہے۔ یہ صرف ایک افواہ تھی لیکن منگو کے لیے یہ کافی تھی۔ اس نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر گاما چودھری سے کہا ''دیکھ لینا، اسپین میں جنگ ضرور چھڑ جائے گی۔'' منگو کی پیش گوئی کا اڈے پر سب کو علم ہو گیا تھا لیکن کسی نے اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ کچھ دن بعد اسپین میں واقعی جنگ چھڑ گئی۔ یہ خبر اسٹیشن کے اڈے میں کوچوانوں تک پہنچی تو سب حیران رہ گئے۔ وہ سب جو پہلے منگو کی پیش گوئی پر ہنستے تھے اب دل ہی دل میں اس کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے۔ منگو کے علم و فہم کی دھاک سب پر بیٹھ چکی تھی۔ جو اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا اب اس کی عقل مندی کا قائل ہو چکا تھا۔

آ مجھے سن کہ ہو تجھے معلوم — کیسی ہوتی ہیں خوب تر باتیں (عاصم واسطی)

اسپین یورپ کا ایک ملک ہے جس کے دارالحکومت کا نام میڈرڈ ہے۔ استاد منگو نے جب سواریوں کی زبانی اسپین کے حالات سنے تھے، اس وقت وہاں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ منگو نے انھیں کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ اسپین میں جنگ ضرور چھڑ جائے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسپین کی کسی ملک کے ساتھ براہِ راست جنگ نہیں ہوئی تھی یہ ملک کے اندر ہی دو گروہوں کا باہمی تصادم تھا۔ یہ خانہ جنگی دو بڑے نظریات کے درمیان تھی۔ ایک طرف جمہوریت پسند اور دوسری طرف فاشسٹ۔ اسپین کی خانہ جنگی 1936ء سے 1939ء تک جاری رہی۔ اس خانہ جنگی میں جمہوریت پسندوں کو شکست ہوئی اور کئی سال تک اسپین میں آمریت قائم رہی۔ اس جنگ میں لاکھوں لوگ مارے گئے اور ملک کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ بقول انتظار حسین:

''قوموں کو جنگیں تباہ نہیں کرتیں، قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں، جب جنگ کے مقاصد بدل جاتے ہیں۔''

اڈے پر اسپین کے محلِ وقوع اور جنگ کی وجوہات کا کسی کو علم نہیں تھا۔ خود منگو کو بھی جنگ کی تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ دنیا میں جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو اس کے اثرات بہت بھیانک ہوتے ہیں۔ وہ پہلی عالمی جنگ کے نتائج دیکھ چکا تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جنگ سے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے ہیں۔ بقول ساحر لدھیانوی:

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے — جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی — بھوک اور احتیاج کل دے گی

جس وقت سب کوچوان اسٹیشن کے اڈے پر بیٹھ کر منگو کی ذہانت پر بات کر رہے تھے، استاد منگو مال روڈ پر تانگا چلا رہا تھا۔ وہ حسبِ عادت کسی سواری سے تازہ ہندو مسلم فسادات پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔ ان دنوں ہندو مسلم فسادات کی خبریں عام تھیں۔ یہ فسادات اچانک نہیں بھڑکے تھے بلکہ ان کے پیچھے کئی محرکات تھے۔ استاد منگو جانتا تھا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کئی صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ مذہبی اختلاف کے باوجود وہ مل جل کر زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن انگریزوں کی حکومت نے ان کے درمیان دراڑ ڈال دی تھی۔ انگریزوں نے ہمیشہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی اپنائی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان متحد ہوں۔ اگر ہندو اور مسلمان ایک ہو جاتے تو انگریزوں کے لیے حکومت کرنا مشکل ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں قوموں کے درمیان اختلافات کو ہوا دیتے تھے۔ جس کا نتیجہ فسادات کی صورت میں نکلتا تھا۔ بقول شاعر:

ایک اپنا دیا جلانے کو — تم نے لاکھوں دیے بجھا دیے (شکیب جلالی)

ایک اور شاعر کے بقول:

نفرتیں بیچنے والوں کی بھی مجبوری ہے　　مال تو چاہیے دکان چلانے کے لیے　(شفیق جمالی)

استاد منگو کا ذہن تیز تھا۔ وہ لوگوں سے باتیں سن کر اور معلومات اکٹھی کر کے نتیجہ نکالنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے انگریزوں سے نفرت تھی اور وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھ چکا تھا۔ سواریوں کی باتوں سے اس نے بھانپ لیا تھا کہ اسپین میں جنگ ہونے والی ہے۔ وہ ہندو مسلم فسادات کے پیچھے محرکات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو مسلم فسادات کسی بڑی سازش کا حصہ ہیں۔ بقول شاعر:

کس نے ڈالی ہے فضاؤں میں یہ میلی چادر　　شب کے ماتھے پہ لہو رنگ نشان ہے کیسا　(نصرت گوالیاری)

استاد منگو مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگا چلاتے ہوئے سواری سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اسی طرح سواریوں سے باتیں کر کے یا ان کی باتیں سن کر ملکی اور عالمی حالات سے واقفیت حاصل کرتا تھا۔ وہ حاصل شدہ معلومات سے نتائج نکالنے کا بھی ماہر ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کو ہمیشہ اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں۔ منگو کو ان کے بھیانک ارادوں کا اندازہ تھا۔ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے آزادی کی قدر و قیمت معلوم تھی۔ اسی لیے اسے انگریزوں سے نفرت تھی۔ بقول بوعلی سینا:

''آزادی دنیا کی بہترین چیزوں میں سے ہے۔''

منگو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سیاست پر گہری نظر رکھتا تھا۔ وہ لوگوں سے سیاسی حالات پر گفت گو بھی کرتا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے وہ صرف سیاست پر باتیں نہیں کرتا تھا بلکہ ان پر یقین بھی رکھتا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ لوگ اس کی باتوں کو اہمیت بھی دیتے تھے۔

مصنف نے منگو کے کردار کو سادگی سے پیش کیا ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ ایک عام کوچوان بھی سیاست کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کے معاملات پر اپنی رائے رکھ سکتا ہے۔ یہی چیز منگو کے کردار کو دل چسپ بناتی ہے۔

اس سلسلہ میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں: ''نیا قانون یوں دیکھنے میں ایک کوچوان اُستاد منگو کے خیالات اور چند حرکات وسکنات سے متعلق ایک کہانی ہے۔ لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اُس زمانے کی سیاسی حالت سے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے اور اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے۔''

عبارت نمبر 3

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی آ جاتی۔ نامعلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو ایک کوچوان ہے جو پڑھا لکھا نہیں مگر اس کے باوجود وہ اپنے اڈے میں سب سے عقل مند سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، منگو کو اس کی معلومات ہیں۔ منگو کے پاس ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں ہیں، جن کی باتیں وہ بڑی غور سے سنتا اور نتائج نکالتا تھا۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ منگو انگریزوں سے اس قدر نفرت کرتا ہے کہ انھیں دیکھ کر اسے متلی آ جاتی ہے۔ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نئے قانون کا خواہاں ہے۔ جب وہ ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو بے حد خوش ہوتا ہے، لیکن یکم اپریل کو جب وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اسی دوران میں منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ وہ چلّاتے ہوئے نئے قانون کی بات کرتا ہے لیکن پولیس اسے حوالات میں بند کر دیتی ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں منگو کی انگریزوں سے نفرت کا بیان ہے۔ اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت تھی۔ اس کی وجہ ان کے بُرے رویے تھے۔ ان کے بُرے رویوں کی وجہ سے منگو کو ان کے حلیے بھی بُرے لگنے لگے تھے۔ اسے ان کے چہرے بالکل پسند نہیں تھے۔ جب وہ ان کے سرخ و سفید چہرے دیکھتا تو اسے متلی آنے لگتی۔ اسے ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ان کے چہروں کو دیکھ کر مجھے لاش یاد آتی ہے جس کی اوپری جلد گل چکی ہو۔ یہ محض اس کا خیال نہیں تھا بلکہ اس کے اندر کی شدید نفرت کا اظہار تھا۔ اسے ان کا رنگ، ان کا انداز اور ان کا غرور سب کچھ ناگوار لگتا تھا۔ وہ انھیں دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا اور دل ہی دل میں ان سے مزید بیزار ہوتا جاتا تھا۔

منگو انگریزوں کی شکلوں سے اس لیے بیزار تھا کہ وہ اسے تنگ کرتے تھے۔ شکل و صورت، رنگ و نسل اور حسب نسب کی بنیاد پر کسی سے نفرت نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں یہ سخت ناپسندیدہ عمل ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔'' (سورۃ الحجرات)

انگریز یہاں کے لوگوں کو ان کے رنگ و نسل کی وجہ سے حقیر اور کمتر سمجھتے تھے۔ آنحضور خاتم النبیین ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی کو کمتر یا برتر سمجھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

''کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔''

چھاؤنی میں رہنے والے انگریز افسروں کا رویہ صرف منگو کے ساتھ ہی بُرا نہیں تھا بلکہ وہ ہر غریب ہندوستانی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستانی غریب اور کمتر لوگ تھے اور وہ صرف غلامی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ اگر کوئی ہندوستانی ان کے سامنے آ جاتا تو وہ اسے دھتکار دیتے تھے۔ کوئی ان کے راستے میں آ جاتا تو وہ اس کی تحقیر کرتے تھے۔ یہ سب دیکھ کر منگو کا دل کڑھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ انگریزوں نے اس ملک کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے۔ وہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے تھے۔

منگو تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن اسے اپنے حقوق کا پتہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی کو کمتر سمجھنا غیر اخلاقی ہے۔ اس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ ہر غریب ہندوستانی انگریزوں کے ظلم کا شکار ہو۔ ہر محنت کش ہندوستانی انگریزوں کے ہاتھوں اپنی عزتِ نفس سے محروم ہو۔ لیکن انگریزوں کے خلاف اس کی یہ مذمت بے سود تھی۔ کیوں کہ انگریز حکومت نے یہاں کے لوگوں کو بے بس کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ ان کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ یہی وجہ تھی جب وہ انگریزوں کو دیکھتا تو اسے شدید غصہ آ جاتا۔ وہ ان کے چہروں سے نفرت کرتا تھا۔ ان کی شکلیں دیکھ کر اسے متلی آتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنا کر ان کے تمام وسائل پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ یہاں کے لوگوں پر ظلم ڈھا کر ان کے منھ کا نوالہ بھی چھین لینا چاہتے تھے۔ منگو غریب کوچوان تھا لیکن اس کے مزاج میں انگریزوں کے مظالم کے خلاف بغاوت کا جذبہ تھا۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر اکثر اپنے جذبات کا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ ظلم کے نظام کو دل سے قبول

کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ بقول شاعر:

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا　　خامشی بھی ہوئی پشت پناہی کی طرح

(پروین شاکر)

وہ ایک غریب کو چوان تھا لیکن ظلم کے نظام کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ اس نظام کے خلاف بات کرتا اور اسے تبدیل کرنے کی خواہش مند تھا۔

دیپ جس کا محلات ہی میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

(حبیب جالب)

استاد منگو کے خیالات اس کے تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ تھے۔ وہ صرف سنتا نہیں تھا بلکہ ہر بات پر غور بھی کرتا تھا۔ انگریزوں کے جبر اور ہندوستان کی غلامی کے بارے میں اس کی سوچ باقی کوچوانوں سے مختلف تھی۔ ایک عام آدمی ہوتے ہوئے بھی وہ حالات پر نظر رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انگریزوں کا ظلم ہمیشہ نہیں چلے گا۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب ہندوستانی جاگیں گے اور اس ظلم سے نجات پالیں گے۔ اسے یقین تھا کہ:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے　　خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

عبارت نمبر 4

جب کسی نشے میں دھت گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مُکدّر رہتی اور وہ شام کو اڈّے میں آ کر بل مار کر سگریٹ پیتا یا حُقّے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔ ''۔۔۔۔۔۔'' یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہتا تھا: ''آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کوچوان پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے اڈے میں سب سے زیادہ سمجھ دار سمجھا جاتا تھا۔ منگو کو دنیا کے تمام بدلتے حالات کا علم تھا اور اس کی معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ اُسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی اور اس نفرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے تھے اور ہندوستانیوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نئے قانون کا خواہاں تھا۔ جب وہ اپنی ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو بے حد خوش ہوتا ہے، لیکن جب وہ یکم اپریل کو گھر سے نیا قانون دیکھنے کے لیے نکلتا ہے تو اُسے سب کچھ پہلے جیسا نظر آتا ہے۔ اسی دوران میں ایک انگریز سے اس کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے لیکن پولیس اسے حوالات میں بند کر دیتی ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

استاد منگو ایک عام کوچوان تھا۔ وہ غیر تعلیم یافتہ تھا مگر اس کے خیالات گہرے تھے۔ وہ زندگی کے تجربات سے سیکھتا تھا اور دنیا کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ اس نفرت کی کئی وجوہات تھیں۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کے حقوق چھینے تھے اور ان کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے۔ استاد منگو کو یہ سب ناانصافی لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ انگریز زبردستی ہندوستان پر قابض ہو گئے ہیں اور اب خود کو یہاں کا مالک سمجھتے ہیں۔ استاد منگو ایک آزادی پسند آدمی تھا۔ وہ آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا اس لیے غلامی کو ناپسند کرتا تھا۔ وہ کوئی فلسفی اور مفکر نہیں تھا مگر اسے اس بات پر مکمل یقین تھا کہ:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

(علامہ محمد اقبالؒ)

ایک اور شاعر کے بقول:

نہ ہو گا ہند میں تُو ہی، حکومت بھی نہ یہ ہو گی　　دیوگی دام چمڑے کے چلا لے اور تھوڑے دن

منگو کی انگریزوں سے سخت نفرت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے افسر استاد منگو جیسے عام لوگوں کو انسان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ انھیں حقیر جانتے تھے اور ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔ خاص طور پر جب کوئی گورا شراب کے نشے میں دھت ہوتا تو وہ اور زیادہ بدتمیزی کرتا۔ اگر کبھی کوئی کوچوان یا مزدور اس کے راستے میں آ جاتا تو وہ اسے دھکا دے دیتا یا گالی دے کر چلا جاتا۔ گورے افسروں کی عادت تھی کہ وہ چھاؤنی کی طرف آنے والے غریب کوچوانوں کو تنگ کر کے لطف لیتے تھے۔ منگو کو ان کے رویے سے سخت نفرت تھی۔ وہ ایک غریب لیکن خوددار آدمی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ہر شخص کی عزت کی جائے۔ جب وہ دیکھتا کہ انگریز صرف اپنی طاقت کے بل پر دوسروں کو ذلیل کرتے ہیں تو اس کا خون کھول اٹھتا۔

تُو خنجر ظلم کا ظالم چلا لے اور تھوڑے دن　　غریبوں بے گناہوں کو ستا لے اور تھوڑے دن

اسلامی تعلیمات کے مطابق بطور انسان ہر شخص عزت و احترام کے لائق ہے۔ اسلام میں رنگ و نسل، خاندان، مال و دولت اور مقام و مرتبے کے لحاظ سے کوئی کمتر یا برتر نہیں۔ قرآنِ مجید میں عزت و احترام کا معیار تقویٰ بتایا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ　　(سورۃ الحجرات:13)

ترجمہ: ''بے شک تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

گورے افسر خود کو برتر سمجھتے تھے اس لیے وہ عام ہندوستانیوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے۔ استاد منگو کو بھی اکثر ان کے بُرے رویے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی کسی نشے میں دھت گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو وہ سارا دن غصے میں رہتا۔ اس کی طبیعت بوجھل ہو جاتی اور وہ چڑچڑا ہو جاتا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے شام کو اڈے پر آتا۔ وہاں بیٹھ کر کبھی سگریٹ پیتا، کبھی حقے کے کش لگاتا اور اپنا تمام غصہ انگریزوں پر نکالتا۔ وہ غصے میں آ کر انھیں موٹی موٹی گالیاں دیتا اور کہتا کہ یہ لوگ ہمارے ملک میں زبردستی گھس آئے ہیں۔ ان کا ہمارے ملک سے کوئی تعلق نہیں مگر یہ خود کو یہاں کا مالک سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر کہتا تھا:

''آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک بن گئے ہیں!''

منگو کو یہ بات سب سے زیادہ چبھتی تھی کہ وہ لوگ جو مہمان بن کر آئے تھے، انھوں نے زبردستی سب کچھ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ منگو اپنا غصہ نکالنے کے لیے کہتا: ''آگ لینے آئے تھے، اب گھر کے مالک بن گئے ہیں۔'' یہ ضرب المثل ایسے موقعے پر استعمال ہوتی ہے جب کوئی شخص یا گروہ کسی جھوٹے یا وقتی مقصد کے تحت کسی جگہ آئے لیکن بعد میں اس پر مکمل قبضہ جما لے۔ انگریز بھی 1600ء میں محض تجارت کے بہانے ہندوستان آئے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے ذریعے مقامی حکمرانوں سے اجازت لے کر تجارتی مراکز قائم کیے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھا لیا۔ 1757ء کی جنگِ پلاسی اور 1764ء کی بکسر کی جنگ میں کامیابی کے بعد انھوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اپنی فوجی طاقت اور سفارتی چالاکیوں کے بل بوتے پر انھوں نے ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔ مقامی حکمرانوں کی کمزوری اور باہمی نااتفاقی سے بھی انھوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی

کے بعد برطانوی حکومت نے براہِ راست ہندوستان پر حکومت شروع کر دی۔ منگو اس تمام واقعے کو بیان کرنے کے لیے یہ ضرب المثل برمحل اور بہترین انداز میں استعمال کرتا تھا۔

وہ غصے میں کہتا کہ انگریزوں نے سب کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور ان پر حکم چلاتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو برابر کا انسان نہیں سمجھتے۔ اسے انگریزوں کے غرور اور تکبر سے سخت نفرت تھی۔ وہ ان کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتا اور انھیں بندروں کی اولاد کہتا۔ یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ انگریزوں کو ناپسند کرتا تھا اور انھیں ذلیل اور کمتر سمجھتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ انگریز ایسے اکڑ کر چلتے ہیں جیسے ہم سب اُن کے باپ کے نوکر ہیں۔

منگو کا کردار ایک عام ہندوستانی کے خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ منگو کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے عام لوگ کس طرح انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کی ظالمانہ حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے اور ان کے اقتدار کے خاتمے کی دعا کرتے تھے۔

عبارت نمبر 5

جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا، وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا، ''شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی۔ ۔۔۔۔۔ جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔۔۔۔ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اڑا دوں، لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔ ۔۔۔۔۔'' یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا، ''قسم ہے بھگوان کی ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کو چوان پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنے اڈے میں عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، منگو کو اس کی معلومات تھیں۔ منگو کے پاس ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں، استاد منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ جب انھیں دیکھتا، اس کے ذہن میں لاٹھیں آ جاتیں۔ چھاؤنی کے انگریز افسر اسے بلاوجہ تنگ کرتے تھے۔ جس کے سبب اس کی نفرت اور حقارت میں اضافہ ہو جاتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ منگو نے نئے قانون سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اس کے بارے میں سوچتے ہی اس کا ذہن رُوشن ہو جاتا۔ بالآخر یکم اپریل آ گئی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا، لیکن شہر میں انگریزوں کی اجارہ داری قائم تھی۔ چھاؤنی میں ایک گورے سے استاد منگو کا جھگڑا ہو گیا اور پولیس منگو کو گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ سارے راستے اور تھانے میں ''نیا قانون، نیا قانون'' چلاّتا رہا۔ لیکن قانون تو وہی پُرانا تھا۔ چناں چہ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں منگو کی انگریزوں سے نفرت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ استاد منگو ایک عام کوچوان تھا مگر اس کے دل میں غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی شدید خواہش تھی۔ وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اور یہاں کے لوگوں کو غلام بنا رکھا ہے۔ انگریز ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ بُرا سلوک

کرتے تھے۔ خاص طور پر غریب لوگ جیسے کوچوان، مزدور اور عام شہری ان کے ظلم و ستم کا زیادہ شکار ہوتے تھے۔ ظلم و ستم کسی بھی معاشرے کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلام ظلم و جبر کی مخالفت کرتا ہے۔ اسلامی معاشرے میں لوگوں کو ظلم سے نفرت دلائی جاتی ہے، حکمرانوں کو ظلم روکنے کی ہدایت کی جاتی ہے تاکہ معاشرے میں کمزور طبقوں کا استحصال نہ ہو۔ آنحضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا فرمان مبارک:

''لوگ جب ظالم کو ظلم کرتا ہوا دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ کی طرف سے ان سب پر عذاب نازل ہو جائے۔''

منگو کی انگریزوں سے نفرت کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ وہ خود ان کے ظلم کا شکار تھا۔ جب وہ چھاؤنی کی طرف جاتا تو وہاں کے گورے افسر اور فوجی اسے بہت تنگ کرتے۔ کبھی اس پر حکم چلاتے۔ کبھی مذاق اڑاتے اور کبھی دھکے دے کر اسے بے عزت کرتے۔ یہ سب دیکھ کر اس کے دل میں شدید غصہ بھڑک اٹھتا۔ وہ چاہتا کہ ان سے بدلہ لے مگر اسے اپنی کمزوری اور بے بسی کا بھی احساس تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی طاقت تھی اور نہ اختیار تھا۔ اس لیے اسے یہ بے عزتی سہنی پڑتی تھی۔ منگو اس ظلم سے تنگ آ چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات ملے۔

کچھ ظلم و ستم سہنے کی عادت بھی ہے ہم کو کچھ یہ ہے کہ دربار میں سنوائی بھی کم ہے
(ضیا ضمیر)

جب کوئی انگریز افسر منگو کے ساتھ بُرا سلوک کرتا تو منگو اسے دل ہی دل میں گالیاں دیتا تھا۔ منگو کے پاس اس وقت کچھ بھی کرنے کی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت وہ بے بسی سے سب کچھ برداشت کر لیتا۔ مگر جب وہ واپس اڈے پر آتا تو اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر انگریزوں کو جی بھر کر گالیاں دیتا۔ وہ ان پر لعنت بھیجتا اور ان کے خلاف بول کر اپنے دل کا غصہ نکالتا۔ اپنی ناراضی ظاہر کرنے کا اس کے پاس یہی طریقہ تھا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ انگریزوں کے خلاف کھل کر نفرت کا اظہار کرتا۔ وہ کہتا کہ گوروں کی شکل ایسے ہے جیسے انھیں کوڑھ ہو رہا ہو۔ بالکل مردار جیسے لگتے ہیں۔ وہ کہتا کہ انگریز فوجی جس نے اس کی بے عزتی کی تھی اس میں جسمانی طاقت بالکل نہیں تھی۔ وہ اپنی گٹ پٹ یعنی انگریزی کا رعب جھاڑ رہا تھا۔ باتوں سے وہ ایسے رعب جھاڑ رہا تھا جیسے مار ڈالے گا لیکن وہ محض باتیں ہی کر سکتا تھا۔ اس میں مارنے کی طاقت بالکل نہیں تھی۔ منگو کہتا ہے کہ اس انگریز کی باتیں سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا، جی چاہا کہ اس ملعون کی کھوپڑی توڑ دوں لیکن اس مردود کو مارنا مجھے توہین محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

''انتقام لینے میں جلدی کرنا انتہائی رذالت ہے''

منگو کو اچھی طرح معلوم تھا کہ گورے کو مارنے کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسے اپنی کمزوری اور گورے کی طاقت کا خوب اندازہ تھا۔ اپنی توہین اور بے عزتی کو ضبط سے برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی لیکن وہ اپنے دوستوں کے سامنے خود کو بے بس اور مجبور ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کی باتوں سے اس کا غصہ اور بے بسی نمایاں ہے۔ اس کی باتوں سے یہی مطلب نکلتا ہے کہ وہ انگریزوں کو سبق سکھانا چاہتا تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔

انگریزوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر منگو اپنے دوستوں میں بیٹھ کر انھیں خوب کوستا۔ وہ انھیں برا بھلا کہتے کہتے کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاتا۔ وہ اپنے غصے کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا۔ وہ اپنی خاکی قمیص کی آستین سے اپنی ناک صاف کرتا اور دوبارہ بُڑبڑانے لگتا **''قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔''** ''لاٹ صاحب'' دراصل لارڈ صاحب (Lord Sahib) ہے۔ ''لاٹ صاحب'' برطانوی دورِ حکومت میں طنزیہ طور پر وائسرائے یا کسی اعلیٰ انگریز افسر کو کہا جاتا تھا۔ بعد میں یہ اصطلاح مغرور یا خود کو برتر سمجھنے والے افراد کے لیے بھی طنز کے طور پر استعمال ہونے لگی۔ منگو بھی یہاں مغرور انگریز افسروں کو طنز اور تحقیر کے طور پر ''لاٹ صاحب'' کہہ رہا ہے۔ اسے انگریزوں کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے کہتا ہے **''جب بھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں، رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔''** یہ الفاظ منگو کی انگریزوں سے نفرت کی شدت کو ظاہر

کرتے ہیں۔ منگو غریب اور محنتی کو چوان تھا۔ وہ محنت سے پیٹ پالتا تھا۔ وہ نہ کوئی جرم کرتا تھا اور نہ ہی وہ قانون توڑتا تھا۔ انگریز صرف اپنے احساس برتری کی وجہ سے اس کی توہین کرتے تھے۔ اس لیے اسے انگریزوں کے رویے پر غصہ آتا تھا۔ وہ ہر وقت انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کا خواب دیکھتا تھا۔ غلامی سے نجات پانے کا خواب ایک صورت میں پورا ہوسکتا تھا اور وہ تھا کوئی نیا قانون۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نیا قانون بنے گا تو انگریزوں سے نجات ملے گی۔ نئے قانون سے اس بہت سی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے دوستوں سے کہتا تھا کہ نیا قانون آنے سے اس کی جان میں جان آجائے گی۔

؎ آ مجھے سن کہ ہو تجھے معلوم کیسی ہوتی ہیں خوب تر باتیں
(عاصم واسطی)

یہ سارا واقعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اُس وقت ہندوستان میں عام لوگوں کا کیا حال تھا۔ وہ سب انگریزوں کے ظلم سے تنگ آچکے تھے مگر ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ انتظار کر رہے تھے کہ کب انگریز یہاں سے جائیں اور وہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزار سکیں۔ استاد منگو بھی اسی امید میں تھا اور آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔

عبارت نمبر 6

دو ماروڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے، گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ''سنا ہے پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا یا ہر چیز بدل جائے گی؟'''' ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔''
''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'''' یہ پوچھنے کی بات ہے، کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔''

ان ماروڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اُس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر ماروڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا: ''چل بیٹا! ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھادے۔''

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو چوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اسے دنیا بھر کے حالات کا علم تھا اور ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی اور وہ ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب وہ سنتا ہے کہ ہندوستان میں نیا قانون نافذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ وہ نئے قانون کی خوشی مناتے ہوئے لسی پیتا ہے اور نئے قانون سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیتا ہے کہ اس کے نفاذ سے انگریزوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن جب وہ یکم اپریل کو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اس روز منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ منگو نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے۔ لیکن پولیس اُسے حوالات میں بند کر دیتی ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر ہندوستانی انگریزوں سے ہر قسم کا تعلق ختم

کر دے اور انگریز کی ناجائز حکومت سے وطن کی جان چھڑانے میں کردار ادا کرے۔

؎ تعلق چھوڑ دو گوروں سے اے ہندوستان والو! یہی کہتا پھروں گا میں وطن کے ہر برادر سے

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ ایک دن منگو نے کچہری سے دو سواریاں اپنے تانگے پر بٹھائیں۔ دونوں سواریاں ماروڑی تھیں۔ ماروڑی بنیادی طور پر راجستھان کے علاقے ماروڑ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو کہا جاتا ہے۔ ماروڑی برادری روایتی طور پر کاروبار اور تجارت میں مہارت کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور ہے۔ ماروڑی زیادہ تر سود کا کام کرتے تھے اور پیسہ ادھار دے کر بیاج یعنی سود لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ پیسوں کے معاملے میں بہت ہوشیار رہتے تھے۔ وہ ملک کے ہر نئے قانون کو اپنے کاروبار کے لحاظ سے پرکھتے تھے۔ اس دن وہ کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ دیوانی مقدمہ وہ ہوتا ہے جس میں دو فریقوں کے درمیان زمین، جائیداد، رقم یا کسی اور قانونی حق کا جھگڑا ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ فوجداری مقدمے سے مختلف ہوتا ہے۔ فوجداری مقدمہ کسی جرم کے متعلق ہوتا ہے جیسے چوری، لڑائی یا قتل وغیرہ۔

جب یہ ماروڑی گھر واپس جا رہے تھے تو راستے میں ہندوستان میں نئے قانون یعنی ''انڈیا ایکٹ'' کے بارے میں گفت گو کر رہے تھے۔ نیا قانون دراصل ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء'' تھا۔ یہ برطانوی حکومت کا سب سے تفصیلی قانون تھا۔ برصغیر میں وفاقی طرزِ حکومت، صوبوں کو محدود خودمختاری دینا اور براہِ راست انتخابات کا نظام اس قانون کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

ان میں سے ایک ماروڑی نے کہا کہ سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا اور ہر چیز بدل جائے گی۔ دوسرے نے کہا کہ ''ہر چیز تو نہیں بدلے گی لیکن کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل ضرور جائے گا، ہندوستانیوں کو آزادی بھی مل جائے گی۔'' ان کی باتوں میں امید، خوشی اور جوش تھا لیکن ساتھ ہی کچھ خدشات بھی تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس قانون کے بعد ان کے کاروبار پر کیا اثر پڑے گا۔ ایک نے کہا ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'' انھیں ڈر تھا کہ کہیں نئے قانون میں بیاج یعنی سود کے کاروبار میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کر دی جائے جس سے ان کے مفادات کو ٹھیس پہنچے۔ دوسرے ماروڑی نے بھی اس پر تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ کل کسی وکیل سے اس کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ وکیل سے یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ نئے قانون میں سود کے متعلق کیا کہا گیا ہے اور اس سے ان کے کاروبار پر کیا فرق پڑے گا۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو (اور) کسی گناہ کے کام کرنے والے'' (سورۃ البقرہ:276)

استاد منگو کی یہ عادت تھی کہ وہ سواریوں کی گفت گو میں خاصی دل چسپی لیا کرتا تھا۔ اس کی معلومات کا ذریعہ سواریوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ ماروڑی نئے قانون کے متعلق باتیں کر رہے تھے جنھیں سُن کر وہ بے حد خوش ہوگیا۔ وہ پہلے ہی انگریزوں کے خلاف تھا اور ہمیشہ آزادی کے خواب دیکھتا تھا۔ جب اس نے ماروڑیوں کی زبانی سنا کہ ہندوستان میں نیا قانون آنے والا ہے اور ہندوستانیوں کو آزادی ملنے والی ہے تو اس کا دل ناقابلِ بیان خوشی سے بھر گیا۔ اسے لگا کہ اب انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور ہندوستانیوں کو ان کا حق مل جائے گا۔ یہ خبر سُن کر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس کا سارا غصہ جو ہمیشہ انگریزوں کے خلاف ہوتا تھا، ختم ہوگیا۔

ماروڑیوں کی گفت گو سُن کر استاد منگو کے مزاج میں عجیب تبدیلی آگئی۔ وہ ہمیشہ غصے میں رہتا تھا اور ہر بات پر تلخ ہو جاتا تھا۔ نئے قانون کے متعلق سننے کے بعد وہ نہایت خوش نظر آرہا تھا۔ اس کا دل امیدوں سے بھر گیا تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ اس کا سارا غصہ گھوڑے پر اترتا تھا۔ لیکن آج اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر لگام ڈھیلی کر دی اور بڑے پیار سے کہا: ''چل بیٹا، ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا۔'' پہلے گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لیے وہ اسے بُری طرح پیٹتا تھا لیکن اب وہ گھوڑے پر مہربان ہوگیا تھا۔ وہ گھوڑے کو بغیر چابک مارے تیز دوڑانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا گھوڑا تیز دوڑے اور وہ یہ خبر جلدی سے اپنے دوستوں کو سنا دے۔

؎ ٹو خنجر ظلم کا ظالم چلالے اور تھوڑے دن غریبوں، بے گناہوں کو ستالے اور تھوڑے دن

مارواڑیوں کی باتیں سُن کر استاد منگو بہت خوش تھا۔ لیکن اسے نئے قانون کی حقیقت کا علم نہیں تھا۔ وہ صرف سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے خوش ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نئے قانون سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ حالاں کہ حقیقت یہ تھی کہ انگریز ابھی ہندوستان سے نہیں جا رہے تھے۔ اس قانون کے ذریعے وہ صرف کچھ اصلاحات کر رہے تھے مگر استاد منگو کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش فہمی میں مگن تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایک نئی صبح طلوع ہونے والی ہے۔

؎ وائے خوش فہمی کہ پرواز سے بھی گئے　　آسمان چھونے کی خواہش میں زمیں سے بھی گئے
(ظفر کلیم)

یہ اقتباس منگو کے جذبات، اس کی امیدوں اور اس کی سادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ سیاست کو گہرائی سے سمجھنے والا شخص نہیں تھا۔ وہ اپنی فہم کے ذریعے حالات کا اندازہ لگاتا تھا۔ اس کے دل میں آزادی کی شدید خواہش تھی اور اسی خواہش نے اس دن اسے بے حد خوش کر دیا تھا۔

عبارت نمبر 7

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منھ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا: ''ہت تیری ایسی کی تیسی!''
شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو چوان اڈے میں ان پڑھ ہونے کے باوجود سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اسے دنیا کے تمام حالات کا علم تھا۔ منگو کے پاس ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ جب انھیں دیکھتا، اس کے ذہن میں لاشیں آجاتیں جس سے اس کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔ منگو جب اپنی سواریوں سے یکم اپریل کو نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اس خیال سے کہ جدید آئین کے نفاذ سے انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور ہندوستان آزاد ہو جائے گا، منگو دل ہی دل میں خوش ہوتا اور اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ آجاتی۔
تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ یکم اپریل کو منگو نیا قانون دیکھنے گھر سے باہر نکلتا ہے لیکن سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اس دن اس کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ منگو نیا قانون، نیا قانون چلّاتا رہتا ہے لیکن قانون تو وہی پرانا تھا اور اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔
مصنف بتاتے ہیں کہ ایک دن استاد منگو بہت خوش تھا۔ اس نے کچہری سے دو مارواڑیوں کو اپنے تانگے پر بٹھایا تھا اور ان کی باتوں سے اسے پتہ چلا تھا کہ ہندوستان میں نیا قانون آنے والا ہے۔ یہ خبر اس کے لیے بہت بڑی تھی۔ وہ ہمیشہ انگریزوں سے نفرت کرتا تھا اور ان کے ظلم سے تنگ آچکا تھا۔ جب اس نے یہ سنا کہ اب ہندوستان میں نیا قانون آئے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی ملے گی تو اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اپنے گھوڑے کو بہت نرمی سے چلا رہا تھا اور دل ہی دل میں آزادی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

؎ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
(علامہ محمد اقبالؒ)

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ منگو نئے قانون کی خوش خبری سُن کر بہت خوش تھا اور اس خوشی کو دوبالا کرنا چاہتا تھا۔ سواریوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انارکلی کا رخ کیا۔ انارکلی میں دینو حلوائی کی دکان پر جا کر اس نے آدھ سیر دہی کی ٹھنڈی میٹھی لسی پی۔ انارکلی بازار میں دینو کی دکان مشہور تھی کیوں کہ وہاں کی لسی بہت مزیدار ہوتی تھی۔ عام دنوں میں استاد منگو یہاں زیادہ نہیں آتا تھا۔ لیکن آج بہت خوشی کا موقع تھا۔ اس لیے وہ خاص طور پر دینو حلوائی کی دکان سے مزیدار لسی پینے آیا تھا۔ اس نے پیٹ بھر کر لسی پی اور ایک بڑی ڈکار لی۔ پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں مونچھوں کو منھ میں دبا کر انھیں چوسنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب فخر تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا ''ہت تیری ایسی کی تیسی'' یہ جملہ اس کی خوشی اور جوش کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں انگریزوں کو کوس رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب ان کے دن گنے جا چکے ہیں۔

؎ تُو خنجرِ ظلم کا ظالم چلا لے اور تھوڑے دن　　غریبوں، بے گناہوں کو ستا لے اور تھوڑے دن
نہ ہوگا ہند میں تُو ہی، حکومت بھی نہ یہ ہوگی　　دیوگی دام چمڑے کے چلا لے اور تھوڑے دن

شام کو وہ اپنے اڈے پر واپس آیا لیکن اسے حیرت ہوئی کہ وہاں اس کی جان پہچان والا کوئی موجود نہیں تھا۔ عام طور پر وہاں کئی کوچوان بیٹھے حقہ پیتے اور گپیں ہانکتے مل جاتے تھے۔ لیکن آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر استاد منگو کے سینے میں ایک عجیب طوفان اٹھا۔ وہ بے چین ہو گیا۔ آج اس کے پاس سب سے بڑی خبر تھی۔ وہ اپنے دوستوں کو وہ خبر سنا کر خوش اور حیران کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو بتانا چاہتا تھا کہ ہندوستان میں نیا قانون آ رہا ہے۔ اب آزادی کا وقت قریب تھا۔ اب انگریزوں سے نجات ملنے والی تھی۔ وہ اتنی بڑی خبر اپنے سینے میں لیے پھرتا تھا لیکن اڈے پر کوئی سننے والا موجود نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ استاد منگو کے لیے یہ صرف ایک خبر نہیں بلکہ اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وہ ہمیشہ انگریزوں کے خلاف بولتا تھا، ان سے نفرت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ آج پہلی بار اسے ایسا لگا تھا کہ شاید اس کی خواہش پوری ہونے والی ہے۔ وہ یہ سوچ کر اڈے پر آیا تھا کہ جب وہ اپنے ساتھیوں کو اتنی بڑی خبر دے گا تو سب اس کی تعریف کریں گے اور اس کی عقل کی داد دیں گے۔ اسے امید تھی کہ یہ خبر سُن کر سب مل کر جشن منائیں گے۔ لیکن یہاں تو کوئی سننے والا تھا ہی نہیں۔

؎ اِک عمر سے فریبِ سفر کھا رہے ہیں ہم　　معلوم ہی نہیں کہ کدھر جا رہے ہیں ہم
(احمد ندیم قاسمی)

وہ بار بار اِدھر اُدھر دیکھتا، کسی واقف کار کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا لیکن کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا سینہ اس خبر سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کسی کو زبردستی بلائے اور کہے ''سنو! میں تمھیں ایک بہت بڑی بات بتانے والا ہوں'' لیکن وہ کس کو بلائے؟ وہ کس سے بات کرے۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی پرندہ خوشی سے چہچہانا چاہتا ہو لیکن سننے والا کوئی نہ ہو۔

؎ آ مجھے سن کہ ہو تجھے معلوم　　کیسی ہوتی ہیں خوب تر باتیں
(عاصم واسطی)

استاد منگو کی یہ کیفیت ظاہر کرتی ہے کہ آزادی کے خواب کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک عام آدمی بھی ایسی خوش کُن باتیں سُن کر پُر جوش ہو جاتا ہے اور اسے چین نہیں آتا۔ استاد منگو کا یہ حال ہمیں بتاتا ہے کہ وہ صرف ایک کوچوان نہیں تھا بلکہ ایک محبِ وطن انسان تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے اپنے ملک سے محبت تھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ظلم کے خلاف تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو آزادی کی امید پر زندہ تھا۔ آج کی خبر نے اس کی روح میں ایک نئی روشنی بھر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ روشنی سب تک پہنچے۔ وہ سب کو آزادی کی خوش خبری دینا چاہتا تھا لیکن سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

عبارت نمبر 8

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔

اس کے دماغ میں بہت اچھے اچھے خیالات آرہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لاکر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ ''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟'' بار بار گونج رہا تھا۔ اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چوہوں (وہ اُن کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس دنیا بھر کی معلومات تھیں۔ منگو کے پاس ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ استاد منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ جب انگریزوں کو دیکھتا تو اس کا خون کھولنے لگتا۔ جب وہ نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی تھی۔

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو سُرخ پوشوں کی تحریک اور دیگر تحریکوں کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا تھا۔ اگر کوئی سواری نئے قانون کے خلاف کوئی بات کرتی تو وہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بالآخر یکم اپریل آجاتی ہے۔ وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے لیکن سب کچھ وہی پرانا تھا۔ اسی دن چھاؤنی میں منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے اور پولیس منگو کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیتی ہے لیکن وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلاّ تا رہتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ نئے قانون کی آمد کی خبر نے منگو کے دل ودماغ میں ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ وہ بے حد خوش اور انتہائی پُر جوش تھا۔ وہ یہ خبر جلد از جلد اپنے دوستوں کو سنانا چاہتا تھا۔ سواریوں کو ان کے ٹھکانے پر چھوڑ کر وہ سیدھا انار کلی گیا اور دینو حلوائی کی دکان سے لسی پی۔ وہ عام طور پر ایسا نہیں کرتا تھا لیکن آج کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ اس نے اپنی پسندیدہ چیز پی کر خوشی کو دوبالا کیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا اڈے پر پہنچا تا کہ اپنے دوستوں کو خبر سنا سکے لیکن وہاں اس کی خبر سننے کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ منگو آدھے گھنٹے تک اسٹیشن کے اڈے کی چھت کے نیچے ٹہلتا رہا۔ اس نے چابک بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس کی بے چینی بالکل واضح تھی۔ اس کے دماغ میں کئی خیالات آرہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نیا قانون کیسا ہوگا؟ کیا واقعی اس قانون سے ہندوستانیوں کو فائدہ ہوگا؟ کیا اس سے انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے گی؟ اس کے دل میں خوشی اور جوش کا ملا جلا احساس تھا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ نیا قانون آنے سے ملک میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں گی۔ لیکن اس کے دل کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ اب گورے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جائیں گے۔

؎ تُو خنجر ظلم کا ظالم چلالے اور تھوڑے دن　　غریبوں، بے گناہوں کو ستالے اور تھوڑے دن

منگو اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے نئے قانون پر غور وفکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کی وہ بات بار بار گونج رہی تھی کہ کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟ مارواڑی کو اپنے سودی کاروبار کی فکر تھی کہ کہیں کسی قانون سے اس کے کاروبار پر منفی اثر نہ پڑے۔ بیاج (سود) کے متعلق منگو کے دل میں بھی کئی خیالات آرہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ بیاج کا مسئلہ

بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ عام لوگ، خاص طور پر غریب طبقہ، سود کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ مارواڑی اور دوسرے ساہوکار غریبوں کو سود پر قرض دیتے تھے اور پھر ان کی زندگی بھر کی کمائی چھین لیتے تھے۔ مارواڑی لوگ ہندوستان میں اپنی کاروباری مہارت کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کے کاروبار کا بڑا حصہ سود پر قرض دینا تھا۔ اس لیے انھیں نئے قانون میں بیاج کے متعلق فکر تھی۔ سودی کاروبار سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور معیشت ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ سودی کاروبار سے غریبوں کا استحصال ہوتا ہے۔ اس لیے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا　　(سورۃ البقرہ:275)

ترجمہ: اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

استاد منگو سوچنے لگا کہ اگر نیا قانون سود کے خلاف کوئی حکم جاری کرے تو غریبوں کی زندگی آسان ہو جائے گی۔ اس خیال سے اس کی خوشی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ اسے لگا کہ نیا قانون آنے سے انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ سود کا ظلم بھی ختم ہو جائے گا۔ اس تصور سے اسے غریبوں کی زندگی بھی خوش حال محسوس ہونے لگی۔

منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ حقارت سے انھیں ''سفید چوہے'' کہتا تھا۔ نئے قانون کے فوائد پر غور کرتے ہوئے اس کے جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ خود کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔ آج پہلی بار اسے لگا کہ وہ انگریزوں سے بدلہ لے سکتا ہے۔ وہ خود کو آزاد اور طاقت ور محسوس کر رہا تھا۔ حالاں کہ حقیقت میں ابھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ جب نیا قانون آئے گا تو ''سفید چوہے'' (انگریز) یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ وہ اپنی سفید تھوتھنیاں لے کر ہمیشہ کے لیے بلوں میں غائب ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچی۔ یہ سب سوچ کر وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں امید کی چمک تھی۔ وہ چابک بغل میں دبائے مسلسل ٹہل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد کسی سے بات کرے۔ وہ کسی کو بتائے کہ اب ہندوستان میں نیا قانون آرہا ہے۔ اب انگریزوں کی حکومت ختم ہونے والی ہے اور ہندوستانی اپنے فیصلے خود کریں گے۔ بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ نکلسن نے کہا تھا:

''جلد یا بدیر ایک وقت آئے گا جب دُنیا یہ محسوس کرے گی کہ برطانیہ کا ذہنی اور علمی اقتدار ہندوستان سے کبھی زائل نہ ہوگا۔''

اسی طرح کے الفاظ گاندھی نے بھی کہے:

''یہاں پر انگریزوں کے بغیر بھی انگریزی راج رہے گا''

اور بقول فراق گورکھ پوری:

؎ منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں　　وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کی قدر و قیمت وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے غلامی کا عذاب جھیلا ہو۔ غلامی کی زندگی ہر قسم کے لطف و مسرت سے خالی ہوتی ہے۔ بقول اقبال:

؎ بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب　　اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

(علامہ اقبالؒ)

منگو کے جذبات محض ایک فرد کے جذبات نہیں بلکہ پورے غلام طبقے کے جذبات ہیں۔ منگو کی حالت سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلامی میں جینے والے لوگوں کے لیے آزادی کی امید کتنی بڑی چیز ہوتی ہے۔ ان کے دل اس امید سے کتنے مسرور ہو جاتے ہیں۔ آزادی کی امید سے ان کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑتا ہے اور وہ ایک نئی آزاد دنیا کے خواب دیکھنے لگتے ہیں:

؎ دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت　　میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

(لال چند فلک)

عبارت نمبر 9

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا: لا ہاتھ ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔'' اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفت گو میں اُس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا: ''تُو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے،'' ''یہ روس والا بادشاہ'' کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔''

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں، اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ کو ''انڈیا ایکٹ'' یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں، وہ انھیں ''روس والے بادشاہ'' کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو چوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اسے دنیا کے تمام معاملات کا علم تھا اور اس کی معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ اسے انگریزوں سے بہت نفرت تھی۔ اسی لیے جب وہ مارواڑیوں سے جدید آئین کی خبر سنتا ہے تو اس کے دل میں انگریزوں سے نجات کی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ منگو نے سرخ پوشوں کی تحریک، روس والے بادشاہ اور نئے قانون کو آپس میں ملا دیا تھا اور اب وہ ہندوستان میں رونما ہونے والے تمام سانحات و واقعات کو جدید آئین کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا۔ یکم اپریل کو جب منگو گھر سے نیا قانون دیکھنے کے لیے نکلتا ہے تو سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اس دن اس کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون چلّاتا رہتا ہے لیکن اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو ایک سادہ مگر جذباتی کوچوان تھا جو ہمیشہ غلامی سے بیزار رہتا تھا۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کے دل میں انگریزوں کے لیے شدید نفرت تھی۔ وہ انھیں ''سفید چوہے'' کہتا تھا کیوں کہ اسے لگتا تھا کہ وہ بھی چوہوں کی طرح دوسروں کے گھروں میں گھس کر ان پر قابض ہو جاتے ہیں۔ وہ اس دن کے انتظار میں تھا کہ جب انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور ہندوستانی آزادی کے مزے لوٹیں گے۔ بقول شاعر:

؎ وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستاں ہوگا مبارک باد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ جب اسے نیا قانون نافذ ہونے کی خبر ملی تو اس کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی بھر گئی۔ وہ دینو حلوائی کی دکان سے لسی پی کر اڈے پر پہنچا۔ وہ یہ خبر اپنے دوستوں کو سنانا چاہتا تھا مگر اڈے پر کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ بغل میں چابک دبائے ٹہلتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ کوئی دوست آئے جسے وہ اتنی بڑی خوش خبری دے سکے۔ اس کا دل خوشی اور جوش سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نتھو گنجا بغل میں پگڑی دبائے اڈے میں داخل ہوا۔ منگو فوراً اس کی طرف لپکا۔ نتھو گنجا اس کا پرانا دوست تھا جو ہمیشہ اس کی باتوں کو دھیان سے سنتا اور اُن پر تبصرہ کرتا تھا۔ استاد منگو نے بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور پُر جوش لہجے میں کہا کہ اس کے پاس ایک ایسی خبر ہے جسے سُن کر اس کی گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں گے۔ یعنی وہ اتنا حیران اور خوش ہوگا کہ اس کی شکل بدل جائے گی۔ یہ کہہ کر استاد منگو نے جوش و خروش سے نئے قانون اور اس کی اہمیت پر بات شروع کر دی۔ استاد منگو نے نئے قانون کو کوئی جادوئی چیز سمجھ لیا تھا جس کے نافذ ہوتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔ اس کا جوش اتنا بڑھ چکا تھا کہ وہ ہر کسی کو یہ خبر سنانے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے

نتھو گنجے سے بات شروع کی تو کئی بار جوش میں آ کر اس کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا ''تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے۔'' استاد منگو کا یہ انداز تھا کہ جب زیادہ خوش ہوتا یا زیادہ جوش میں آتا تو دوستوں کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارتا۔ اس طریقے سے وہ اپنی بات کو زیادہ وزنی اور مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ مطلب بھی تھا کہ نتھو گنجا بھی اس کی خوشی میں شریک ہو جائے۔

بات چیت کے دوران میں استاد منگو نے کہا ''روس والا بادشاہ'' کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ اس زمانے میں روس میں ایک بہت بڑا انقلاب آ چکا تھا۔ اس انقلاب کو ''سوویت انقلاب'' یا ''اشتراکی انقلاب'' کہا جاتا تھا۔ 1917ء میں زارِ روس کی بادشاہت کو ختم کر کے ایک نیا نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس نظام میں غریبوں اور مزدوروں کو زیادہ حقوق دیے گئے تھے۔ ''اشتراکی نظام'' کا مطلب تھا کہ سب کو برابر حقوق ملیں گے۔ کوئی امیر یا کوئی غریب نہیں ہوگا۔ سب کو مساوی حقوق اور یکساں سہولتیں حاصل ہوں گی۔ اس نظام کے تحت زمینیں اور فیکٹریاں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی تھیں۔ اس لیے دولت مند اور غریب کا فرق مٹ گیا تھا۔ استاد منگو نے کہیں نہ کہیں سے یہ سب باتیں سُن رکھی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو کچھ روس میں ہوا وہی کچھ ہندوستان میں بھی ہونے والا ہے اور یہ سب کچھ کروانے میں روس والے بادشاہ کا ہاتھ ہے۔

اشتراکی نظام کے تحت روس میں لوگوں کو زیادہ آزادی دی گئی تھی۔ مزدوروں کو ان کے حقوق دیے گئے تھے اور دولت کی مساوی تقسیم کی گئی تھی۔ استاد منگو کو یہ سب بہت اچھا لگتا تھا کیوں کہ وہ خود بھی ایک غریب آدمی تھا جو امیروں اور حکمرانوں کے ظلم سے تنگ تھا۔ اس نے روس کے انقلاب کے بارے میں سنا تو اسے لگا کہ شاید ہندوستان میں بھی یہی سب ہونے والا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نیا قانون بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں کا ظلم ختم ہو جائے گا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ سب ''روس والے بادشاہ'' کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کے خیال میں دنیا میں جہاں بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھ رہی تھی وہ سب اسی انقلاب کی بدولت تھی۔

استاد منگو کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں جو نیا قانون آ رہا ہے وہ بھی ''روس والے بادشاہ'' کی وجہ سے ہے۔ دراصل یہ اس کی ناسمجھی اور سادگی کو ظاہر کرتا ہے۔ حقیقت میں نیا قانون (گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ) برطانیہ کی اپنی حکومت کی طرف سے بنایا گیا تھا۔ اس قانون کا روس کے انقلاب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن چوں کہ اُس زمانے میں عام لوگوں کو سیاسی معاملات کی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں تھی اس لیے وہ مختلف چیزوں کو آپس میں جوڑ کر ایک نئی کہانی بنا لیتے تھے۔ استاد منگو نے بھی یہی کیا۔ اس نے روسی انقلاب اور ہندوستان میں نئے قانون کے نفاذ کو ایک ہی چیز سمجھ لیا تھا۔ اس سلسلہ میں عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''نیا قانون یوں دیکھنے میں ایک کوچوان اُستاد منگو کے خیالات اور چند حرکات و سکنات سے متعلق ایک کہانی ہے۔ لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے منٹو نے اُس زمانے کی سیاسی حالت سے جس کشمکش کو پیدا کیا ہے اور اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے اس کشمکش کا کوئی حل بھی نکل سکے۔''

نتھو گنجا، استاد منگو کی باتیں غور سے سُن رہا تھا اور اس کی معلومات سے متاثر ہو رہا تھا۔ استاد منگو اپنے دوست کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ قانون بہت بڑی تبدیلی لے کر آئے گا۔ وہ بار بار پُر جوش انداز میں بولتا، نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارتا اور کہتا ''یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا!''

وہ یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ روس میں انقلاب آ سکتا ہے تو ہندوستان میں بھی ضرور کچھ بدلے گا۔

؎ انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہوگی

(اختر شیرانی)

یہ ساری باتیں استاد منگو کی سوچ کی سادگی اور اس کے جذبات کی شدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ ایک عام آدمی تھا مگر اس کے دل میں آزادی کی خواہش تھی۔ وہ ہمیشہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا خواب دیکھتا تھا۔ اب اسے لگا کہ یہ خواب پورا ہونے والا ہے اس لیے اس کا جوش آسمان کو چھونے لگا تھا۔ وہ بے حد خوش اور پُر جوش تھا اور پوری طرح اس امید میں ڈوبا ہوا تھا کہ پہلی اپریل کے دن سے سب کچھ بدل جائے گا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ خیالات صرف منگو کے نہیں بلکہ ہندوستان کے غریب اور مظلوم طبقے کے بھی تھے۔

عبارت نمبر 10

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا، "جدید آئین کا دوسرا فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو کبھی سکول نہ گیا تھا۔ مگر اپنی معلومات کے باعث وہ اپنے اڈے میں نہایت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین کی جنگ کا تذکرہ سنا اور جوں کا توں گاما چودھری کو بتا دیا۔ جب یہ خبر سچ ثابت ہوئی تو باقی کوچوانوں کی نظر میں استاد منگو کی اہمیت بڑھ گئی۔ استاد منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ جب انھیں دیکھتا اسے متلی آجاتی۔ جب کبھی اس کی کسی انگریز سے جھڑپ ہوتی تو اس کی نفرت اور حقارت میں اضافہ ہو جاتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو نئے قانون سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لیتا ہے۔ نئے قانون کے بارے میں سوچتے ہی اس کا ذہن روشن ہو جاتا ہے۔ بالآخر یکم اپریل آگئی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے لیکن شہر میں انگریزوں کی عمل داری ہوتی ہے۔ چھاؤنی میں استاد منگو کا ایک انگریز سے جھگڑا ہو جاتا ہے اور پولیس اسے لے جاتی ہے۔ وہ سارے راستے اور تھانے میں نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے اور اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے "نیا قانون" میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو ایک عام کوچوان تھا لیکن اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ انگریزوں کو ظالم سمجھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد ہندوستان سے نکل جائیں۔ جب اس نے ہندوستان میں نئے قانون کے بارے میں سنا تو اس کے دل میں امید کی ایک کرن جاگ اٹھی۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ کچھ عرصے سے پشاور اور دوسرے شہروں میں جو سرخ پوشوں کی تحریک چل رہی تھی منگو اس کے بارے میں بھی سنتا رہتا تھا۔ لیکن وہ اس تحریک کو صحیح طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس نے اس تحریک کو روس کے بادشاہ اور نئے قانون کے ساتھ ملا دیا تھا۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا جائے۔

"سرخ پوشوں کی تحریک" دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جو برطانوی راج کے خلاف چل رہی تھی۔ یہ تحریک ہندوستان میں خدائی خدمت گار تحریک کے ساتھ جڑی ہوئی تھی، جس کے سربراہ خان عبدالغفار خان تھے۔ خان عبدالغفار خان کو "باچا خان" بھی کہا جاتا ہے۔ سرخ پوشوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرایا جائے۔ چوں کہ وہ سرخ رنگ کی قمیص اور ٹوپی پہنتے تھے اس لیے انھیں "سرخ پوش" کہا جاتا تھا۔ استاد منگو نے اس تحریک کو روس کے اشتراکی انقلاب سے جوڑ دیا تھا کیوں کہ وہاں بھی ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ وہاں بھی عام لوگوں نے بادشاہ کو ہٹا کر اپنا نظام قائم کیا تھا۔

اسی طرح جب استاد منگو سنتا کہ کسی جگہ بم بنانے والے پکڑے گئے ہیں یا کسی پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے تو وہ ان سب کو نئے قانون کے اشارے سمجھتا۔ بم ساز وہ لوگ تھے جو خفیہ طور پر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے کی تیاری کر رہے تھے، وہ اپنے طور پر انگریزوں کو کمزور بنانے کے منصوبے بناتے اور کبھی کبھار حملے بھی کرتے تھے۔ انگریز سرکار ایسے لوگوں کو باغی سمجھتی اور انھیں سخت سزائیں دیتی تھی۔ لیکن استاد منگو کی نظر میں یہ لوگ اصل ہیرو تھے جو آزادی کے لیے قربانیاں دے رہے تھے۔

ایک دن دو بیرسٹر استاد منگو کے تانگے میں بیٹھے تھے۔ بیرسٹر وہ وکیل ہوتے ہیں جو برطانیہ سے قانون کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور قانونی معاملات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ دونوں نئے آئین پر بحث کر رہے تھے۔ استاد منگو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس موضوع پر گہری نظر رکھتا تھا۔ ایک بیرسٹر دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ نئے آئین کا دوسرا حصہ "فیڈریشن" ہے۔ فیڈریشن کا یہ تصور میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ ایسی فیڈریشن دنیا میں پہلے نہ دیکھی گئی اور نہ سنی گئی۔ سیاسی طور پر بھی یہ غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ فیڈریشن سرے سے فیڈریشن ہی نہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

یہاں فیڈریشن کا مطلب ایسا نظامِ حکومت ہے جس میں مختلف علاقوں یا ریاستوں کو ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رکھا جاتا ہے۔ ان ریاستوں کو کچھ حد تک خود مختاری بھی حاصل ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے جو نیا آئین بنایا تھا اس میں فیڈریشن کا تصور دیا گیا تھا۔ لیکن بیرسٹر کا کہنا تھا کہ یہ فیڈریشن حقیقی فیڈریشن نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ مکمل آزادی دینے کی بجائے بس ایک نیا جال بچھایا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد محض ہندوستانیوں کو خوش کرنا ہے۔ جب کہ اصل اختیار صرف انگریزوں کے ہاتھ میں رہنا تھا۔ بقول شاعر:

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا — خلقِ خدا پر عذاب، دیکھیے کب تک رہے

(مولانا حسرت موہانی)

استاد منگو نے دونوں کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔ اس کے لیے یہ سب نئی باتیں تھیں۔ اس کا ذہن پہلے ہی بنا ہوا تھا کہ نیا قانون ہر حال میں آزادی لائے گا۔ اس نے بیرسٹر کی باتوں کا اصل مطلب نہیں سمجھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ وہ اس خوش فہمی میں تھا کہ یہ نیا قانون آتے ہی انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے گی اور ہندوستانی مکمل طور پر آزاد ہو جائیں گے۔ منگو پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے وہ فیڈریشن کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسے لگا کہ بیرسٹر نئے قانون کے خلاف باتیں کر رہے ہیں حالاں کہ وہ نئے قانون کی حقیقی خامیوں کا ذکر کر رہے تھے۔

یہ رویہ صرف استاد منگو کا نہیں تھا بلکہ اُس زمانے میں بہت سے عام لوگ اسی طرح جذباتی طور پر تحریک آزادی سے وابستہ تھے۔ وہ ہر اچھی خبر کو آزادی کی نوید سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہر تنقیدی بات کو غلامی کی حمایت خیال کرتے تھے۔ منگو بھی اپنے طور پر یہ نتیجہ نکال چکا تھا کہ روس کا انقلاب، سرخ پوشوں کی تحریک، بم سازوں کی سرگرمیاں اور نیا قانون سب ایک ہی چیز ہیں۔ اور ان سب کا مقصد انگریزوں کی حکمرانی ختم کرنا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں تھا۔ ان سب کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ استاد منگو اگر تعلیم یافتہ ہوتا تو اسے عالمی واقعات کا صحیح علم ہوتا اور وہ جان لیتا کہ ان واقعات کا نئے آئین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ منگو چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا لیکن نئے قانون کے بارے میں وہ کوئی متوازن رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔

اس عبارت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں آزادی کی کیسی تڑپ تھی۔ دنیا کے ہر انقلاب کے ساتھ انھیں اپنی آزادی کی منزل قریب تر دکھائی دینے لگتی تھی۔ منگو اور اس کے دوست نئے قانون کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے لیکن انھیں یقین تھا کہ اس قانون کے نفاذ کے ساتھ ہی وہ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے۔

عبارت نمبر 11

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک، دوسرے سے کہہ رہا تھا، "جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک

نہیں آسکا۔ فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!'' ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفت گو ہوئی اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے کہا،'' یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔'' چناں چہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا،'' ٹوڈی بچے!'' جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں'' ٹوڈی بچہ'' کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور'' ٹوڈی بچے'' کی تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کوچوان ان پڑھ ہونے کے باوجود بھی اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اسے دنیا بھر کے حالات کا علم تھا اور اس کی معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی اور وہ ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کے حوالے سے سنتا ہے تو اس کے دل میں آزادی کی امید جاگ اٹھتی ہے اور وہ اس خیال سے بہت خوش ہو جاتا ہے کہ اب انگریزوں سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ منگو'' جدید آئین''،'' روس والے بادشاہ''،'' اشتراکیت نیز دنیا میں رونما ہونے والے تمام انقلابات کو آپس میں ملا دیتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ منگو یکم اپریل کی صبح اپنے گھر سے نیا قانون دیکھنے کے لیے نکلتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے اس لیے اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اسی دن منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ وہ نیا قانون چلاّتا رہتا ہے لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے اور اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے'' نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو ایک عام کوچوان تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ ہندوستان آزاد ہو جائے اور انگریزوں کا راج ختم ہو جائے۔ چھاؤنی کے انگریز افسر اسے تنگ کرتے تھے اس لیے اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ ایک دن اس نے مارواڑی سواریوں سے سنا کہ ہندوستان میں نیا قانون نافذ ہونے والا ہے۔ وہ سمجھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ وہ بڑی بے چینی سے چاہتا تھا کہ کوئی ایسا قانون آئے جو انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کرے۔ اس نے نئے قانون سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ ایک دن استاد منگو کے تانگے میں دو بیرسٹر سوار ہوئے۔ وہ قانونی معاملات میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ وہ دونوں نئے آئین پر گفت گو کر رہے تھے۔ منگو ان کی باتیں غور سے سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک بیرسٹر دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن کے متعلق ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں نہ سنی گئی، نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریے کے اعتبار سے بھی یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔

فیڈریشن دراصل ایک ایسا نظام ہوتا ہے جس میں مختلف ریاستوں یا علاقوں کو ایک مرکزی حکومت کے تحت رکھا جاتا ہے۔ لیکن ان علاقوں یا ریاستوں کو کچھ داخلی خود مختاری حاصل ہوتی ہے۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے جو نیا آئین بنایا تھا اس میں بھی فیڈریشن کا تصور دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصے، جیسے صوبے اور ریاستیں ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ فیڈریشن حقیقت میں ایک دھوکا تھی کیوں کہ اصل اختیار پھر بھی مرکزی حکومت یعنی انگریزوں کے پاس ہی رہنے والا تھا۔ بقول شاعر:

پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا　　خلقِ خدا پر عذاب، دیکھیے کب تک رہے

(مولانا حسرت موہانی)

بیرسٹر اس بات پر حیران تھا کہ یہ کیسی فیڈریشن ہے جس میں ہندوستانیوں کو مکمل آزادی نہیں دی جا رہی ہے۔ عام طور پر فیڈریشن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سب کو برابر حقوق ملیں اور سب کو اپنی حکومت چلانے کا اختیار ہو، لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ اس نئے نظام میں اصل اختیار برطانوی حکمرانوں کے پاس تھا اور ہندوستانیوں کے پاس صرف نام کی آزادی تھی۔ اسی لیے بیرسٹر کہہ رہا تھا کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔ یہ صرف ایک دکھاوا تھا، اصل میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی۔ بقول شاعر:

اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے　　اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

(فیض احمد فیض)

استاد منگو غیر تعلیم یافتہ تھا۔ اور ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفت گو ہو رہی تھی اس میں زیادہ الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو ان کی باتوں کا صحیح مفہوم نہ سمجھ سکا۔ اس نے بیرسٹر کی باتوں کو غور سے سنا اور سمجھنے کی کوشش کی لیکن فیڈریشن کا پیچیدہ تصور اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ بیرسٹر نئے قانون کو بُرا کہہ رہے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ اس نے اپنی طرف سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ دونوں ہندوستان کے دشمن اور انگریزوں کے حمایتی ہیں۔ اسی خیال کے تحت اس نے انھیں'' ٹوڈی بچے'' کہہ کر حقارت کا اظہار کیا۔

'' ٹوڈی'' دراصل ایک ایسا لفظ تھا جو انگریزوں کے وفادار ہندوستانیوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ ایسے لوگ جو انگریزوں کے سامنے جھکتے، ان کی خوشامد کرتے اور ان کے حق میں باتیں کرتے، انھیں حقارت سے'' ٹوڈی'' کہا جاتا تھا۔ استاد منگو کو جب بھی کوئی ایسا شخص نظر آتا جو انگریزوں کی طرف داری کرتا تو وہ اسے'' ٹوڈی بچہ'' کہہ کر اپنی بھڑاس نکالتا تھا۔ اس لفظ کو استعمال کر کے اسے بہت خوشی ہوتی تھی کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اصل دشمن کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

منگو کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ بیرسٹر حقیقت میں سچ کہہ رہے تھے۔ وہ فیڈریشن کے کھوکھلے پن پر تنقید کر رہے تھے لیکن منگو نے غلط مطلب نکالا۔ وہ سمجھا کہ بیرسٹر نئے قانون کے خلاف ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان آزاد ہو۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ بیرسٹر محبِ وطن تھے اور یہی کہہ رہے تھے کہ وہ قانون آزادی دینے والا نہیں بلکہ انگریزوں کی ایک چالاکی تھی۔ اس چالاکی کے ذریعے وہ حکومت اور اصل اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔

دیکھیے سہتے ہیں کب تک اہلِ دل جور و ستم　　دیکھیے رہتی ہے کب تک ظلم کی رسی دراز

اس اقتباس سے استاد منگو کی سیدھی سادی سوچ اور محدود علم کا اندازہ ہوتا ہے۔ منگو سیاست کی گہرائی کو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس کے دل میں آزادی کی تڑپ تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریز جلد ہندوستان چھوڑ دیں۔ جو ہندوستانی ایسا نہ چاہے وہ منگو کی نظر میں'' ٹوڈی بچہ'' تھا۔ اس کی ساری امیدیں نئے قانون سے وابستہ تھیں۔ وہ اس نئے قانون میں لکھی گئی ہر چیز کو سچائی اور آزادی کی علامت سمجھ رہا تھا۔ یہ اس کی سادگی اور کم علمی تھی۔

اس اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عام لوگ اکثر سیاست کی پیچیدگیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ پاتے۔ وہ جذباتی طور پر چیزوں کو جوڑنے لگتے ہیں اور اپنی طرف سے نتیجے نکال لیتے ہیں۔ منگو بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ انگریز بُرے ہیں اور جو انگریزوں کے ساتھ ہے وہ بھی بُرا ہے۔ منگو کی کم علمی سے یہ تضاد سامنے آتا ہے کہ جو لوگ واقعی انگریزوں کے نظام پر تنقید کر رہے تھے۔ منگو انھیں ہی دشمن سمجھ رہا تھا۔ وہ لوگ انگریزوں کی دھوکا دہی کو بے نقاب کر رہے تھے لیکن منگو کی نظر میں وہ انگریزوں کے حامی تھے اس لیے بُرے تھے۔ اس کی نظر میں وہ'' ٹوڈی بچے'' تھے، حالاں کہ وہ محبِ وطن اور ہندوستان کے حقوق کے محافظ تھے۔

عبارت نمبر 12

اس واقعے کے تیسرے روز گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا:'' نئے آئین نے میری امیدیں اور بڑھا دی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی

سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔'' ویسے بھی بہت سی جگہیں نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔''

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کبھی سکول نہ گیا تھا۔ مگر اپنی معلومات کے باعث وہ اپنے ارد گرد میں نہایت عقل مند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ منگو کے پاس معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں، جن کی باتیں وہ بڑے غور سے سنتا تھا۔ استاد منگو انگریزوں سے بے حد تنگ تھا۔ وہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے نئے قانون کا متمنی تھا۔ جب اس نے اپنی سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ بالآخر یکم اپریل آجاتی ہے اور استاد منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکل پڑتا ہے۔ لیکن وہی شہر ہوتا ہے۔ بازار میں حسبِ معمول کام کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ وہ پھر بھی ناامید نہیں ہوتا۔ اُسی دن چھاؤنی میں ایک انگریز سے اس کی لڑائی ہو جاتی ہے اور پولیس منگو کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ وہ سارے راستے نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے، لیکن قانون تو وہی پُرانا تھا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو اپنی سواریوں کی گفت گو بڑے غور سے سنتا اور اس سے نتائج نکالنے کا عادی تھا۔ ایک دن اس کے تانگے پر دو بیرسٹر بیٹھے۔ وہ نئے قانون کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بیرسٹر نے فیڈریشن کے حوالے سے نئے قانون میں کسی خامی کا ذکر کیا۔ منگو کو اس کی بات صحیح طرح سمجھ نہ آئی اور وہ یہ سمجھا کہ وہ لوگ نئے قانون کے خلاف ہیں۔ وہ نئے قانون کے متعلق لوگوں کی باتیں بڑی توجہ سے سنتا تھا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ اس واقعے کے تین دن بعد وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور، اب گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی کہلاتا ہے، یہ لاہور کا قدیم کالج اور برصغیر کے ممتاز تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ تعلیم، ادب، سیاست اور سائنس کی کئی نامور شخصیات نے اس کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ جن میں علامہ اقبالؒ، پطرس بخاری اور فیض احمد فیض شامل ہیں۔ تانگے میں سوار، گورنمنٹ کالج کے وہ طلبہ آپس میں نئے قانون کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ منگو نے ان کی گفت گو غور سے سنی۔ نئے قانون کے بارے میں ان کا نظریہ استاد منگو سے بالکل مختلف تھا۔ وہ اس آئین کو کسی بڑے مقصد کے لیے نہیں بلکہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک طالب علم نے کہا کہ نئے آئین نے اس کی امیدیں اور بڑھا دی ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر فلاں صاحب اسمبلی کے ممبر بن گئے تو ہمیں بھی سرکاری دفتر میں نوکری مل جائے گی۔ یہ سُن کر دوسرے طالب علم نے کہا ہاں ویسے بھی بہت سی نوکریاں نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے۔ تیسرے طالب علم نے تائید کی اور کہا ہاں بھائی کیوں نہیں۔ جو بے کار گریجویٹ مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔ بقول ن م راشد:

؎ پارۂ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم میں مرے دوست مرے سیکڑوں ارباب وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول

استاد منگو ان کی باتیں سُن کر حیران ہو رہا تھا۔ اس نے نئے آئین کو ایک انقلابی تبدیلی کے طور پر دیکھا تھا۔ ایک ایسی تبدیلی جو ہندوستان کو آزاد کرائے گی۔ لیکن یہ نوجوان طلبہ محض ذاتی مفاد کی فکر میں تھے۔ ان کے لیے نئے آئین کی اہمیت یہ تھی کہ اس سے انھیں نوکریاں مل سکیں گی۔ انھیں ملک کی آزادی کی پروا نہیں تھی۔ یہ منظر اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کی دو مختلف سوچوں کو دکھاتا ہے۔ ایک طرف استاد منگو جیسے سادہ لوگ تھے جو آزادی کی امید رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس قانون سے سب کی زندگیاں بدل جائیں گی۔ دوسری طرف یہ پڑھے لکھے نوجوان تھے جو صرف اپنے ذاتی فائدے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ آزادی یا غلامی کے فلسفے میں نہیں پڑ رہے تھے۔ بلکہ صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ اس گڑبڑ سے انھیں کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب کسی قدم میں ذاتی مفاد، قومی مفاد پر غالب آجائے تو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ

ترجمہ: بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

اور بقول مولانا ظفر علی خان:

؎ خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہ طلبہ اپنے اندر کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچ میں تھے۔ ان کے لیے آزادی یا غلامی کے مفہوم کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں استاد منگو کے جذبات بہت سچے اور خالص تھے۔ وہ ایک سادہ مگر مخلص انسان تھا۔ اس کا ہر خیال، ہر خواب اور ہر امید صرف ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کے ظلم سے نجات کے متعلق تھی۔

یہ بات معاشرتی منافقت پر غور کرنے کا موقع بھی دیتی ہے۔ بہت سے لوگ زبان سے کچھ اور کہتے ہیں اور دل میں کچھ اور رکھتے ہیں۔ وہ ہر کام میں اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسلام نے اس رویے کو ناپسند کیا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے فرمایا:

''بہترین انسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہو۔''

یہ طلبہ اپنے ذاتی فائدے کے بارے میں سوچ رہے تھے، قوم کے بارے میں نہیں۔ جب کہ استاد منگو اپنے فائدے کے بجائے پوری قوم کی فلاح کی امید رکھتا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیا آئین واقعی ہندوستانیوں کے لیے مفید تھا یا نہیں؟ حقیقت یہ تھی کہ یہ آئین آزادی کا صرف ایک دھوکا تھا۔ انگریز اصل اختیارات اپنے پاس ہی رکھ رہے تھے۔ ہندوستانیوں کو صرف چند مراعات دی جا رہی تھیں۔ مگر استاد منگو جیسے سادہ لوگ اس دھوکے کو سمجھ نہیں پا رہے تھے اور بے حد خوش ہو رہے تھے۔ یہ رویہ آج بھی ہمارے معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ جب کوئی نیا قانون بنتا ہے یا کوئی تبدیلی آتی ہے تو لوگ اسے قومی بہتری کی بجائے اپنے ذاتی فائدے کے لحاظ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس سے معاشرہ کمزور ہو جاتا ہے اور قوم میں اتحاد اور قربانی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے میرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں
(معین احسن جذبی)

اس عبارت میں استاد منگو کی معصومیت اور نوجوانوں کی خود غرضی کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک طرف استاد منگو ہے جو سچے دل سے آزادی کی امید رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ نوجوان ہیں جو موقع کی تلاش میں ہیں کہ کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ قومی ترقی کے لیے اجتماعی بہتری کی سوچ کو پروان چڑھانا ضروری ہے۔

عبارت نمبر 13

اس گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ وہ اس کو ایسی ''چیز'' سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔

'نیا قانون۔۔۔!' وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی 'نئی چیز!' اور ہر باراس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی 'نئے قانون' کا درخشاں وتاباں ہونا ضروری تھا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کوچوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ منگو کو دنیا کے تمام معاملات کا علم اپنی سواریوں سے ہوتا تھا۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ لہٰذا جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے لیکن سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اس دن چھاؤنی میں ایک انگریز سے منگو کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اُسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

استاد منگو ایک ''سادہ اور جذباتی کوچوان'' تھا، جو ہر بات کو اپنے انداز میں سمجھتا اور محسوس کرتا تھا۔ جب اس نے نئے قانون کے بارے میں سنا، تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے دل میں اس قانون کی ایک چمک دار اور شان دار تصویر بن گئی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ قانون حقیقت میں کیا تبدیلی لائے گا۔ چوں کہ یہ ''نیا'' تھا اس لیے وہ سمجھنے لگا کہ یہ بہت اچھا ہوگا۔

منگو جب بھی نئے قانون کے بارے میں سوچتا تو اسے اپنے گھوڑے کا نیا ساز یاد آجاتا۔ ساز دراصل وہ مخصوص کر بند اور دیگر چمڑے کے پٹے ہوتے ہیں جو گھوڑے پر باندھے جاتے ہیں تاکہ تانگہ اس سے جڑ سکے۔ جب منگو نے یہ ساز دو سال پہلے چودھری خدا بخش سے خریدا تھا، تو وہ بالکل نیا اور چمک دار تھا۔ اس پر لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمک رہی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام ہوا تھا وہ سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ جب وہ اپنے تانگے کے ساتھ گلیوں میں نکلتا تو وہ ساز بہت خوب صورت لگتا تھا اور لوگ بھی اس کی چمک کو دیکھ کر متاثر ہوتے تھے۔ جب منگو نئے قانون کے بارے میں سنتا تو اسے لگتا کہ یہ بھی اسی طرح نیا چمک دار اور بہترین ہوگا جیسے اس کے گھوڑے کا ساز ہے جو بالکل نیا اور دل کش ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جیسے نیا ساز گھوڑے کو خوب صورت بنا دیتا ہے، اسی طرح نیا قانون بھی ہندوستان کو شان دار بنا دے گا۔

؎ وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستاں ہوگا　　مبارک باد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا

یہ سوچ استاد منگو کی معصومیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ عام آدمی تھا۔ سیاست کی پیچیدگیوں کو نہیں جانتا تھا، لیکن جو کچھ سنتا تھا، اسے اپنے جذبات کے ساتھ جوڑ کر دیکھتا تھا۔ نئے قانون کو وہ آزادی کی علامت سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ کوئی ایسی چیز تھی جو برطانوی حکومت کے ظلم سے نجات دلا سکتی تھی، جو انگریزوں کی زیادتیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی، جو ہندوستان کے لیے روشنی اور خوش حالی لے کر آسکتی تھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نیا قانون واقعی ایسا تھا؟ درحقیقت نیا آئین ایک سیاسی چال تھا۔ اس میں کچھ تبدیلیاں ضرور تھیں لیکن برطانوی حکومت نے اصل اختیارات اپنے پاس ہی رکھے تھے۔ ہندوستانیوں کو محض نام کی آزادی دی جا رہی تھی مکمل آزادی نہیں۔ استاد منگو اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ وہ ایک سادہ کوچوان تھا۔ جو سیاست کی پیچیدگیوں کو نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ دل سے

آزادی چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کا ظلم ختم ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے ملک کے لوگ اپنے فیصلے خود کریں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستانی عزت اور وقار کے ساتھ جئیں۔

؎ انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا　　اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہوگی
(اختر شیرانی)

یہاں ایک اور اہم سبق یہ بھی ہے کہ انسان کو ہمیشہ اصل حقیقت کو دیکھنا چاہیے، نہ کہ صرف ظاہری چمک کو۔ جیسے ایک چمکتا ہوا پتھر قیمتی نہیں ہوتا لیکن ایک عام سا نظر آنے والا ہیرا اصل میں بہت قیمتی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہر نیا قانون یا تبدیلی بھی بظاہر اچھی لگ سکتی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں بھی فائدہ مند ہو۔

استاد منگو کی معصومیت ایک عام آدمی کی سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔ ہر دور میں عام لوگ حکومتوں کے وعدوں اور قوانین کی چمک دمک میں آجاتے ہیں، لیکن ان کے اصل مقاصد کو نہیں سمجھ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ باشعور اور سمجھ دار لوگوں کو چاہیے وہ حقیقت کو دیکھیں اور دوسروں کو بھی آگاہ کریں۔ استاد منگو کے جذبات سچے تھے، لیکن اس کی معلومات ناقص تھیں۔ وہ نئے قانون کی حقیقت کو نہیں سمجھ رہا تھا۔ لیکن وہ بس یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ نیا ہے اور نیا ہونے کی وجہ سے اچھا ہوگا۔

یہی سبق ہمیں زندگی میں سیکھنا چاہیے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ہر تبدیلی اچھی نہیں ہوتی، ہر نیا قانون فائدہ مند نہیں ہوتا۔ جب تک ہم گہرائی سے چیزوں کو نہ سمجھیں، تب تک ہم ہمیشہ دھوکے میں رہیں گے۔ جیسے استاد منگو نئے قانون کی چمک میں آگیا تھا۔

عبارت نمبر 14

پہلی بار اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخرِ کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ منگو کوچوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ منگو کو دنیا کے تمام معاملات کا علم اپنی سواریوں سے ہوتا تھا۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ لہٰذا جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے لیکن سب کچھ پہلے جیسا ہوتا ہے۔ اس دن چھاؤنی میں ایک انگریز سے منگو کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اُسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو کئی دنوں سے نئے قانون کے بارے میں مختلف باتیں سُن رہا

تھا۔ کچھ لوگ اسے بُرا کہتے تھے، کچھ اچھا، لیکن اس کے ذہن میں جو تصور بیٹھ گیا تھا وہ اپنی جگہ قائم تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو جیسے ہی نیا قانون نافذ ہوگا ہندوستان میں سب کچھ بدل جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ قانون کسی بڑی تبدیلی کی علامت ہوگا، جس کے آتے ہی تمام مسائل ختم ہو جائیں گے۔

آخر کار مارچ کے دن ختم ہو گئے، اب پہلی اپریل کی رات شروع ہو چکی تھی۔ رات کے خاموش اور پُر سکون لمحے گزر رہے تھے۔ موسم بھی خلافِ معمول کچھ ٹھنڈا اور خوش گوار تھا۔ شاید یہی تبدیلی منگو کے دل میں امید کی ایک اور روشنی پیدا کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب بس چند گھنٹوں بعد وہ وہی دن دیکھے گا جس کا وہ کتنے عرصے سے انتظار کر رہا تھا۔ صبح سویرے جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی منگو نے بغیر دیر کیے اصطبل کا رخ کیا۔ اپنے گھوڑے کو تیار کیا اور تانگے کو باہر نکالا۔ آج کا دن اس کے لیے عام دنوں سے مختلف تھا۔ اس کا دل خوش تھا، اس کی طبیعت ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج کے دن اسے وہ تبدیلی نظر آئے گی جسے دیکھنے کے لیے وہ بے چین تھا۔ بقول شاعر:

؎ آسمان ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
(علامہ اقبالؒ)

دل چسپ بات یہ تھی کہ منگو کے ذہن میں نئے قانون کا کوئی حقیقی تصور نہیں تھا۔ اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ قانون دراصل حکومت کے طریقہ کار میں تبدیلی کا نام ہوتا ہے۔ یہ کوئی ظاہری چیز نہیں ہوتا کہ اسے کوئی دیکھ سکے۔ لیکن اس کی معصومیت اسے یہی یقین دلاتی رہی کہ جیسے ہی نیا قانون آئے گا وہ کوئی خاص اور نمایاں چیز ہوگی جو اسے نظر آئے گی اور جس سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے گی۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ قانون دراصل ایک ضابطہ ہوتا ہے جس کا اثر فوری طور پر نظر نہیں آتا بلکہ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیلیاں لاتا ہے۔

منگو کی خوشی اور امیدوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے ہمیشہ قانون کو طاقت اور اختیار کی علامت سمجھا تھا۔ اس کے لیے نیا قانون ایک ایسا آلہ تھا جو انگریزوں کے ظلم و ستم کو کم کر دے گا اور ہندوستانیوں کی حالت بدل دے گا۔ اُسے یہ بھی خیال تھا کہ پہلی اپریل کو سورج ایک نئی دنیا لے کر طلوع ہوگا جس میں ہر چیز مختلف ہوگی۔ یہ سب کچھ دراصل منگو کے اپنے خیالات اور امیدوں کا نتیجہ تھا۔ وہ حقیقی سیاسی صورت حال کو نہیں سمجھتا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ ایک قانون کے نافذ ہونے سے فوری طور پر کچھ نہیں بدلتا۔ چوں کہ وہ ایک عام آدمی تھا اس لیے اس نے اپنے طور پر جو کچھ سمجھا اسی پر یقین کر لیا۔ وہ اپنے انداز میں ایک بڑی تبدیلی کی توقع کر رہا تھا۔ اس لیے وہ نہایت مطمئن اور مسرور ہو کر نئے قانون کو دیکھنے کے لیے باہر نکل پڑا۔

؎ جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا (بشیر بدر)

منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ مارچ کی آخری رات اس نے بڑی کشمکش میں گزاری۔ پہلی اپریل کی صبح وہ جلدی اٹھا۔ اس نے سوچا کہ آج کا دن خاص ہے۔ وہ مدت سے اس خاص دن کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے گھوڑے کو تیار کیا۔ اس کی عجیب کیفیت تھی جیسے اسے کوئی بڑی خوشی ملنے والی ہو۔ اس نے گھوڑے کو جوتا اور خود تانگے پر سوار ہو کر باہر نکل آیا۔ وہ خلافِ معمول وقت سے پہلے گھر سے نکل آیا تھا۔ اس نے رات بڑی مشکل سے کاٹی تھی۔ اسے آج صبح کا شدت سے انتظار تھا۔ اسی لیے وہ صبح سویرے تانگا لے کر سڑکوں پر نکل آیا۔ وہ نئے قانون کا اثر دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اسے یقین تھا آج شہر میں سب کچھ بدلا بدلا نظر آئے گا۔

؎ ہمیں یقیں ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
(ظہیر کاشمیری)

استاد منگو ایک سادہ اور معصوم آدمی تھا۔ اس کی سادگی اس کے خیالات اور امیدوں سے واضح تھی۔ وہ نئے قانون کو کسی جادوئی تبدیلی کا سبب سمجھ رہا تھا۔ وہ یقین رکھتا تھا کہ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔ اس کی سوچ میں گہرائی کم تھی اور جذبات زیادہ تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ قوانین محض کاغذی فیصلے ہوتے ہیں۔ جب تک ان پر عمل نہ ہو، ان کا اثر نظر نہیں آتا۔

منگو کی معصومیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یکم اپریل کی صبح ایک نئی دنیا اس کا استقبال کرے گی۔ یہ اس کی سادگی اور بھولی بھالی فطرت ہی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑی آسانی سے خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

عبارت نمبر 15

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں اکیس مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکان کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو چوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ سمجھ دار سمجھا جاتا تھا کیوں کہ اسے دنیا کے تمام بدلتے حالات کا علم تھا۔ ان معلومات کا ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی اس لیے وہ ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کے بارے میں سنتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ کیوں کہ وہ اسے انگریزوں کی حکومت کے ختم ہونے اور آزادی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ وہ یکم اپریل کی صبح نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکل پڑتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ یکم اپریل کو اس کی لڑائی چھاؤنی میں ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ منگو انگریز کو بُری طرح مارتا ہے۔ پولیس اُسے گرفتار کر کے تھانے لے جاتی ہے۔ منگو نیا قانون نیا قانون چلّاتا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے۔ لہٰذا اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ آخر وہ لمحہ آ پہنچا جس کا منگو کو شدت سے انتظار تھا۔ 31۔ مارچ کی رات ختم ہوئی اور اپریل کی پہلی تاریخ شروع ہونے میں بس چند گھنٹے باقی تھے۔ سردی غیر معمولی تھی۔ ہوا میں ایک تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ منگو کا دل خوشی سے لبریز تھا، جیسے کسی تہوار کا انتظار ہو۔ وہ بہت جلد بیدار ہوا جیسے کوئی بچہ عید کے دن خوشی سے سویرے اٹھتا ہے۔ وہ فوراً اصطبل میں گیا، اپنے گھوڑے کو تیار کیا، اسے جوتا اور خود تانگا لے کر شہر کی طرف چل پڑا۔ آج اس کے اندر عجیب سا جوش تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آج کے دن کچھ خاص ہوگا، کچھ نیا ہوگا، جو اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک دے گا۔

جیسے ہی وہ شہر کی سڑکوں پر نکلا اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کوئی بڑی تبدیلی نظر آئے گی مگر جوں جوں وہ مختلف بازاروں اور گلیوں سے گزرتا گیا، اس کی نظروں کے سامنے وہی پرانی چیزیں آتی گئیں۔ دکانیں وہی تھیں، سڑکیں ویسی ہی تھیں، لوگ بھی وہی تھے جو پہلے ہوتے تھے، بجلی کے کھمبے بھی اپنی جگہ پر کھڑے تھے، اور دکانوں کے بورڈ بھی بدلے ہوئے نہیں لگ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے گھوڑے کے گلے میں بندھے ہوئے گھنگرو بھی اسی طرح بج

رہے تھے جیسے کل بج رہے تھے۔ سب کچھ پرانا تھا سوائے اس کے گھوڑے کی کلغی کے۔ کلغی دراصل گھوڑے کے ماتھے پر لگانے والی ایک چیز ہوتی ہے جو گھوڑے کی آرائش اور خوب صورتی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کلغی عام طور پر رنگ برنگے پروں سے بنی ہوتی ہے۔ کوچوان اسے اپنے گھوڑے کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ منگو نے یہ کلغی 31 مارچ کو نئے قانون کی خوشی میں خریدی تھی۔ یہ کلغی اس نے اپنے دوست چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

شہر میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر منگو کے دل میں ایک لمحے کے لیے حیرانی پیدا ہوئی۔ اس نے خود سے سوال کیا کہ کیا واقعی نیا قانون آچکا ہے؟ نیا قانون آنے سے بھی کچھ کیوں نہیں بدلا؟ اس کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے لیکن اس نے جلد ہی ان خیالات کو جھٹک دیا۔ اس کے دل میں جو امید تھی وہ اتنی مضبوط تھی کہ حقیقت کو دیکھ کر بھی وہ اسے ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ شاید ابھی صبح ہوئی ہے، ابھی سب کچھ واضح نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر بعد سب کچھ نیا ہو جائے گا۔

؎ انہی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند نکلے گا　　اندھیری رات کے پردے میں دن کی روشنی بھی ہوگی
(اختر شیرانی)

یہاں منگو کی سادگی اور اس کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو بہت سیدھے اور آسان طریقے سے سمجھتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ نیا قانون کسی جادو کی چھڑی کی طرح ہوگا جو یک دم سب کچھ بدل دے گا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ قوانین چاہے کتنے بھی اچھے ہوں، ان کے اثرات آہستہ آہستہ ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے یہ سمجھ نہیں تھی کہ کسی بھی ملک میں تبدیلی صرف قانون بنانے سے نہیں آتی بلکہ لوگوں کے رویے، حکومت کے اقدامات اور وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی ہے۔ منگو ان سب باتوں سے بے خبر تھا۔ اس کے لیے قانون کا مطلب ایک جادوئی تبدیلی تھی جو یکم اپریل کی صبح آتے ہی نظر آنی چاہیے تھی۔

''نیا قانون'' جس کا منگو کو انتظار تھا دراصل وہ آئینی اصلاح یا قانون سازی تھی جسے برطانوی حکومت نے ہندوستان میں نافذ کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ قانون برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کے بعد منظور کیا جانا تھا۔ اس کے بعد اسے وائسرائے کی منظوری کے بعد ہندوستان میں نافذ کرنا تھا۔ قوانین بنانے کا یہ طریقہ برطانوی راج کے تحت تھا۔ قانون سازی میں مقامی عوام کی رائے یا خواہشات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

؎ وہ تیرگی ہے کہ اکثر خیال آتا ہے　　میرے فلک پہ کوئی آفتاب ہے کہ نہیں
(معین احسن جذبی)

منگو کو قانون سازی اور قانون کے نفاذ کے سارے عمل کا بالکل علم نہیں تھا۔ اس کے دل میں بڑی امید تھی کہ جب یکم اپریل کو وہ شہر میں نکلے گا تو اسے سب کچھ نیا نظر آئے گا۔ دکانوں کے سائن بورڈ بدلے ہوں گے، سڑکوں پر کچھ نیا رنگ ہوگا، لوگوں میں بھی شاید کوئی نیا جوش وخروش ہوگا، انگریز ملک سے جا چکے ہوں گے یا کوئی ایسا منظر ہوگا جس سے اسے محسوس ہوگا کہ نیا قانون آچکا ہے۔ لیکن جب اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ سارا منظر دیکھ کر اس کا دل کچھ لمحوں کے لیے دھڑکا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کو توڑنے کی کوشش کی ہو مگر وہ فوراً سنبھل گیا۔ اس نے سوچا کہ شاید تبدیلی کو نظر آنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

؎ ہماری بستی میں ہر طرف انقلاب نو کا عمل تھا جاری　　نہ جانے یہ کون سا جہاں ہے نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی ہلچل
(نصرت گوالیاری)

یہ منظر دراصل ایک عام ہندوستانی کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔ جو اپنے ملک کے حالات کو بدلتے دیکھنے کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر چیز فوراً بہتر ہو جائے لیکن حقیقت میں تبدیلیاں وقت کے ساتھ آتی ہیں۔ استاد منگو کی کہانی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سادہ لوگ اکثر بڑی بڑی باتوں کو اپنے طریقے سے سمجھتے ہیں اور بعض اوقات ان چیزوں پر یقین کر لیتے ہیں جو حقیقت میں فوری ممکن نہیں ہوتیں۔ منگو نے نئے قانون کو بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس نے اسے ایک معجزے کی طرح سمجھا تھا۔ جو یکم

اپریل کی صبح آتے ہی دنیا کو بدل دے گا۔ مگر جب ایسا نہیں ہوا تو بھی وہ مایوس نہیں ہوا بلکہ اس نے اپنی امید کو قائم رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حقیقت کی بجائے اپنی خواہشات اور امیدوں پر یقین رکھتا تھا۔

؎ ہمیں یقیں ہے کہ ہم ہیں چراغ آخرِ شب　　ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
(ظہیر کاشمیری)

عبارت نمبر 16

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے۔ مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انارکلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منیاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔۔۔۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو اپنے اڈے میں نہایت سمجھ دار آدمی سمجھا جاتا تھا۔ رسمی تعلیم نہ ہونے کے باوجود منگو کے تمام ہم پیشہ اس کے علم وفہم کے قائل تھے۔ سواریوں سے ملنے والی خبریں اور افواہیں اس کی معلومات میں اضافے کا ذریعہ تھیں۔ وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور نئے قانون کے نفاذ کا خواہش مند تھا۔ جب اُس نے سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر کار وہ یکم اپریل کو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکل پڑا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ یکم اپریل کو چھاؤنی میں منگو کا ایک انگریز سے جھگڑا ہو گیا اور پولیس استاد منگو کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ وہ راستے میں اور تھانے میں نیا قانون، نیا قانون چلّاتا رہا، لیکن قانون تو وہی پُرانا تھا۔ اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو کو نئے قانون کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ یکم اپریل کی صبح وہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ تانگہ لے کر نکلا۔ نیا قانون آنے کے بعد شہر میں ہونے والی تبدیلیوں کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یکم اپریل کو سب کچھ بدل جائے گا۔ ہر چیز میں نئی روشنی، ایک نیا رنگ اور ایک تازگی محسوس ہوگی۔ مگر جب وہ شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں گھوما تو اسے ہر چیز ویسی ہی پرانی نظر آئی۔ نہ دکانیں بدلی تھیں، نہ لوگ اور نہ بازار کا ماحول۔ وہ مایوسی اور تجسس کے عالم میں گورنمنٹ کالج کی طرف چلا گیا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو جب گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے کالج کے گھڑیال کو نو بجاتے سنا۔ گورنمنٹ کالج لاہور اپنی شان دار عمارت اور تعلیمی معیار کے لحاظ سے ہندوستان کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتا تھا۔ منگو کا خیال تھا کہ نئے قانون سے تبدیلی کا اثر وہاں زیادہ نمایاں ہوگا۔ جب وہ پہنچا تو نو بجے کا وقت تھا۔ گھڑیال

کا وقت بتانے کا انداز منگو کو رعونت بھرا محسوس ہوا۔ یہ محض وقت کا اعلان نہیں بلکہ ایک خاص وقار اور تحکم کے ساتھ اپنی موجودگی کا اعلان تھا۔ کالج کے دروازے سے نکلتے ہوئے طلبہ خوش لباس تھے۔ ان کے کپڑے صاف ستھرے اور اچھے معیار کے تھے لیکن استاد منگو کو ان کے لباس میلے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی یہ کیفیت دراصل اس کی ذہنی حالت کا نتیجہ تھی۔ وہ نئے قانون کے انتظار میں تھا اور اس کے ذہن میں کسی نئی، چمکدار چیز کا تصور تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک درخشاں اور تابناک تبدیلی کی امید موجود تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہر چیز میں ایک نیا پن ہو۔ وہ اسی امید اور خواہش کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ لیکن اسے جب کوئی تبدیلی اور نیا پن نظر نہیں آیا تو وہ قدرے مایوس ہو گیا۔ اب اس کے ذہن کی یہ حالت تھی کہ طلبہ کے صاف ستھرے لباس بھی اسے میلے دکھائی دے رہے تھے۔

؎ ناامیدی بڑھ گئی ہے اس قدر آرزو کی آرزو ہونے لگی
(مرزا خاں داغ)

اس کیفیت کا سبب یہ تھا کہ اس کی آنکھیں کسی ''خیرہ کن جلوے'' کی متلاشی تھیں۔ وہ کچھ ایسا دیکھنا چاہتا تھا جو حقیقتاً نیا اور انقلابی ہو۔ وہ کچھ ایسا دیکھنا چاہتا تھا جو اسے محسوس کرائے کہ واقعی نیا قانون آچکا ہے اور ہر چیز بدل چکی ہے۔ لیکن چوں کہ ظاہری طور پر کچھ بھی اسے بدلا ہوا محسوس نہ ہوا اس لیے اس کے شعور نے حقیقت کو اسی طرح قبول کرنے سے گریز کرنا شروع کر دیا۔ عام انسانی نفسیات ہے کہ جب انسان کسی بڑی امید میں ناکامی کا سامنا کرتا ہے تو وہ مایوسی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر اسے ہر چیز بے رونق اور پرانی محسوس ہوتی ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

؎ دل تو میرا اداس ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب سے گزرنے کے بعد منگو نے تانگے کو دائیں طرف موڑا اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ انارکلی بازار میں داخل ہو گیا۔ نو بج چکے تھے اور بازار میں لوگوں نے اپنے معمول کے کام شروع کر دیے تھے۔ اس نے دیکھا کہ بازار روزانہ کی طرح کھل رہے تھے اور لوگ اپنی روزمرہ کی خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ حلوائی کی دکان پر چہل پہل تھی۔ گاہک دکانوں کے سامنے کھڑے تازہ مٹھائیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ کوئی جلیبی خرید رہا تھا، کوئی تازہ لسی کا گلاس تھامے ناشتہ کر رہا تھا، دکان دار آوازیں لگا کر گاہکوں کو للچا رہے تھے۔ کاروبار معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ منگو کو یہاں بھی کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہ ملی۔ بازار کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا کل تھا، پرسوں تھا اور ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا۔

؎ نہ جانے کس لیے اُمیدوار بیٹھا ہوں اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گزر بھی نہیں
(فیض احمد فیض)

نیاری کی دکانوں پر شیشے کی الماریوں میں سجی چیزیں جگمگا رہی تھیں۔ رنگ برنگی چوڑیاں، سنگھار کا سامان، عطر کی چھوٹی شیشیاں اور خوش بودار تیل کی بوتلیں قطار میں رکھی تھیں۔ ہر چیز چمک رہی تھی اور خریداروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ استاد منگو کو ان سب چیزوں میں کوئی نیا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

بازار میں لوگوں کی آمد و رفت بڑھ گئی تھی۔ مرد، عورتیں اور بچے سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کئی خریداری کر کے خوشی خوشی دکانوں سے نکل رہے تھے۔ لوگ اپنے اپنے معاملات میں مگن تھے۔ کسی کے چہرے پر کوئی خاص حیرت یا خوشی نہیں تھی۔ بازار میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو یہ ظاہر کرے کہ آج کوئی بڑا دن ہے۔ کوئی نیا قانون آ گیا ہے یا آج کوئی انقلاب آ گیا ہے۔ منگو نے بجلی کے تاروں پر بیٹھے کبوتروں کو دیکھا جو آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ یہ معمول کی بات تھی۔ یہ روز کے مناظر تھے جو ہر دن کی طرح آج بھی جاری تھے۔

گورنمنٹ کالج کی طرف اور انارکلی بازار میں کہیں بھی استاد منگو کو بڑی تبدیلی نظر نہ آئی۔ ہر جگہ لوگ اپنے معمول کے مطابق کام کاج میں مصروف تھے۔ یہ سب دیکھ کر استاد منگو کے دل میں بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے بہت کچھ دیکھا تھا مگر جس تبدیلی کو دیکھنے کے

لیے وہ نکلا تھا، وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے ماروا ڑی کی بات سُن رکھی تھی کہ نیا قانون آنے سے کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آئے گی۔ منگو کو نئے قانون کی آمد سے بہت بڑی تبدیلی کا یقین تھا۔ مگر آج یکم اپریل کو بھی ہر چیز میں پرانی دنیا کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ توقع کے خلاف، ہر منظر ویسا ہی تھا جیسا وہ روز دیکھتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ نیا قانون آ جانے کے باوجود کسی چیز پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

؎ نئے زمانے کی مَیں بشارت کا منتظر ہوں مگر ابھی تک حیات ایسے رواں دواں ہے نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی ہلچل
(نصرت گوالیاری)

یہ تمام تفصیلات ایک عام انسان کی سوچ کی عکاسی کرتی ہیں۔ جب کوئی شخص کسی بڑی تبدیلی کی امید لگا لیتا ہے تو وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ اگر اسے تبدیلی نظر نہ آئے تو وہ حقیقت کو بھی دھندلا دیکھنے لگتا ہے۔ استاد منگو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ جس حیرت انگیز تبدیلی کا انتظار کر رہا تھا وہ اس کی نظروں کے سامنے نہیں آ رہی تھی۔ یہی بات اس کے لیے الجھن کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا تھا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ شاید تھوڑی دیر بعد، کسی اور جگہ، کسی اور بازار میں اسے وہ نیا قانون دیکھنے کو مل جائے گا جس کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔

عبارت نمبر 17

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو جوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ اسے دنیا کے تمام معاملات کا علم تھا اور اس کے علم کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی اس لیے وہ ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ جب اس نے اپنی سواریوں سے یکم اپریل سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنی تو بے حد خوش ہو گیا۔ وہ اس سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ کر چکا تھا۔ یکم اپریل کو جب منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو اسے سب کچھ پہلے جیسا نظر آیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ یکم اپریل کو چھاؤنی میں منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو گئی۔ منگو کو پولیس گرفتار کر کے تھانے لے گئی۔ راستے میں وہ نیا قانون نیا قانون چلاّتا رہا۔ لیکن قانون تو وہی پرانا تھا۔ لہٰذا اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف بتاتے ہیں کہ استاد منگو ایک عام کوچوان تھا مگر اس کے دل میں آزادی کی شدید خواہش تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں نیا قانون نافذ ہونے والا ہے تو اسے لگا کہ اس کا آزادی کا خواب پورا ہونے والا ہے۔ اس نے نئے قانون کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ نیا قانون نافذ ہوتے ہی ملک میں ہر چیز بدل جائے گی۔ یکم اپریل کی صبح وہ نئے قانون کے نفاذ کے ساتھ ہی اپنی آنکھوں سے بڑی تبدیلی دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی امید میں وہ صبح سویرے تانگہ لے کر نکلا تا کہ

انقلاب کو دیکھ سکے۔ اس نے شہر میں چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ اس نے گورنمنٹ کالج اور انارکلی بازار کی طرف بھی دیکھا مگر سب کچھ معمول کے مطابق پرانا تھا۔ اس کا دل بے چینی سے دھڑک رہا تھا اور وہ بے تاب تھا کہ آخر نیا قانون کیسا ہوگا۔ یہ انتظار اس کی طبیعت کے مطابق تھا۔ وہ عام طور پر سیاست اور بڑی تبدیلیوں میں دل چسپی لیتا تھا۔ جب بھی شہر میں کوئی خاص واقعہ ہوتا، جیسے کسی مشہور سیاست دان کا جلسہ یا جلوس تو وہ اسے دیکھنے ضرور جاتا تھا۔ گاندھی اور جواہر لال اس کے پسندیدہ سیاست دان تھے۔ ہزاروں لوگوں کی طرح وہ بھی ان سیاست دانوں کے جلسوں میں ضرور شرکت کرتا۔

گاندھی جی جنھیں ''مہاتما گاندھی'' بھی کہا جاتا ہے، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے سب سے بڑے رہنما تھے۔ وہ سیاست میں عدمِ تشدد کے اصول پر یقین رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ امن وامان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے کئی تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں میں ''عدم تعاون کی تحریک''، ''سول نافرمانی تحریک'' اور ''بھارت چھوڑو تحریک'' مشہور ہیں۔ ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سادگی سے رہتے تھے۔ وہ کھدر کا لباس پہنتے اور گاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو آزادی کی اہمیت سمجھاتے تھے۔ ان کی باتیں عام آدمی کے دل میں گھر کر جاتی تھیں۔ بڑی تعداد میں لوگ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔

جواہر لال نہرو بھی ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ایک اہم رہنما اور مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھی تھے۔ آزادی کے بعد وہ ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم بنے۔ انھیں بچوں سے بہت محبت تھی اس لیے انھیں ''چچا نہرو'' کہا جاتا ہے۔ بھارت میں ان کا یومِ پیدائش ''یومِ اطفال'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ جدید سوچ اور ترقی پر زور دیتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان ایک ترقی یافتہ اور مضبوط ملک بنے۔

؎ وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستاں ہوگا مبارک باد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا

عام لوگ ان رہنماؤں کو بہت عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب بھی ان کا کوئی جلسہ ہوتا یا جلوس نکلتا تو لوگ بڑی تعداد میں سڑکوں پر آجاتے تاکہ انھیں دیکھ سکیں۔ دور دور سے لوگ ان کی تقریریں سننے اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ استاد منگو کو بھی ان رہنماؤں سے بہت محبت تھی۔ اس کے لیے گاندھی جی اور نہرو جی کا جلوس دیکھنا ایک خاص موقع ہوتا تھا۔ وہ صرف یہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کی تقریریں سنے بلکہ وہ ان رہنماؤں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ وہ ان کی تقریروں اور جلسوں سے متاثر ہوتا تھا۔ آج جب وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے نکلا تو اس کا جوش ویسا ہی تھا جیسا کسی بڑے لیڈر کے جلوس کے لیے ہوتا تھا۔ وہ بڑی خوشی اور جذبے سے صبح سویرے تانگہ کو جوت کر باہر نکلا اور بازاروں میں گھومتا رہا۔ اس کی بے قراری اور تجسس ظاہر کر رہا تھا کہ اس کے لیے وہ قانون بہت اہم تھا۔ وہ اسے کسی حقیقت کی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس قانون کا اثر اسی طرح دیکھنا چاہتا تھا جیسے جلوس میں گاندھی اور نہرو کو دیکھتا تھا۔

استاد منگو ایک عام فہم کا آدمی تھا جو دنیا کو اپنے سادہ اور جذباتی انداز میں دیکھتا تھا۔ وہ کسی بھی لیڈر کی عظمت کا اندازہ اس کی تقریروں یا اصولوں سے نہیں بلکہ اس کے گلے میں ڈالے گئے پھولوں کے ہاروں سے لگاتا تھا۔ اس کے نزدیک اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بہت زیادہ لوگ شامل ہوتے اور وہ گیندے کے پھولوں کے ہاروں سے لدا ہوتا تو وہ بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بہت زیادہ بھیڑ کی وجہ سے فساد ہوتے ہوتے رہ جاتا تو استاد منگو کے خیال میں اس لیڈر کی عظمت اور بڑھ جاتی تھی۔ منگو کی یہ سوچ عام لوگوں کی سادہ اور جذباتی سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔ ایسی سوچ کے حامل لوگ چیزوں کے ظاہری پہلو پر زیادہ دھیان دیتے ہیں۔ وہ لیڈروں کے خیالات اور اصولوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

منگو کی زندگی میں بھی یہی انداز نظر آتا ہے۔ وہ نئے قانون کو بھی اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح لوگ بڑے لیڈر کے جلوس میں جمع ہو کر نعرے لگاتے ہیں اسی طرح نئے قانون کے نفاذ پر بھی لوگ جوش وخروش کا مظاہرہ کریں گے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر نیا قانون واقعی اہم ہے تو اس کا اثر فوری طور پر نظر آئے گا۔ اس کی نظر میں نیا قانون بھی کسی بڑے

لیڈر کی طرح تھا۔ جب اسے شہر میں کوئی بڑی تبدیلی نظر نہ آئی تو وہ مایوس ہو گیا۔ منگو کا یہ نظریہ حقیقت پسندانہ نہیں بلکہ جذباتی تھا۔ وہ دنیا کو صرف سطحی انداز میں دیکھنے کا عادی تھا۔ بقول شاعر:

؎ رُتوں نے اپنے قرینے بدل لیے لیکن ہمارے طور وہی ہیں نہیں بدلتے ہیں
(اشفاق عامر)

عبارت نمبر 18

انارکلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں خیال کیا، ''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔۔۔۔ شاید چھاؤنی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔''

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو انگریزوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور ایک نئے قانون کے نفاذ کا خواہش مند تھا، جس کے ذریعے اسے انگریزوں سے چھٹکارا مل سکتا۔ جب اُس نے اپنی سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سُنی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ نئے قانون کے بارے میں سوچ کر اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ آخر کار یکم اپریل آ گئی۔ منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا، لیکن شہر میں سب کچھ حسبِ معمول تھا۔ اسے بازار میں کچھ نیا دیکھنے کو نہیں ملا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ چھاؤنی میں استاد منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے اور پولیس اُسے گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ وہ سارے راستے اور تھانے میں نیا قانون، نیا قانون چلاّتا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا تھا۔ لہٰذا اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو ایک عام تانگے والا تھا مگر اس کا دل ایک عام آدمی کے دل سے کہیں زیادہ جذباتی تھا۔ وہ ایک سادہ مگر جوشیلا آدمی تھا۔ اس کے خیالات میں سیاست اور آزادی کی باتیں گہرائی سے بسی ہوئی تھیں۔ وہ نئے قانون کے نفاذ کے بعد لاہور کی گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے کوئی واضح تبدیلی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کیوں کہ ہر چیز پہلے جیسی تھی۔ دکانوں، بازاروں اور لوگوں کی مصروفیات میں کوئی واضح فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ نئے قانون کے اثرات کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کوئی بڑی تبدیلی دیکھنے کی امید میں وہ انارکلی بازار آیا۔ یہاں کے حالات دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی۔ چناں چہ وہ انارکلی سے نکلا اور تانگہ لے کر مال روڈ کی چمکتی سڑک پر آ گیا۔ مال روڈ، لاہور کی ایک مشہور اور تاریخی سڑک ہے، یہ سڑک اہم سرکاری عمارتوں، تعلیمی اداروں، ہوٹلوں اور مشہور بازاروں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ سڑک برطانوی دور سے ہی اپنی خوب صورتی اور اہمیت کے

لیے پہچانی جاتی ہے۔ سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے اس کی نظر اردگرد کے مناظر کا جائزہ لے رہی تھی، اسے کسی ایسے منظر کی تلاش تھی جو اسے یقین دلا سکتا کہ واقعی کوئی نیا قانون آچکا ہے۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو اور پرانی دنیا میں کوئی تبدیلی نہ آئی ہو۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ مایوس نہیں تھا، وہ کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں اسے نئے قانون کا کچھ اثر دکھائی دیتا۔

؎ نئے زمانے کی مَیں بشارت کا منتظر ہوں مگر ابھی تک حیات ایسے رواں دواں ہے نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی ہلچل

(نصرت گوالیاری)

اور بقول نصرت گوالیاری:

؎ ہر شخص اپنی اپنی جگہ یوں ہے مطمئن جیسے کہ جانتا ہو قضا کا ہے رخ کدھر

چلتے چلتے جب وہ موٹروں کی دکانوں کے پاس پہنچا تو اچانک اسے ایک سواری مل گئی۔ وہ سواری چھاؤنی جانا چاہتی تھی۔ استاد منگو نے موقع غنیمت جانا اور سواری سے فوراً کرایہ طے کرلیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ اسے چھاؤنی سے صحیح معلومات مل جائیں گی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر واقعی نیا قانون آیا ہے تو اس کا اثر سب سے پہلے انگریزوں کے علاقے یعنی چھاؤنی میں ہی نظر آنا چاہیے۔ اسے امید تھی کہ وہاں ضرور کوئی نیا منظر دیکھنے کو ملے گا۔ چھاؤنی میں فوجی نظم وضبط میں فرق یا انگریز افسروں کے رویے میں تبدیلی سے نئے قانون کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

تانگہ آگے بڑھ رہا تھا اور استاد منگو کے خیالات کی رفتار بھی تیز ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک امید تھی لیکن ساتھ ہی ایک انجانا خوف بھی تھا کہ کہیں اس کی توقعات غلط نہ ثابت ہو جائیں۔ وہ کسی ایسے منظر کا منتظر تھا جو اس کے دل کو یقین دلا دے کہ واقعی سب کچھ بدل چکا ہے، وہ چھاؤنی پہنچنا چاہتا تھا اس لیے تانگہ تیز دوڑاتے ہوئے اسی جانب جا رہا تھا۔ تانگہ چلاتے ہوئے وہ ایک اور مسئلے پر بھی غور کر رہا تھا۔ وہ قانون اور اس کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میونسپل کمیٹی کے طریقۂ کار کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نئے قانون کے تحت تانگوں کے نمبر لینے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ تانگوں کے نمبر لینے کے نظام میں کس قسم کی تبدیلی آئی ہوگی؟ کیا اس نظام میں نمبر لینے میں کوئی آسانی ہوگی یا اسے اور مشکل بنا دیا گیا ہوگا؟ کیا اب انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے؟ کیا بدعنوانی، رشوت اور افسر شاہی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام سے متعلقہ معاملات میں بھی گہری دل چسپی لیتا تھا۔ اس کے دماغ میں یہی سوال تھا کہ نئے قانون کا اثر اس کی زندگی پر کیسے پڑے گا۔

؎ میرا جسم اور کہیں، میرا خیال اور کہیں مجھ کو لے جائے گی، یہ موجِ وصال اور کہیں

(عرفان صدیقی)

وہ انھی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اسے لگا جیسے کسی نے اسے بلایا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کے اس پار، بجلی کے کھمبے کے قریب ایک گورا کھڑا ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ یہاں ''گورا'' سے مراد انگریز سرکاری افسر یا فوجی ہے۔

استاد منگو کو گوروں سے نفرت تھی۔ جوں ہی اس کی نظر گورے پر پڑی اس کے دل میں نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ گورے افسر اس کی بے عزتی کیا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں نے انھیں غلام بنا رکھا تھا اور وہ ہمیشہ حکم دینے کے عادی تھے۔ ان کی رعونت، ان کی حکمرانی اور ان کے رویے سے اسے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔ مدت سے اس کی خواہش تھی کہ کوئی نیا قانون آئے اور انگریزوں کی حکومت ختم ہو۔ ہندوستانی اپنے ملک پر آپ حکومت کریں۔ غلامی کا دور ختم ہو اور غریبوں کو ان کے حقوق ملیں۔ غریبوں اور محنت کشوں کو عزت ملے اور انھیں بھی انسان سمجھا جائے۔ اس کا خیال تھا کہ انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ اور ہندوستانیوں کی آزادی صرف نئے قانون کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اسے یقین تھا کہ نیا قانون نافذ ہوتے ہی انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور سب کچھ تبدیل ہو جائے گا۔ وہ صبح سویرے سے تبدیلی کی تلاش میں سرگرداں تھا لیکن اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے گورے کو دیکھ کر اس کی نفرت جاگ اٹھی۔

یہ اقتباس ایک عام آدمی کی معصومیت، اس کے خیالات اور اس کی امیدوں کی عکاسی کرتا ہے۔ استاد منگو کے نزدیک نیا قانون کسی جادوئی چیز سے کم نہیں تھا جس کے آتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا کیوں کہ قوانین کا اثر فوری نہیں ہوتا بلکہ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی ان باتوں کو گہرائی میں جا کر نہیں سمجھتا۔ وہ ہر سیاسی اور قانونی تبدیلی کو اپنی ذاتی زندگی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی سوچیں اور امیدیں سطحی انداز کی ہوتی ہیں اس لیے وہ پوری نہیں ہو سکتیں۔

عبارت نمبر 19

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا۔ وہ اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں، ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہییں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو نئے قانون کا خواہش مند تھا، تاکہ انگریزوں سے چھٹکارا مل سکے۔ جب وہ اپنی ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو بے حد خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ نئے قانون کا سن کر وہ پُر اُمید ہو جاتا ہے اور یکم اپریل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ آخر کار یکم اپریل آ جاتی ہے۔ وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکل جاتا ہے لیکن اُسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو کا چھاؤنی میں ایک انگریز سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ انگریز کو دھڑا دھڑ پیٹتا ہے اور کہتا ہے کہ یکم اپریل آ گئی، اب ہمارا راج ہے۔ پولیس منگو کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ وہ سارے راستے نیا قانون، نیا قانون چلاّ تا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے۔ اسے حوالات میں قید کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ یکم اپریل کو صبح سویرے وہ نئے قانون کے نفاذ کے اثرات دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شہر میں کوئی بہت بڑی تبدیلی آچکی ہوگی۔ وہ شہر کی گلیوں اور سڑکوں میں گھومتا رہا لیکن اسے کہیں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ اس نے انارکلی بازار میں دیکھا کہ سب لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ہر چیز پرانی تھی حالاں کہ نیا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ وہ مایوس ہو کر انارکلی سے مال روڈ کی طرف نکل گیا۔ اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی تو اسے خوشی ہوئی کہ چھاؤنی سے اسے نئے قانون کے نفاذ کی خبر مل سکے گی۔ جب وہ تانگے پر چھاؤنی کی طرف جا رہا تھا تو اس کے ذہن میں نئے قانون کے بارے میں مختلف خیالات گردش کر رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے ملک آزاد ہو جائے گا اور عام آدمی کی زندگی بہتر ہو جائے گی۔ اسے خیال آیا کہ نئے قانون سے اس کی زندگی پر بھی بہت اثر پڑے گی۔ اس کی زندگی پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ سوچنے لگا کہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر کیسے ملیں گے؟

میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کا مطلب ہے تانگوں کو سرکاری طور پر رجسٹر کرنا اور اسے چلانے کی اجازت دینا۔ اُس دور میں آمدورفت کے لیے تانگے عام استعمال ہوتے تھے۔ میونسپل کمیٹی ہر تانگے کو ایک مخصوص نمبر دیتی تھی۔ یہ نمبر گویا میونسپل کمیٹی کے رجسٹر میں رجسٹریشن کا حوالہ ہوتا تھا۔ رجسٹریشن نمبر دینے کی ایک فیس مقرر ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا سالانہ ٹیکس بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ فیس اور ٹیکس سرکاری اخراجات، سڑکوں کی دیکھ بھال، اڈوں کی دیکھ بھال اور ٹریفک کے انتظام کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کوچوانوں کو رجسٹریشن نمبر لینے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کمیٹی نے سڑک پر تانگا چلانے کے لیے گھوڑے اور تانگے کی حالت کے حوالے سے کئی اصول بنا رکھے تھے۔ کوچوانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان اصولوں اور ضروری اقدامات کو پورا کریں۔ بعض اوقات کمیٹی کے اہلکار رشوت لینے کے لیے تانگوں یا گھوڑوں کی حالت پر اعتراض لگا دیتے تھے۔ ایسے ہتھکنڈوں سے کوچوان تنگ آ جاتے تھے۔ منگو کا خیال تھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے جب سب کو حقوق ملیں گے تو کوچوانوں کی بھی سنی جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میونسپل کمیٹی سے نمبر لینا بھی آسان ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے نئے قانون میں سالانہ ٹیکس میں بھی کمی کر دی جائے یا ختم کر دیا جائے۔

منگو ایسے ہی خیالات میں گم چھاؤنی کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے بلا رہا ہے۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تو وہاں ایک گورا بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا تھا۔ منگو اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بُلایا۔ استاد منگو کو گوروں سے نفرت تھی۔ وہ اکثر انھیں ''سفید چوہے'' کہتا تھا۔ اسے گوروں کی شکل دیکھ کر متلی ہوتی تھی۔ وہ دوستوں میں بیٹھ کر انھیں بُرا بھلا کہتا اور ان کی شکل کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نفرت کی وجہ یہ تھی کہ منگو انھیں غاصب سمجھتا تھا۔ منگو کا خیال تھا کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو غلام بنا رکھا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے انگریز افسر اس سے بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔ جیسے ہی منگو نے گورے کو دیکھا اس کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ انگریزوں کے خلاف جو نفرت وہ دل میں برسوں سے پال رہا تھا وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ اس نے ہمیشہ انھیں ظالم، جابر اور قابض حکمران سمجھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ یہ احساس اس کے دل میں ایک شدید بغاوت پیدا کر رہا تھا۔ بقول پروین شاکر:

؎ کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے اور کچھ مری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

ایک اور شاعر کے بقول:

؎ کبھی تو چھین لوں گا میں ردائے ناموری جو حصہ غیر کے قبضے میں ہے وہ میرا ہے

ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہ وہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے۔ وہ اس کی طرف توجہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی انگریز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ظالم کو اپنے تانگے پر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قریب تھا کہ وہ اسے نظر انداز کر کے نکل جاتا لیکن اچانک ایک عملی سوچ اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے نئے قانون کی خوشی میں جو کلغی خریدی تھی اس پر اس کے ساڑھے چودہ آنے خرچ ہو چکے تھے۔ وہ رقم بھی اس کی محنت کی کمائی تھی جو وہ اتنی آسانی سے گنوا چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس گورے کو تانگے میں بٹھا لے تو اچھا کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ اس طرح اس نے کلغی پر جو رقم ضائع کی تھی اس نقصان کو بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال سے اس کا غصہ کچھ کم ہو گیا۔ اس نے اپنے جذبات کو دبایا اور گورے کو اپنے تانگے پر سوار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ واقعہ استاد منگو کی ذہنی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر غلامی کے خلاف تھا اور انگریزوں سے نفرت کرتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے اسے روزی روٹی کی بھی ضرورت تھی۔ ایک طرف اس کی نفرت اور بغاوت کا جذبہ تھا تو دوسری طرف اس کی معاشی مجبوری تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نفرت اور غصے سے اس کے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اسے عملی طور پر بھی زندگی کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جو غلام ہندوستان کے ہر عام آدمی کی مجبوری تھی۔ لوگ دل میں انگریزوں کے خلاف غصہ رکھتے تھے لیکن وہ اپنے روزمرہ مسائل کے ہاتھوں مجبور بھی تھے۔ اسی لیے وہ اپنے ذاتی احساسات کو وقتی

طور پر دبا کر مالی فائدے کو ترجیح دیتے تھے۔

سفر کے ساتھ سفر کے نئے مسائل تھے گھروں کا ذکر تو رستے میں چھوٹ جاتا تھا (وسیم بریلوی)

عبارت نمبر 20

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا، صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس ''گورے'' کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو نئے قانون کا خواہش مند تھا، تا کہ انگریزوں سے چھٹکارا مل سکے۔ جب وہ اپنی ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو بے حد خوش ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ نئے قانون کا سن کر وہ پُر اُمید ہو جاتا ہے اور یکم اپریل کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ آخر کار یکم اپریل آ جاتی ہے۔ وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے لیکن اُسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو کا چھاؤنی میں ایک انگریز سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔ وہ انگریز کو دھڑا دھڑ پیٹتا ہے اور کہتا ہے کہ یکم اپریل آ گئی، اب ہمارا راج ہے۔ پولیس منگو کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ وہ راستے میں نیا قانون، نیا قانون چلّاتا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے۔ اسے حوالات میں قید کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو انارکلی سے نکل کر مال روڈ کی طرف مڑ گیا۔ وہاں اسے چھاؤنی جانے والی ایک سواری مل گئی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم چھاؤنی کی طرف جا رہا تھا کہ سڑک کنارے کھڑے ایک گورے نے اسے اپنی طرف بلایا۔ گورے کو دیکھ کر استاد منگو کو بہت غصہ آ گیا۔ وہ انگریزوں کی حاکمانہ سوچ اور ان کے ظلم و ستم سے سخت نالاں تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس گورے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے۔ لیکن پھر ایک اور خیال آیا کہ اگر وہ اسے بٹھا لے تو زیادہ کرایہ وصول کر سکتا ہے۔ اس نے گورے کو تانگے میں سوار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب اس نے تانگے کو مہارت سے موڑ کر گورے کے قریب روکا تو اس کا انداز معمولی تانگے والے جیسا نہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر طنزیہ انداز میں بولا ''صاحب بہادر، کہاں جانا مانگتا'' اس کے لہجے میں ایک چھپی ہوئی تلخی تھی، ایک ایسی طنز تھی جو شاید گورا سمجھ نہ پایا ہو۔ لیکن استاد منگو کے دل کو ایک عجیب سی تسکین دے رہا تھا۔ اس نے ''صاحب بہادر'' کہتے وقت اپنے ہونٹوں کو ایک مخصوص انداز میں کھینچ لیا، جس سے اس کا چہرہ کچھ عجیب سا لگنے لگا۔ اس کے گال کی وہ لکیر جو ناک کے نتھنے سے لے کر ٹھوڑی تک ہلکی سی ابھری ہوئی تھی، ایک دم گہری ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے لکڑی پر چاقو سے کوئی نشان بنا دیا ہو۔ اس کے چہرے پر ایک زبردست طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اندر ہی اندر وہ اس گورے کو اپنی نفرت کی آگ میں جھلسا رہا تھا۔

؎ زوروں پہ سلیم اب کے ہے نفرت کا بہاؤ جو بچ کے نکل آئے گا تیراک وہی ہے
(سلیم کوثر)

دراصل یہ استاد منگو کے اندر چھپی ہوئی نفرت کا اظہار تھا۔ اسے احساس تھا کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ وہ عرصے سے انگریزوں کے ظلم و جبر کو برداشت کر رہا تھا۔ وہ ایک عام تانگے والا تھا جو بظاہر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف دوستوں میں بیٹھ کر انگریزوں کو بُرا بھلا کہہ سکتا تھا۔ وہ کھل کر بغاوت نہیں کر سکتا تھا۔ نیا قانون نافذ ہونے سے منگو کو اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ نیا قانون نافذ ہونے سے انگریز یہاں سے چلے جائیں گے اور ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ یکم اپریل تھی اور نیا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے انگریزوں کے ظلم سے نجات مل جائے گی۔ اسے شہر میں نئے قانون کے نفاذ سے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ پھر بھی گورے کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اب وہ آزاد ہو چکا ہے اور انگریز اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ آج اس کے پاس موقع تھا کہ وہ اپنے انداز سے گورے کی تحقیر کرتا۔ چناں چہ اس نے موقع ضائع نہیں کیا اور اپنی نفرت کا کھل کر اظہار کیا۔ وہ جانتا تھا کہ گورا شاید اس کے لہجے کی کاٹ کو نہ سمجھ سکے مگر وہ خود کو تسلی دینا چاہتا تھا۔ اس کا طنزیہ لہجہ، اس کی کھنچی ہوئی مونچھیں، اس کے چہرے کی سختی سب کچھ اس کی اندرونی نفرت کی عکاسی کر رہا تھا۔

استاد منگو کا خیال تھا کہ نیا قانون نافذ ہو چکا ہے۔ وہ صبح سے نئے قانون کے اثرات دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے گلیوں، سڑکوں اور بازاروں میں دیکھا لیکن اسے کہیں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ اس لیے اس کے دل میں الجھن اور بے چینی پیدا ہوگئی۔ اگرچہ وہ اپنی امید سے مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوا تھا مگر وہ کشمکش میں مبتلا تھا۔ اسے انگریزوں سے ویسے ہی نفرت تھی لیکن الجھن اور بے تابی میں اسے گورے پر زیادہ غصہ آگیا۔ اس نے اپنے لہجے اور اپنے چہرے کے بگاڑ سے اپنی اندرونی نفرت کا کھل کر اظہار کیا۔ اس سے اس کو ذرا تسکین ملی اور اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔

کاغذ یہ اُگل رہا ہے نفرت — کم ظرف ادیب ہوگیا ہے
(سیف زلفی)

یہ ایک عام تانگے والے کی نہیں بلکہ ایک غلام ہندوستانی کی کہانی ہے۔ وہ عام ہندوستانی جو انگریزوں کی ظالمانہ حکومت سے بیزار ہے اور آزادی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی بے بسی کے باوجود کسی نہ کسی طریقے سے اپنی نفرت کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ استاد منگو کی اس معمولی سی حرکت میں دراصل پورے ہندوستان کے کروڑوں افراد کے جذبات کی جھلک ہے۔ جو غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور کسی نہ کسی شکل میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

کبھی تو چھین لوں گا میں ردائے ناموری — جو حصہ غیر کے قبضے میں ہے وہ میرا ہے

اس عبارت میں صرف منگو کے کردار کو دیکھا جائے تو ایک دل چسپ پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ وہ جسمانی طور پر بے بس ہے۔ گورے کے خلاف اس کا دل نفرت سے بھرا ہوا تھا مگر وہ نہ تو اس پر ہاتھ اٹھا سکتا تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کچھ کر سکتا تھا۔ وہ غلام ہندوستان کا ایک معمولی آدمی تھا اور انگریز ظالم حکمران تھے۔ لیکن اس بے بسی کے باوجود اس نے اپنے جذبات کے اظہار کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیا۔ اس نے ایک ایسا انداز اپنایا جس سے اس کی نفرت، غصہ اور بغاوت عیاں تھی۔ وہ اپنے چہرے کے تاثرات، اپنی مسکراہٹ، اپنی مونچھوں کے ہلنے اور اپنے لہجے کے طنز سے گورے کو کم تر اور حقیر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عبارت نمبر 21

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا: ''جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟''

''وہی ہے۔'' یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کو چوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا کیوں کہ اسے دنیا کے تمام معاملات کا علم تھا اور ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے بہت نفرت تھی۔ اس لیے وہ ان سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ جب منگو نئے قانون کی خبر سنتا ہے تو اس کے دل میں یہ امید جاگ اٹھتی ہے کہ اب انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ وہ یکم اپریل کو نیا قانون دیکھنے کے لیے صبح سویرے گھر سے باہر نکلتا ہے لیکن سب کچھ پہلے جیسا پرانا ہوتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ چھاؤنی میں منگو کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے۔ وہ دل کھول کر انگریز کو مارتا ہے۔ پولیس اسے تھانے لے جاتی ہے۔ وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہتا ہے لیکن قانون تو وہی پرانا ہوتا ہے اور اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

استاد منگو ایک عام تانگے والا تھا مگر اس کے دل میں غلامی کا شدید احساس چھپا ہوا تھا۔ وہ برسوں سے انگریزوں کے رویے اور ان کی حاکمانہ سوچ سے نالاں تھا۔ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ وہ انگریزوں کو ظالم سمجھتا تھا کیوں کہ وہ ہندوستانیوں کو کمتر اور اپنا غلام سمجھتے تھے۔ جب اس نے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنی تو اس کے دل میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے لگا کہ شاید اب کوئی بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے انگریز کمزور پڑ گئے ہیں اور ہندوستان پر ان کی گرفت ختم ہوگئی ہے۔

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستاں ہوگا — مبارک باد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا

استاد منگو یکم اپریل کی صبح بڑے جوش کے ساتھ اپنے تانگے پر نکلا تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے کہ نیا قانون کیا تبدیلی لایا ہے۔ وہ مختلف جگہوں پر گیا مگر اسے ہر جگہ وہی پرانے حالات نظر آئے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی کے چہرے پر حیرت یا خوشی کے آثار تک نہیں تھے۔ اسے بہت مایوسی ہوئی کہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ اس کے اندر بے چینی بڑھنے لگی۔ جب وہ مال روڈ پر جا رہا تھا تو اسے چھاؤنی جانے والی ایک سواری مل گئی۔ اس نے سوچا کہ چھاؤنی میں نئے قانون کے اثرات دیکھے جا سکیں گے۔ چھاؤنی کی طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ نئے قانون کے بعد اب تانگوں کے نمبر کیسے ملیں گے۔ وہ انھیں سوچوں میں گم تھا کہ اسے سڑک کنارے ایک گورا نظر آیا جو اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ استاد منگو نے جیسے ہی گورے کو دیکھا، اس کے اندر نفرت کے جذبات جاگ اٹھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے۔ مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے تانگے پر بٹھا لے لیکن کرایہ زیادہ وصول کرے۔

وہ تانگہ موڑ کر گورے کے پاس پہنچا اور طنزیہ لہجے میں اسے کہا: ''صاحب بہادر، کہاں جانا مانگتا؟'' یہ سوال عام سوال نہ تھا بلکہ اس کے اندر طنز اور بے حد نفرت چھپی ہوئی تھی۔ وہ ہر گورے سے نفرت محسوس کرتا تھا۔ گورا اس کے انداز کو شاید سمجھ نہ پایا مگر استاد منگو کے دل کو تسکین ملی کہ اس نے اپنی برتری کا اظہار کر دیا تھا۔

جیسے ہی اس نے گورے کو غور سے دیکھا، اس کے ذہن میں جھٹکا سا لگا۔ یہ وہی گورا تھا جس سے پچھلے سال اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ گورے نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا مگر اس وقت منگو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بے بس تھا کیوں کہ

انگریز طاقت ور تھے۔ حکومت ان کی تھی اور ہندوستانی ان کے غلام تھے۔ وہ چاہ کر بھی اپنا غصہ نہیں نکال سکا تھا۔ مگر آج کی تاریخ مختلف تھی۔ آج یکم اپریل تھی اور نیا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے انگریزوں کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے اب وہ اس گورے سے بدلہ لے سکتا تھا۔

اس نے گھوڑے کی باگ اپنے دائیں ہاتھ میں بل دے کر تھام رکھی تھی، گورے کو پہچان کر وہ اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ باگ کے بل کھول کر تانگے سے نیچے اترنے لگا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے آثار تھے۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا۔ وہ گورے کو اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے اپنی نظروں سے جلا ڈالے گا۔ وہ گورے کو ایک دشمن کے طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے اپنی نگاہوں سے چبانے والا تھا۔ اس کے اندر انتقام کی آگ ایسے بھڑک رہی تھی کہ وہ اس گورے کے وجود کے ذرے ذرے کو مٹا دے گا۔

پڑے ہیں نفرت کے بیج دل میں، برس رہا ہے لہو کا ساون
ہری بھری ہیں سروں کی فصلیں، بدن پہ زخموں کے گل کھلے ہیں (ہارون فراز)

دوسری طرف گورا ابھی کچھ عجیب سا رویہ اختیار کیے کھڑا تھا۔ وہ اپنی نیلی پتلون سے کوئی غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے استاد منگو کے طنزیہ جملے نے اس کے وجود کو کسی طرح آلودہ کر دیا ہو۔ اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا، دھواں اندر نگلا اور بڑی بے پروائی سے کہا: ''جانا مانگلا یا پھر گڑ بڑ کرے گا؟''

یہ جملہ سن کر استاد منگو کے اندر ایک زبردست طوفان اٹھا۔ اسے لگا کہ یہ گورا ابھی بھی طاقت کے زعم میں مبتلا ہے۔ وہ ابھی بھی ہندوستانیوں کو کمتر اور اپنا غلام سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں ''وہی ہے'' کے الفاظ گونجنے لگے۔ یعنی یہ وہی گورا ہے جس نے پچھلے سال اس کی بے عزتی کی تھی۔ یہ وہی گورا ہے جس کے سامنے وہ بے بس تھا اور کچھ نہیں کر سکا تھا۔ آج وہ اس گورے کو جواب دینا چاہتا تھا۔ آج وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ ہندوستانی جاگ چکے ہیں، اب وہ انگریزوں سے نہیں ڈرتے۔ استاد منگو کی چوڑی چھاتی کے اندر جذبات کا ایک طوفان تھا۔ یہ دراصل استاد منگو کے اندر غلامی کی نفرت کی انتہا تھی۔ وہ ایک عام تانگے والا تھا مگر اس کے دل میں ایک باغی چھپا ہوا تھا۔ ایک معمولی شخص ہونے کے باوجود وہ خود کو ہندوستان کا نمائندہ سمجھ رہا تھا۔ نیا قانون نافذ ہو چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ اب وہ ایک غلام ہندوستانی نہیں رہا۔ وہ ایک آزاد ہندوستان کا شہری بن کر اس گورے کے سامنے کھڑا تھا۔ نئے قانون کی بدولت وہ اس گورے کو اپنی طاقت کا احساس دلا رہا تھا۔

عبارت نمبر 22

''وہی ہے۔'' اس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھا ہوا نشہ تھا۔ اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔ استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا۔ ''کہاں جانا مانگلا ہے؟''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کوچوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ اسے دنیا کے تمام معاملات کا علم تھا۔ ان معلومات کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی اور وہ ان سے آزادی چاہتا تھا۔ لہٰذا جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کی خبر سنتا ہے تو بے حد خوش ہو جاتا ہے۔ یکم اپریل کو وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔ چھاؤنی میں اسے ایک انگریز نظر آتا ہے، جسے دیکھ کر اس کے غصے اور نفرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ منگو اور انگریز کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ منگو اسے بُری طرح مارتا ہے۔ جس کی وجہ سے پولیس اسے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ وہ نیا قانون نیا قانون چلاتا رہتا ہے۔ لیکن قانون تو وہی پرانا تھا، اس لیے اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو انارکلی سے نکل کر مال روڈ پر آیا تو اسے چھاؤنی جانے والی ایک سواری مل گئی۔ اس نے سوچا کہ چھاؤنی میں نئے قانون کی وجہ سے ہونے والی تبدیلی ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لیے وہ کرایہ طے کر کے سواری کو لے کر چھاؤنی جا رہا تھا۔ وہ نئے قانون کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک گورے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ منگو کو انگریزوں سے نفرت تھی اس لیے اس نے گورے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے کا سوچا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس گورے سے زیادہ پیسے وصول کر کے اپنا مالی نقصان کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اس گورے کے پاس پہنچا اور بڑے طنزیہ انداز میں اس سے پوچھا ''صاحب بہادر، کہاں جانا مانگلا''؟ اس کے لہجے میں طنز اور انگریزوں کے لیے نفرت نظر آ رہی تھی۔ وہ تانگے سے اتر کر بڑے رعب سے گورے کے سامنے کھڑا ہوا۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو نے جب گورے کی طرف دیکھا تو اچانک اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا۔ اسے لگا کہ یہ چہرہ کہیں دیکھا ہوا ہے۔ اس کی شکل پہچان کر کسی پرانی یاد نے اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے اپنے منہ کے اندر ہی اندر الفاظ دہرائے ''وہی ہے''۔ اس پر حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی تھی۔ یہ وہی گورا تھا جس سے پچھلے سال اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ وہی بدتمیز، مغرور انگریز جس نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر اس کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔ اس وقت استاد منگو کچھ نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنی بے بسی کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

مانا کہ کسی ظلم کی حمایت نہیں کرتے ہم لوگ مگر کھل کے بغاوت نہیں کرتے
(عاصم واسطی)

اس لڑائی کا تصور کرتے ہی استاد منگو کا خون کھولنے لگا۔ اس گورے نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اس وقت استاد منگو کا جی چاہا تھا کہ اس گورے کو سبق سکھا کر اس کا دماغ درست کر دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا۔ وہ اس گورے کا منہ تو توڑ سکتا تھا لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس خاموشی کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت تھی اور قانون ان کے حق میں تھا۔ ایک ہندوستانی کی کسی انگریز کے خلاف شنوائی نہیں ہو سکتی تھی۔ استاد منگو نے کئی بار دیکھا تھا کہ جب کوئی گورا کسی ہندوستانی کے ساتھ بدتمیزی کرتا، مار پیٹ کرتا یا اس پر بے جا ظلم کرتا تھا تو قصوروار ہمیشہ ہندوستانی کو ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ اگر کوئی مقدمہ کسی عدالت میں جاتا تو وہاں بھی قانون ہمیشہ گورے کے حق میں جھکتا تھا۔ عدالت سے بھی کسی نہ کسی بہانے سزا ہمیشہ ہندوستانی کو ہی ملتی تھی۔ یہ کھلا ظلم تھا مگر کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ ظلم و ستم سہنے کی عادت بھی ہے ہم کو کچھ یہ ہے کہ دربار میں سنوائی بھی کم ہے
(ضیا ضمیر)

ایک اور شاعر کے بقول:

ظلم کرنے کی جو ظالم کو اجازت ہوگی جان لوگوں کی نہ ہرگز بھی سلامت ہوگی

انگریز ہندوستان میں حکومت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کی فلاح و بہبود کے کام کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ اسی طرح ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت بھی ان کی اولین ذمہ داری تھی۔ ان حقوق میں عدل و انصاف کا حصول پہلا حق تھا۔ لیکن انگریزوں نے

ہندوستان کے سادہ اور معصوم لوگوں کو ہمیشہ غلام بنا کر رکھا۔ ان کے بنیادی حقوق چھینے اور ان کو عدل و انصاف سے محروم رکھا۔ اسی لیے مقامی لوگ ان سے نفرت کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کا فرمان مبارک ہے:

"کفر کی حکومت چل سکتی ہے لیکن ظلم کی حکومت نہیں چل سکتی۔"

استاد منگو نے اپنی زندگی میں کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ کسی انگریز کے ظلم و ستم کے باوجود عدالت نے ہمیشہ غریب ہندوستانی کو مجرم قرار دے دیا۔ تانگے والوں کے ساتھ تو یہ ظلم اور بھی زیادہ ہوتا تھا۔ کسی کوچوان کی اگر کسی گورے سے معمولی سی بحث بھی ہو جاتی تو فوری طور پر پولیس آ جاتی اور کوچوان کو پکڑ کر تھانے لے جاتی تھی۔ اس لیے استاد منگو نے سیکھ لیا تھا کہ کسی گورے کے ساتھ الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ عدالت کا نزلہ ہمیشہ کوچوان پر ہی گرتا تھا، چاہے قصور کسی کا بھی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے سال استاد منگو نے اپنے دل میں طوفان اٹھنے کے باوجود خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے گورے کو کچھ کہا تو نقصان اسی کا ہوگا، سزا اسی کو ملے گی اور آخر میں اسی کو جھکنا پڑے گا۔

پچھلے سال کی لڑائی میں استاد منگو نے گورے کی بدتمیزی برداشت کر لی تھی لیکن آج کا دن اس کے لیے الگ تھا۔ آج یکم اپریل تھی اور نیا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ نئے قانون کے نفاذ سے انگریز کمزور ہو جائیں گے۔ اس لیے اب عدالت بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ یہ سوچ کر وہ پہلے سے زیادہ جوش میں آ گیا۔ اس نے گورے کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا:

"کہاں جانا مانگتا ہے" یہ جملہ دراصل صرف ایک سوال نہیں تھا بلکہ ایک جنگ کا آغاز تھا۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وقت بدل چکا ہے اور ہندوستان کے غریب اب کمزور اور غلام نہیں رہے۔ اس لیے اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس گورے کے سامنے جھکے گا نہیں اور اپنا بدلہ لے کر رہے گا۔

عبارت نمبر 23

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسا کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو ایک ایسے قانون کا خواہش مند ہے کہ جس سے اُسے انگریزوں سے چھٹکارا مل سکے۔ ایک دن وہ اپنی ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کے بارے میں سنتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ نہایت بے قراری سے یکم اپریل کا انتظار کرتا ہے۔ بالآخر یکم اپریل آ جاتی ہے۔ وہ نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے۔ لیکن اُسے نئے قانون کے آثار نظر نہیں آتے۔ وہ ایک سواری کو چھاؤنی لے کر جاتا ہے کہ شاید وہاں نئے قانون کا سراغ مل جائے۔ اس دوران میں اس کا ایک گورے سے جھگڑا ہو جاتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ پولیس منگو کو پکڑ کر تھانے لے جاتی ہے۔ وہ نیا قانون، نیا قانون چلاّتا رہتا ہے مگر اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے "نیا قانون" میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

استاد منگو ایک مضبوط جسم اور چوڑے سینے والا کوچوان تھا۔ وہ عام کوچوانوں کی طرح نہیں تھا بلکہ اپنے ذہن میں ہندوستان کی غلامی اور انگریزوں کے رویے کے بارے میں بہت کچھ سوچتا رہتا تھا۔ اس کے دل میں گوروں کے لیے شدید نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز ہندوستانیوں کو کمتر سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ پچھلے سال ایک انگریز کے ساتھ استاد منگو کی جھڑپ ہو گئی تھی مگر تب وہ مجبور تھا اس لیے خاموش رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں کے خلاف کچھ کرنا آسان نہیں کیوں کہ عدالت ہمیشہ گوروں کے حق میں فیصلہ دیتی تھی اور سزا ہمیشہ ہندوستانیوں کو ہی ملتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے سال جب نشے میں دھت ایک گورے نے اس کی بے عزتی کی تو وہ کچھ نہ کر سکا۔ مگر اب استاد منگو کو لگتا تھا کہ حالات بدل چکے تھے۔

یکم اپریل کا دن تھا اور استاد منگو نیا قانون دیکھنے کے لیے شہر میں گھوم رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ہر جگہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اسے کہیں کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی اس کے دل میں ایک امید تھی کہ حالات بدل چکے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ انگریزوں کا اقتدار ختم ہونے والا ہے اور ہندوستانی آزاد ہونے والے ہیں۔ اسی جوش و جذبے اور یقین کے ساتھ وہ اپنے تانگے میں ایک سواری کو بٹھا کر چھاؤنی کی طرف جا رہا تھا۔ اچانک ایک گورے نے اسے اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا۔ استاد منگو نے دیکھا کہ یہ وہی گورا تھا جس کے ساتھ پچھلے سال اس کی جھڑپ ہوئی تھی۔ گورے کو دیکھتے ہی استاد منگو کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ اس سے انتقام لینے کے لیے تیار ہو گیا۔

کوئی تم سا بھی کاش تم کو ملے مدعا ہم کو انتقام سے ہے
(میر تقی میر)

گورا ابھی استاد منگو کو پہچان چکا تھا۔ اس کا رویہ اب بھی تحقیر آمیز تھا۔ وہ استاد منگو کی چوڑی چھاتی اور طاقت کو نظر انداز کر رہا تھا کیوں کہ پچھلے سال اس نے دیکھا تھا کہ استاد منگو نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ گورے کو لگ رہا تھا کہ آج بھی وہ منگو کو آسانی سے دبا لے گا۔ یہی سوچ کر وہ اکڑ کر تانگے کی طرف بڑھا اور چھڑی سے استاد منگو کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے آپ کو آقا اور کوچوان کو غلام سمجھ رہا تھا۔ اس نے حقارت سے اپنی بید کی پتلی چھڑی دو تین مرتبہ استاد منگو کی ران کے ساتھ چھوئی۔

گورے کا یہ رویہ استاد منگو کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آج وہ پہلے والا منگو نہیں تھا جو خاموشی سے سب کچھ برداشت کر لیتا۔ اس نے اپنی موٹی ران پر چھڑی کا حقارت آمیز لمس محسوس کیا۔ یہ احساس اس کے اندر طوفان بن کر ابھرا۔ وہ لمحے کے لیے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس نے گورے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایسا غصہ تھا کہ جیسے وہ اپنی نگاہوں کے وزن سے ہی اس پست قد گورے کو کچل ڈالے گا۔ اس کی نظروں میں انگریزوں کے تکبر کا بدلہ لینے کی شدت تھی۔ چند لمحوں میں ہی اس نے گورے کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اچانک اس کا گھونسا کمان سے نکلے تیر کی طرح اوپر اٹھا اور سیدھا گورے کی ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ پھر استاد منگو نے فوراً اسے دھکا دے کر تانگے سے پیچھے ہٹا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے نیچے گرا کر دھڑا دھڑ اس پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ استاد منگو نے پوری طاقت سے گورے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اس انداز سے گورے کی پٹائی کر رہا تھا جیسے پورے انگریز راج پر حملہ کر کے ظلم کا بدلہ لے رہا ہو۔

استاد منگو کسی صورت غلامی کے طوق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب وہ اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ آج کا دن مختلف ہے کیوں کہ نیا قانون نافذ ہو چکا تھا۔ پہلے وہ عدالت، پولیس اور سزا کے

خوف سے کچھ نہیں کرسکتا تھا لیکن اب نئے قانون کی بدولت اسے کسی ناانصافی کا ندیشہ نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انگریز کمزور ہو چکے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں طاقت نہیں رہی۔ اب وہ ہندوستانیوں کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ اپنی حدود سے باہر نکل کر گورے کو بُری طرح پیٹ ڈالتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ میں چاہتا ہوں کہ اب جو بھی جی میں آئے کروں تجھے بھی میری اجازت ہے جو بھی خیال کر

(عرفان صدیقی)

ادھر گورے کو بھی اس حملے کی توقع نہیں تھی۔ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا کہ ایک ہندوستانی کوچوان جسے وہ کمتر سمجھتا ہے، اس پر اس طرح ہاتھ اٹھائے گا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر استاد منگو کی طاقت اور غصے کے سامنے وہ بے بس تھا۔ استاد منگو کے گھونسے، لاتیں اور دھکے مسلسل برس رہے تھے اور گورا کبھی ایک طرف گرتا، کبھی دوسری طرف۔ یہ منظر صرف استاد منگو اور اس گورے کے درمیان لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ ایک غلام ہندوستانی کی غیرت اور خودی کا اظہار تھا۔ یہ غلامی سے نفرت اور ظلم کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

(علامہ اقبالؒ)

عبارت نمبر 2.9

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا، ''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔۔۔ اب ہمارا راج ہے بچے''!

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ وہ دن گزر گئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں، نیا قانون!''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو جب ایک سواری سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنتا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ بے چینی سے یکم اپریل کا انتظار کرتا ہے۔ بالآخر یکم اپریل بھی آجاتی ہے۔ وہ صبح سویرے نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے۔ لیکن اس کو نئے قانون کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ وہ اس امید کے ساتھ سواری کو چھاؤنی لے کر جاتا ہے کہ شاید وہاں سے نئے قانون کی کوئی خبر مل جائے۔ چھاؤنی میں منگو کا جھگڑا ایک انگریز سے ہو جاتا ہے اور منگو اسے دھڑا دھڑ پیٹتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ انگریز کو مارنے کے جرم میں پولیس منگو کو گرفتار کر لیتی ہے۔ استاد منگو سارے راستے اور تھانے میں نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہتا ہے، لیکن قانون تو وہی پُرانا تھا اور اسے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو صبح سویرے نئے قانون سے آنے والی تبدیلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ گورنمنٹ کالج، انارکلی بازار اور مال روڈ سے گزرا، ہر طرف اسے وہی پرانے حالات نظر آئے۔ ہر جگہ لوگ اپنے معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس کا جوش ماند پڑنے لگا۔ منگو نے چھاؤنی پہنچ کر سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا تھا اور تانگے کی پچھلی نشست کے گدے پر اطمینان سے بیٹھ کر باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑے نے دھیمی چال چلنی شروع کی اور منگو کے ذہن میں بھی نئے قانون کے متعلق آہستہ آہستہ خیالات داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اسے سڑک کے کنارے ایک گورا نظر آیا جو اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا تھا۔ استاد منگو اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ یہ وہی گورا تھا جس کے ساتھ اس کی پچھلے سال لڑائی ہو چکی تھی۔

پچھلے سال جب استاد منگو کی اس گورے سے جھڑپ ہوئی تھی تو منگو مصلحت کے تحت خاموش ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی گورے کے ساتھ لڑائی میں عدالت ہمیشہ کوچوان کو مجرم قرار دے کر سزا دیتی ہے۔ مگر آج یکم اپریل تھی۔ نیا قانون نافذ ہو چکا تھا اس لیے وہ خود کو آزاد سمجھ رہا تھا۔ اب وہ اس گورے کو سبق سکھا سکتا تھا۔ گورے نے آج پھر اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی تھی اور دو تین بار اپنی چھڑی سے اس کی ران کو چھوا تھا۔ استاد منگو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ گورا اسے پہلے کی طرح دبانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ جھکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

گورے نے اسے تانگے سے نیچے اترنے کو کہا۔ استاد منگو کی آنکھوں میں شدید غصہ تھا۔ اس نے گورے کی طرف دیکھا جیسے وہ اپنی آنکھوں سے ہی اسے پیس ڈالے گا۔ اچانک اس کا گھونسا اٹھا اور گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جا لگا۔ گورا سنبھل نہ سکا اور دھڑام سے نیچے گر گیا۔ استاد منگو نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے گورے پر خوب لاتیں اور گھونسے برسائے۔ وہ برسوں کی غلامی اور ذلت کا بدلہ لے رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہی چل رہا تھا کہ اب نیا قانون آچکا ہے اور وہ انگریزوں سے ظلم کا بدلہ لے سکتا ہے۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا:

''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں! پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں! اب ہمارا راج ہے!'' یہ الفاظ اس کے جذبات کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں نئے قانون کے آنے سے انگریزوں کی اکڑفوں نکل چکی ہے اور وہ اپنا سر پیٹ پیٹ کہہ رہے ہوں گے۔

؎ ایک صاحب کہتے تھے سر پیٹ یوں نکل گئی مائی لارڈ ساری اکڑفوں

؎ وہ بھی زمانہ تھا کہ دنیا میں دھاک تھی شہرت ہماری دنیا میں شہرہ آفاق تھی

گورے نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر استاد منگو دیوانہ وار اسے پیٹ رہا تھا۔ گورا چلّانے لگا اور مدد کے لیے پکارنے لگا۔ استاد منگو کے جوش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ گورے کی چیخ پکار سن کر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ جلد ہی پولیس کے دو سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے بڑی مشکل سے استاد منگو کو گورے سے الگ کیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کی چھاتی زور زور سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ غصے کی شدت سے اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک فاتحانہ چمک تھی۔ مجمع بھی اس کی جرأت پر حیران تھا۔ اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ بلند آواز میں کہنے لگا: ''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں، نیا قانون!''

جوش اور غصے سے وہ ہانپ رہا تھا۔ لوگ حیران تھے اور منگو ایک فاتح کی طرح کھڑا تھا۔ گورا ابھی استاد منگو کی دیوانگی پر حیران تھا۔ اسے ''پہلی اپریل'' اور ''نیا قانون'' کی کوئی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ منگو کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ ایک کوچوان سے بُری طرح پٹ چکا تھا اور شدید پریشان تھا۔ گورے کو کسی کوچوان کے اس طرح کے رویے کی توقع بھی نہیں تھی۔ گورے اور لوگوں کو منگو کی باتوں کا کوئی مفہوم سمجھ نہیں آرہا تھا۔ لیکن منگو نئے قانون کے نفاذ پر خوش تھا اور خود کو آزاد سمجھ رہا تھا۔

منگو یقین کر چکا تھا کہ اب ہندوستانی آزاد ہو چکے ہیں اور گورے کمزور ہو گئے ہیں۔ اس نے اسی خوش فہمی میں گورے سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔ جس قانون کو وہ اپنی آزادی سمجھ رہا تھا وہ دراصل اس کے لیے ایک نئی مصیبت بننے والا تھا۔ اسے ابھی اپنی کم علمی اور خوش فہمی کی قیمت چکانی پڑنی تھی۔

؎ قانون جیسے کھوچکا صدیوں کا اعتماد اب کون دیکھتا ہے خطا کارخ کدھر
(حضرت گوالیاری)

منگو کے جذبات ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انگریزوں کا رویہ عام ہندوستانیوں کے ساتھ بہت بُرا تھا۔ اس لیے وہ ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان سے اپنی تحقیر کا بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ''نیا قانون'' ان کے لیے ایک امید کی روشنی تھا لیکن وہ ایسا نہیں تھا جیسا وہ سمجھتے تھے۔ نیا قانون ہندوستانیوں کو ان کے حقوق دینے کے لیے نہیں بلکہ ان پر انگریزوں کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

؎ ظلم کرنے کی جو ظالم کو اجازت ہوگی جان لوگوں کی نہ ہرگز بھی سلامت ہوگی

عبارت نمبر 25

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں۔ نیا قانون!
اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔ استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ نیا قانون، نیا قانون چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ ''نیا قانون، نیا قانون! کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی ہے پرانا!'' اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ منگو کوچوان ان پڑھ ہونے کے باوجود اپنے اڈے میں سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ کیوں کہ اسے دنیا کے تمام معاملات کا علم تھا۔ اس کے علم کا واحد ذریعہ اس کی سواریاں تھیں۔ منگو کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی اس لیے وہ ان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ لہٰذا جب وہ اپنی سواریوں سے نئے قانون کا سنتا ہے تو بے حد خوش ہو جاتا ہے۔ یکم اپریل کو نیا قانون دیکھنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا ہے۔ لیکن سب کچھ پرانا ہوتا ہے۔ چھاؤنی میں اس کی لڑائی ایک انگریز سے ہو جاتی ہے اور منگو اسے بُری طرح مارتا ہے۔ پولیس کے سپاہی انگریز کو بہت مشکل سے منگو کی گرفت سے چھڑاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے۔ لہٰذا اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

سعادت حسن منٹو اردو کے عظیم افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے سماجی سچائیوں کو جرأت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر سادہ مگر اثر انگیز ہے۔ ان کے افسانے ''نیا قانون'' میں استحصالی نظام پر گہری طنز ہے۔ اس کہانی میں استاد منگو کا کردار انگریز راج کے خلاف ایک عام ہندوستانی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ استاد منگو اپنے تانگے پر ایک سواری بٹھا کر چھاؤنی کی طرف جا رہا تھا۔ سڑک پر ایک گورے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ منگو اس کے قریب گیا تو دیکھا کہ اس گورے سے پچھلے سال اس کی جھڑپ ہو چکی تھی۔ منگو نے اس کے ساتھ طنزیہ انداز میں بات کی۔ اس کے دل میں دبی ہوئی نفرت ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔ وہ پہلے اسے نظر انداز کرنا چاہتا تھا مگر پھر اسے یاد آیا کہ نئے قانون کے تحت اب انگریزوں کی وہ حیثیت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ استاد منگو کا طنزیہ انداز دیکھ کر گورے نے بھی اسے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی چھڑی سے منگو کی ران کو چھو کر تانگے سے نیچے اترنے کو کہا۔ اس پر منگو کا غصہ بے قابو ہو گیا۔ وہ برسوں کی غلامی اور ذلت کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے گورے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ پٹائی کے ساتھ وہ مسلسل کہہ رہا تھا: پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں! پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں! اب ہمارا راج ہے بچہ!'' وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ نیا قانون آ چکا ہے۔ اس قانون کے تحت وہ انگریزوں کے خلاف کھل کر اپنی نفرت کا اظہار کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک بہت بڑی خوش فہمی کا شکار تھا۔

؎ میں چاہتا ہوں کہ اب جو بھی جی میں آئے کروں تجھے بھی میری اجازت ہے جو بھی خیال کر
(عرفان صدیقی)

جب منگو نے اس کی پٹائی کی تو گورے نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں سے مدد طلب کر رہا تھا۔ جلد ہی لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ پولیس کے دو سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے بڑی مشکل سے منگو کو گورے سے الگ کیا۔ منگو اب بھی غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کر دیا تھا اور خود کو فاتح سمجھ رہا تھا۔ پولیس نے اسے قابو میں کر لیا لیکن وہ خوشی اور جوش سے ہانپتی آواز میں کہہ رہا تھا: ''وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں، نیا قانون!'' اسے یقین تھا کہ انگریزوں کا دور ختم ہو چکا ہے اور اب ہندوستانیوں کو انصاف ملے گا۔

؎ خنجر ظلم کا ظالم چلا لے اور تھوڑے دن غریبوں، بے گناہوں کو ستا لے اور تھوڑے دن

گورے کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے اس کی بالکل توقع نہیں تھی۔ پچھلے سال جب اس کی منگو کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی تو اس نے منگو کی خوب بے عزتی کی تھی۔ اس وقت گورا نشے میں دھت تھا۔ منگو اس کی حالت اور قانون کی گرفت سے خوف زدہ تھا۔ اس لیے اس نے گورے کی تحقیر آمیز باتوں کو خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔ اس وقت اسے یہ خوف تھا کہ اگر گورے کو کچھ کہا تو معاملہ زیادہ بگڑ جائے گا۔ پولیس اور عدالت گوروں کا ساتھ دیتی تھی اور غریب کو چوانوں کو سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب نیا قانون نافذ ہو چکا تھا اور گورے کسی کوچوان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ نئے قانون کی وجہ سے اسے پولیس اور عدالت سے بھی انصاف کی توقع تھی۔ اس لیے وہ بار بار ''نیا قانون ہے میاں، نیا قانون'' کہہ رہا تھا۔ گورا منگو کی باتوں اور رویے کو بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ بے چارہ اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی طرح کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا اور کبھی ہجوم کی طرف۔ وہ اپنی توہین پر شرمندہ بھی تھا اور حیران بھی۔ پولیس کے سپاہیوں نے استاد منگو کو گرفتار کر لیا اور تھانے لے جانے لگے۔ وہ راستے میں بھی مسلسل ''نیا قانون! نیا قانون'' پکارتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ بے قصور ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ نئے قانون کے مطابق سب کو برابری کے حقوق ملیں گے اور پولیس گورے کو بھی گرفتار کر کے تفتیش میں شامل کرے گی۔ لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی جو زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔

؎ ہم کو آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسکؔ جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے
(ناسکؔ)

تھانے پہنچ کر سپاہیوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: ''نیا قانون، نیا قانون'' کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی ہے پرانا!'' یہ جملہ استاد منگو کے لیے ایک بجلی کے جھٹکے سے کم نہ تھا۔ اس نے جو خواب دیکھے تھے وہ ایک لمحے میں چکنا چور ہو گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ شہر میں کوئی تبدیلی کیوں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کی ساری امیدیں غلط فہمی پر مبنی تھیں۔ جس قانون سے اسے اتنی بڑی توقعات تھیں وہ حقیقت میں کچھ نہیں تھا۔ پرانے قانون کے تحت ہی اسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا اور دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ استاد منگو جو کچھ دیر پہلے تک خود کو فاتح سمجھ رہا تھا، اب قیدی بن چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نئے قانون کے مطابق اسے انصاف ملے گا مگر اسے پرانے قانون کے تحت ہی سزا مل گئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قانون نیا ہو یا پرانا، ہمیشہ کمزور کے خلاف ہی استعمال ہوتا ہے۔

استاد منگو کا انجام اس بات کی علامت ہے کہ غلامی کی زنجیریں آسانی سے نہیں ٹوٹتیں۔ حقیقی آزادی صرف قانون بدلنے سے نہیں آتی، اس کے لیے پورا نظام بدلنا پڑتا ہے۔

مشقی سوالات

سوال نمبر:۱۔ مختصر جواب دیں۔

الف۔ استاد منگو کی کیا انفرادیت تھی؟

جواب۔ استاد منگو کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ نئی خبروں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اسے جب کوئی نئی خبر مل جاتی تو اسے اپنے دوستوں کے سامنے ایسے بیان کرتا کہ سب پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی۔

ب۔ ’’یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا‘‘ یہ بات کس نے کس سے کہی؟ جواب۔ یہ بات استاد منگو نے کہی۔

ج۔ استاد منگو کو انگریزوں سے نفرت کیوں تھی؟

جواب۔ استاد منگو کو انگریزوں سے نفرت اس لیے تھی کہ وہ انھیں ظالم اور دھوکے باز سمجھتا تھا۔ وہ زبردستی ہندوستان پر قابض تھے اور مقامی لوگوں پر رعب ڈالتے تھے۔

د۔ ’’آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔‘‘ متن کے مطابق منگو نے یہ باتیں کس تناظر میں کیں؟

جواب۔ ’’آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔‘‘ متن کے مطابق منگو نے یہ باتیں انگریزوں کی اکڑ اور غرور کی وجہ سے کہیں۔ اسے انگریزوں سے سخت نفرت تھی کیوں کہ وہ اس سے ہتک آمیز رویہ رکھتے تھے۔

ہ۔ استاد منگو نئے قانون کے بارے میں کیا سوچ رکھتا تھا؟

جواب۔ استاد منگو نئے قانون کے بارے میں یہ خیال کرتا تھا کہ اس کے آنے سے سب کچھ بدل جائے گا۔ ہر طرف آزادی اور خود مختاری ہوگی۔ انگریز کسی مقامی شخص پر رعب نہ ڈال سکیں گے۔

و۔ استاد منگو کے نزدیک بڑے لیڈر کا کیا معیار تھا؟

جواب۔ استاد منگو کے نزدیک بڑے لیڈر کا معیار یہ تھا کہ اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ لوگ ہوں اور اس کے گلے میں زیادہ سے زیادہ پھولوں کے ہار ہوں۔

سوال نمبر:۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ **استاد منگو نے کس ملک کی لڑائی کی پیشین گوئی کی؟**
الف۔ اسپین   ب۔ برطانیہ   ج۔ فرانس   د۔ روس

۲۔ **’’نیا قانون‘‘ اصنافِ ادب کے لحاظ سے ہے۔**
الف۔ ناول   ب۔ ڈراما   ج۔ داستان   د۔ افسانہ

۳۔ **دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔**
الف۔ انگریز   ب۔ مارواڑی   ج۔ کوچوان   د۔ بنگالی

۴۔ **کس کی گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بڑھادی۔**
الف۔ انگریز کی   ب۔ ایک کوچوان کی   ج۔ طلبہ کی   د۔ بیرسٹر کی

۵۔ **منگو نے چودھری خدا بخش سے خریدا تھا:**
الف۔ گھوڑا   ب۔ ساز   ج۔ کاٹھی   د۔ پائے دان

جوابات

۱	اسپین	۲	افسانہ	۳	مارواڑی	۴	طلبہ کی	۵	ساز

سوال نمبر:۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ استاد منگو کو............ سے بڑی نفرت تھی۔

۲۔ ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور............ کو آزادی مل جائے گی۔

۳۔ کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں............ کی تحریک جاری تھی۔

۴۔ اس گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید............ کی اہمیت اور بھی بڑھادی۔

۵۔ گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر............ کر چکا تھا۔

جوابات

۱	انگریزوں	۲	ہندوستانیوں	۳	سرخ پوشوں	۴	آئین	۵	انداز		

سوال نمبر:۴۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

جس طرح پوری کائنات کا نظام قانونِ قدرت کے تحت چل رہا ہے مثلاً: سورج اور چاند ستاروں کا طلوع و غروب، موسموں کا تغیر و تبدل فصلوں کا پکنا وغیرہ سب ایک قانون کے تابع ہیں، اسی طرح معاشرے کی فلاح و بہبود، امن و امان اور ترقی و خوش حالی کے لیے بھی انسانوں نے قوانین ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے معاشرے کے افراد کو بھی راحت ملتی ہے اور معاشرہ بھی مہذب بن جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں افراتفری، بدامنی اور بے سکونی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے افراد قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب قانون شکن گرفت میں آتے ہیں تو ایک طرف ان کی ذاتی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہوتی ہے تو دوسری طرف اس سے منسلک افراد اور معاشرہ بھی اپنا وقار کھونے لگتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قانون کی گرفت میں آنے کے خوف سے اس پر عمل کریں، ہمیں چاہیے کہ سماجی قدروں کو فروغ دیتے ہوئے دل سے قانونی تقاضوں کا احساس کریں اور ایک مہذب معاشرہ تشکیل دیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی نسبت ہمارے ملک میں شرح خواندگی بہت کم ہے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ قوانین پر عمل کرنے کا شعور نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے اردگرد جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں بے ضابطگیاں نظر آتی ہیں وہاں بدقسمتی سے ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنے کے شعور کے فقدان کا بھی سامنا ہے۔ قانونی پیچیدگیوں سے قطع نظر، اگر ہم اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو ٹریفک قوانین کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے۔ انھیں نظر انداز کرنے سے معاشرتی صورت حال بگڑنے کے علاوہ قیمتی جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں۔ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی روکنے کے لیے نہ صرف ٹریفک پولیس ذمہ داری کا مظاہرہ کرے بلکہ عوام الناس میں بھی احساسِ ذمہ داری پیدا ہونا چاہیے۔

سوالات:

۱۔ **عبارت کے مطابق قانونِ قدرت کی کیا مثالیں ہیں؟**

جواب۔ عبارت کے مطابق سورج اور چاند ستاروں کا طلوع و غروب، موسموں کا تغیر و تبدل اور فصلوں کا پکنا وغیرہ قانونِ قدرت کی مثالیں ہیں۔

۲۔ **معاشرہ مہذب کیسے بنتا ہے؟**

جواب۔ معاشرہ قانون کی پاسداری سے مہذب بنتا ہے۔

۳۔ **ٹریفک قوانین کو نظر انداز کرنے کے کیا نقصان ہیں؟**

جواب۔ ٹریفک قوانین کو نظر انداز کرنے سے معاشرتی صورت حال بگڑتی ہے اور قیمتی جانوں کا نقصان ہوتا ہے۔

۴۔ **ہمارے معاشرے میں لوگ قوانین پر عمل کرنے کا شعور کیوں نہیں رکھتے؟**

جواب۔ ہمارے معاشرے میں لوگ قوانین پر عمل کرنے کا شعور نہیں رکھتے کیوں کہ ہمارے ہاں تعلیم کی کمی ہے۔

۵۔ **اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔**

جواب۔ مہذب معاشرے کا قیام

زبان شناسی

سوال نمبر:۵۔ واحد جمع اور تذکیر و تانیث کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جملوں کو درست کر کے لکھیں۔

غلط جملے	درست جملے
یہاں ہر امراض کا علاج ہوتا ہے۔	یہاں ہر مرض کا علاج ہوتا ہے۔
اسے ابھی تک ہوش نہیں آئی۔	اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا۔
میں نے ہر ممالک کی سیر کی ہے۔	میں نے ہر ملک کی سیر کی ہے۔

لوگ گہری غاروں میں رہتے تھے۔	لوگ گہرے غاروں میں رہتے تھے۔
فٹ بال میری پسندیدہ کھیل ہے۔	فٹ بال میرا پسندیدہ کھیل ہے۔
رات میں نے ایک خواب دیکھی۔	رات میں نے ایک خواب دیکھا۔
میری قلم کہاں ہے؟	میرا قلم کہاں ہے؟
رابعہ یہ بات سن کر بکی بکی رہ گئی۔	رابعہ یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گئی۔

سوال نمبر:۶۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں۔
عقل، حیثیت، اعتراف، نشست، مصلحت

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
عقل	عَقْل	حیثیت	حَیْثِیَّت	اعتراف	اِعْتِرَاف	نشست	نِشَسْت
مصلحت	مَصْلَحَت						

سوال نمبر:۷۔ درج ذیل ضرب الامثال کو درست کر کے لکھیں۔

غلط فقرے	درست ضرب الامثال
ایک انار ہزار بیمار	ایک انار سو بیمار
پانی دیکھو، پانی کی دھار دیکھو	تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو
دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ باہر کا	دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا
جس کی لاٹھی اس کی گائے	جس کی لاٹھی اس کی بھینس
بچہ گود میں ڈھنڈورا شہر میں	بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں
دودھ کا جلا لسی بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے	دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔
ناچ نہ جانے پاؤں ٹیڑھا	ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا
آسمان سے گرا جا من میں انکا	آسمان سے گرا کھجور میں انکا
گیہوں کے ساتھ جو بھی پس جاتا ہے	گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔
نہ دس من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی	نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

سوال نمبر:۸۔ سبق "نیا قانون" کا خلاصہ تحریر کریں۔ جواب۔ دیکھیے سبق کا خلاصہ

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

درست جواب کا انتخاب کریں۔

(1) سعادت حسن منٹو پیدا ہوئے:
(الف) 1910ء (ب) 1911ء (ج) 1912ء (د) 1913ء (ج)

(2) سعادت حسن منٹو فوت ہوئے:
(الف) 1954ء (ب) 1955ء (ج) 1956ء (د) 1957ء (ب)

(3) سعادت حسن منٹو پیدا ہوئے:
(الف) بارہ مولا (کشمیر) (ب) علی پور (بنارس) (ج) جے پور (ٹونک) (د) سمبرالا (لدھیانہ) (د)

(4) منٹو کے والد کا نام تھا:
(الف) خواجہ غلام نبی (ب) خواجہ غلام محمد (ج) خواجہ غلام حسین (د) خواجہ غلام علی (ج)

(5) منٹو نے ابتدائی تعلیم حاصل کی:
(الف) گھر سے (ب) مسجد مکتب سکول سے (ج) مدرسے سے (د) مشن سکول سے (الف)

(6) منٹو کا تعلیم کا ریکارڈ تھا:
(الف) بہت اچھا (ب) بُرا (ج) معمولی (د) شان دار (ب)

(7) منٹو اکثر فیل ہوتے تھے:
(الف) فارسی (ب) ریاضی (ج) انگریزی (د) اردو (د)

(8) منٹو کو زمانہ طالب علمی ہی سے دل چسپی تھی:
(الف) شاعری سے (ب) ادب سے (ج) سیاست سے (د) کرکٹ سے (ب)

(9) منٹو نے ادبی زندگی کا آغاز کیا:
(الف) ڈراما سے (ب) ناول سے (ج) افسانہ سے (د) تراجم سے (د)

(10) منٹو کہانیاں لکھ کر پیسے کماتے رہے:
(الف) اخبار سے (ب) ریڈیو سے (ج) ریڈیو اور فلم سے (د) اسٹیج تھیٹر سے (ج)

(11) منٹو قیامِ پاکستان کے بعد بمبئی سے گئے:
(الف) لاہور (ب) اسلام آباد (ج) کراچی (د) سرگودھا (الف)

(12) منٹو اردو ادب کے ادیب ہیں:
(الف) پسندیدہ (ب) مقبولِ عام (ج) متنازع (د) مسترد (ج)

(13) نقاد منٹو کو ادیب کہتے ہیں:
(الف) ترقی پسند (ب) رومانویت پسند (ج) مقصدیت پسند (د) شدت پسند (الف)

(14) آتش پارے، دھواں، لذتِ سنگ اور چغد تصانیف ہیں:
(الف) اشفاق احمد (ب) غلام عباس (ج) احمد ندیم قاسمی (د) سعادت حسن منٹو (د)

(15) ٹھنڈا گوشت، یزید، نمرود کی خدائی اور بادشاہت کا خاتمہ کس کی تصانیف ہیں؟
(الف) ممتاز شیریں (ب) عصمت چغتائی (ج) سعادت حسن منٹو (د) شوکت صدیقی (ج)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ منگو تھا:
(الف) کسان (ب) مزدور (ج) کوچوان (د) ریڑھی بان (ج)

2۔ منگو اپنے اڈے میں سمجھا جاتا تھا:
(الف) امانت دار (ب) تعلیم یافتہ (ج) بے وقوف (د) عقل مند (د)

3۔ منگو کی تعلیم تھی:
(الف) پرائمری (ب) صفر کے برابر (ج) مڈل (د) میٹرک (ب)

4۔ اس نے کبھی منہ نہیں دیکھا تھا:
(الف) سکول کا (ب) کالج کا (ج) یونی ورسٹی کا (د) مدرسے کا (الف)

5۔ منگو کو علم تھا:
(الف) دنیا بھر کی چیزوں کا (ب) اپنے گھر کی چیزوں کا (ج) شہر بھر کی چیزوں کا (د) محلہ بھر کی چیزوں کا (الف)

6۔ اڈے کے تمام کوچوان استاد منگو کی وسیع معلومات سے تھے:
(الف) ناواقف (ب) واقف (ج) حاسد (د) متنفر (ب)

7۔ استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی:
(الف) جاپان میں (ب) چین میں (ج) فرانس میں (د) اسپین میں (د)

8- استاد منگو نے جنگ چھڑ جانے کی پیش گوئی سے کی تھی:
(الف) گاما چودھری سے (ب) رامو چودھری سے (ج) کرمو چودھری سے (د) دینو چودھری سے (الف)

9- استاد منگو نے اسپین کے بارے میں بتایا کہ وہ ہے:
(الف) افریقہ میں (ب) ایشیا میں (ج) ولایت میں (د) امریکہ میں (ج)

10- مال روڈ پر تانگہ چلاتے ہوئے استاد منگو کسی سواری سے تبادلہ خیال کر رہا تھا:
(الف) ہندو سکھ فساد پر (ب) ہندو مسلم فساد پر (ج) ہندو انگریز فساد پر (د) انگریز مسلم فساد پر (ب)

11- استاد منگو کو نفرت تھی:
(الف) امریکیوں سے (ب) جاپانیوں سے (ج) روسیوں سے (د) انگریزوں سے (د)

12- انگریز ہندوستان پر اپنا چلاتے ہیں:
(الف) سکہ (ب) حکم (ج) راج (د) قانون (الف)

13- انگریز استاد منگو کے ساتھ سلوک کرتے تھے، گویا وہ ہے:
(الف) ذلیل بندر (ب) ذلیل کتا (ج) ذلیل ریچھ (د) ذلیل گھوڑا (ب)

14- استاد منگو جب بھی گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے آ جاتی:
(الف) کھانسی (ب) قے (ج) چھینک (د) متلی (د)

15- جب شرابی گورے سے منگو کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت رہتی:
(الف) اداس (ب) مکدّر (ج) بے چین (د) نڈھال (ب)

16- منگو کہتا ہے کہ انگریز یوں رعب گانٹھتے ہیں کہ گویا ہم نوکر ہیں ان کے:
(الف) باوا کے (ب) تایا کے (ج) باپ کے (د) دادا کے (الف)

17- جب تک منگو کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا، وہ اپنے سینے کی آگ:
(الف) پھینکتا رہتا (ب) نکالتا رہتا (ج) اُگلتا رہتا (د) بہاتا رہتا (ج)

18- منگو اپنے ساتھی سے کہتا ہے کہ تم انگریز کی شکل دیکھتے ہونا، لگتا ہے جیسے اس کو ہو رہا ہے:
(الف) بخار (ب) کوڑھ (ج) کورونا (د) ڈینگی بخار (ب)

19- استاد منگو اپنی ناک خاکی قمیص سے صاف کرنے کے بعد پھر:
(الف) پینے لگ جاتا ہے (ب) رونے لگ جاتا ہے (ج) بڑبڑانے لگ جاتا ہے (د) کھانے لگ جاتا ہے (ج)

20- ایک روز استاد منگو نے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں:
(الف) چھاؤنی سے (ب) کچہری سے (ج) انارکلی سے (د) مال روڈ سے (ب)

21- جب استاد منگو نے سواریوں سے نئے قانون کے نفاذ کی خبر سنی تو وہ:
(الف) اداس ہو گیا (ب) ناراض ہو گیا (ج) پریشان ہو گیا (د) خوش ہو گیا (د)

22- مارواڑیوں نے نئے قانون کے نفاذ کی تاریخ بتائی:
(الف) یکم اپریل (ب) دو اپریل (ج) تین اپریل (د) چار اپریل (الف)

23- استاد منگو گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے پیار سے کہتا ہے کہ ذرا ہوا سے کر کے دکھا دے:
(الف) مقابلہ (ب) باتیں (ج) آمنا سامنا (د) دوڑ (ب)

24- مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر استاد منگو نے انارکلی میں لسی پی:
(الف) کرمو حلوائی کی دکان پر (ب) گاما حلوائی کی دکان پر (ج) فیکا حلوائی کی دکان پر (د) دینو حلوائی کی دکان پر (د)

25- شام کو جب استاد منگو اڈے کو لوٹا تو وہ اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا:
(الف) خوش خبری (ب) بڑی خبر (ج) بُری خبر (د) داستان (ب)

26- استاد منگو اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا:
(الف) آدھ گھنٹے تک (ب) ایک گھنٹے تک (ج) دو گھنٹے تک (د) تین گھنٹے تک (الف)

27- کس قانون کی خبر نے استاد منگو کو نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا:
(الف) موجودہ قانون نے (ب) سابقہ قانون نے (ج) نئے قانون نے (د) پُرانے قانون نے (ج)

28- استاد منگو گوروں کو پکارتا تھا:
(الف) سفید بلیوں کے نام سے (ب) سفید چوہوں کے نام سے
(ج) بھورے بندروں کے نام سے (د) سیاہ ریچھوں کے نام سے (ب)

29- استاد منگو نتھو گنجے کو کس ملک کے بادشاہ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا:
(الف) امریکہ (ب) چین (ج) افغانستان (د) روس (د)

30- پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں، وہ انھیں کس بادشاہ کے اثر کا نتیجہ سمجھتا ہے؟
(الف) افغانستان والے بادشاہ (ب) ترکی والے بادشاہ (ج) روس والے بادشاہ (د) ایران والے بادشاہ (ج)

31- پشاور اور دیگر شہروں میں جاری تھی:
(الف) فراغتی تحریک (ب) سُرخ پوشوں کی تحریک (ج) ریشمی رومال تحریک (د) آزادیٔ ہند کی تحریک (ب)

32- استاد منگو تمام واقعات کو نئے قانون کا سمجھتا تھا:
(الف) نتیجہ (ب) اثر (ج) ثمر (د) پیش خیمہ (د)

33- استاد منگو نے کئی مرتبہ بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا:
(الف) ٹوڈی بچے (ب) فراڈی بچے (ج) دوغلے بچے (د) ٹیڈی بچے (الف)

34- استاد منگو گورنمنٹ کالج کے کتنے طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ لے جا رہا تھا:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (ب)

35- گورنمنٹ کالج کے طلبہ کی گفت گو نے استاد منگو کے دل میں اہمیت بڑھا دی:
(الف) پُرانے آئین کی (ب) موجودہ آئین کی (ج) جدید آئین کی (د) قدیم دستور کی (ج)

36- استاد منگو سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ ہو جائے گا:
(الف) واضح (ب) عیاں (ج) پوشیدہ (د) صاف (د)

37- پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور گیا:
(الف) کمرے میں (ب) اصطبل میں (ج) باورچی خانے میں (د) غسل خانے میں (ب)

38- استاد منگو نے پہلی اپریل کے سرد دُھندلکے میں چکر لگایا:
(الف) کئی بازاروں کا (ب) کئی دکانوں کا (ج) کئی سڑکوں کا (د) کئی منڈیوں کا (الف)

39- رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی:
(الف) چھتری (ب) تصویر (ج) کلغی (د) پینٹنگ (ج)

40- استاد منگو نے نئے قانون کی خوشی میں کلغی کب لی تھی؟
(الف) یکم مارچ کو (ب) 31۔مارچ کو (ج) یکم مئی کو (د) یکم جون کو (ب)

41- استاد منگو نے نئی کلغی کس سے لی تھی؟
(الف) چودھری اللہ بخش سے (ب) چودھری محمد حسین سے (ج) چودھری اللہ داد سے (د) چودھری خدا بخش سے (د)

42- استاد منگو نے کلغی کتنے کی لی تھی؟
(الف) ساڑھے آٹھ آنے کی (ب) ساڑھے دس آنے کی (ج) ساڑھے چودہ آنے کی (د) ساڑھے پندرہ آنے کی (ج)

43- استاد منگو کے بقول ہائی کورٹ میں صبح کتنے بجے کے بعد کام شروع ہوتا ہے؟
(الف) سات بجے کے بعد (ب) آٹھ بجے کے بعد (ج) نو بجے کے بعد (د) دس بجے کے بعد (ج)

44- جب استاد منگو کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے بجائے:
(الف) آٹھ (ب) نو (ج) دس (د) گیارہ (ب)

45- گورنمنٹ کالج کے جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے، وہ تھے:
(الف) خوش باش (ب) خوش حال (ج) مَیلے مَیلے (د) خوش پوش (د)

46- کالج کے طلبہ خوش پوش ہونے کے باوجود بھی استاد منگو کو نظر آ رہے تھے:
(الف) خستہ حال (ب) اداس (ج) مَیلے مَیلے (د) پریشان (ج)

47۔ استاد منگو تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر تھوڑی دیر کے بعد تھا:
(الف) انارکلی میں (ب) مال روڈ پر (ج) صدر بازار میں (د) اُردو بازار میں (الف)

48۔ استاد منگو جب انارکلی میں پہنچا تو کتنی دکانیں کھل چکی تھیں؟
(الف) چوتھائی (ب) پچھتر فی صد (ج) ساری (د) آدھی (د)

49۔ استاد منگو مال روڈ پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اُسے سواری مل گئی:
(الف) انارکلی کی (ب) چھاؤنی کی (ج) چوبرجی کی (د) مزنگ کی (ب)

50۔ گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد تھی:
(الف) سست (ب) تیز (ج) مدھم (د) دھیمی (الف)

51۔ جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا، اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے داخل ہو رہے تھے:
(الف) خیالات (ب) اشارات (ج) قیاسات (د) احساسات (ج)

52۔ جب استاد منگو نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے پیدا ہو گئے:
(الف) محسوسات (ب) خیالات (ج) قیاسات (د) جذبات (د)

53۔ استاد منگو کو خیال آیا کہ گوروں کے پیسے چھوڑنا بھی:
(الف) عقل مندی ہے (ب) بے وقوفی ہے (ج) چالاکی ہے (د) نادانی ہے (ب)

54۔ استاد منگو کا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر کی آگ میں اس نے اس ''گورے'' کو جلا کر کر ڈالا تھا:
(الف) ختم (ب) نیست و نابود (ج) بھسم (د) مردہ (ج)

55۔ استاد منگو کو پورا یقین ہو گیا کہ یہ گورا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی ہوئی تھی:
(الف) لڑائی (ب) تکرار (ج) گفت گو (د) جھڑپ (د)

56۔ استاد منگو کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر گرتا ہے:
(الف) کسانوں پر (ب) کوچوانوں پر (ج) مزدوروں پر (د) تاجروں پر (ب)

57۔ استاد منگو نے گورے سے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو گورے نے جواب دیا:
(الف) سبزی منڈی (ب) غلہ منڈی (ج) گوال منڈی (د) نمکسالی منڈی (د)

58۔ استاد منگو نے گورے سے کرایہ مانگا:
(الف) دو روپے (ب) تین روپے (ج) پانچ روپے (د) سات روپے (ج)

59۔ استاد منگو گورے کو جی بھر کر:
(الف) گالیاں دے رہا تھا (ب) پیٹ رہا تھا (ج) برا بھلا کہہ رہا تھا (د) کوس رہا تھا (ب)

60۔ پولیس کے کتنے سپاہیوں نے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا:
(الف) دو (ب) تین (ج) چار (د) پانچ (الف)

61۔ استاد منگو کے منہ سے بہہ رہا تھا:
(الف) پانی (ب) لعاب (ج) جھاگ (د) شربت (ج)

62۔ استاد منگو گورے سے کہتا ہے: وہ دن گئے جب خلیل خاں اُڑایا کرتے تھے:
(الف) چڑیا (ب) طوطا (ج) مینا (د) فاختہ (د)

63۔ استاد منگو کو پولیس کے سپاہی لے گئے:
(الف) حوالات میں (ب) عدالت میں (ج) سنٹرل جیل میں (د) تھانے میں (د)

64۔ پولیس نے استاد منگو کو بند کر دیا:
(الف) حوالات میں (ب) پولیس گاڑی میں (ج) جیل میں (د) کمرے میں (الف)

مصنف
امجد اسلام امجد
(1944-2023)

سبق: ۱۰ دہلیز

مصنف کا تعارف

امجد اسلام امجد لاہور میں پیدا ہوئے۔ مسلم ماڈل ہائی سکول سے میٹرک، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے اُردو میں ایم۔اے کیا۔ ایم۔اے اردو میں ان کی فرسٹ ڈویژن اور یونی ورسٹی میں دوسری پوزیشن تھی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایم اے او کالج، لاہور سے کیا جہاں ۱۹۶۸ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک شعبۂ اردو میں لیکچرر رہے۔ کچھ عرصے بعد اسی ادارے میں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۷ء تک ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے اور پھر ۱۹۹۷ء سے لے کر ریٹائرمنٹ تک چلڈرن لائبریری کمپلیکس اور اردو سائنس بورڈ، لاہور میں ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

امجد اسلام امجد نے شاعر، ڈراما نویس، سفرنامہ نگار، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ خاص طور پر وہ ٹیلی ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی معروف ہوئے۔ انھیں ۱۹۸۷ء میں تمغائے حسنِ کارکردگی، ۱۹۹۸ء میں ستارۂ امتیاز اور ۲۰۲۳ء میں ہلال امتیاز کے اعزازات سے نوازا گیا۔

اس ضمن میں انھوں نے بے شمار ڈرامے لکھے جن میں ''وارث''، ''اپنے لوگ'' اور ''دہلیز'' کو عوام و خواص نے بہت پسند کیا اور انھیں بشمول چینی زبان کے، کئی زبانوں میں ''ڈب'' کیا گیا۔ امجد اسلام امجد اپنے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میری زندگی کے اہم اور دل چسپ واقعات بہت سے ہیں۔ مثلاً: یہی بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ میں اپنی زندگی کے دوران میں کرکٹ کا کھلاڑی تھا اور اس میدان میں نام پیدا کرنا چاہتا تھا مگر آگے چل کر میری پہچان شاعری اور ڈراما بنے۔''

ان کی اہم تصانیف میں ''بارش کی آواز''، ''شام سرائے''، ''اتنے خواب کہاں رکھوں''، ''ساتواں در''، ''برزخ'' (شعری مجموعے) اور ''وارث''، ''دہلیز''، ''سمندر''، ''گردش''، ''دن''، ''رات''، ''وقت'' (ڈرامے) وغیرہ شامل ہیں۔

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ☆ طلبہ کو فنِ ڈراما نگاری سے آشنا کرنا۔
- ☆ اُردو ادب میں ڈراما نگاری کی روایت اور نمایندہ ڈراما نگاروں کے بارے میں آگاہ کرنا۔
- ☆ امجد اسلام امجد کی شخصیت اور مختلف ادبی، شعری جہات کے بارے میں بتانا۔
- ☆ ڈراما ''دہلیز'' کا فکری اور فنی جائزہ لینا۔

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر (71) **دہلیز:** (چوکھٹ، ڈیوڑھی، دروازہ)، **پلازا:** (ہسپانوی لفظ، (Platea) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی شہری عمارت کے ہیں، دفاتر، مکانوں اور دکانوں کی عمارتیں وغیرہ۔)، **منصوبہ:** (وہ کام جس کا ارادہ کیا گیا ہو، کوئی اہم کام جس کا خیال یا تدبیر ذہن یا کاغذ میں محفوظ ہو) **نقشہ:** (تصویر، روپ، عکس، وہ خاکہ جو مکان وغیرہ کی تعمیر سے پہلے کاغذ پر بنایا جاتا ہے، تعمیر منصوبہ یا تجویز)، **ملحق:** (ملا ہوا، جُڑا ہوا، نزدیک)، **حیلہ بہانہ:** (ٹال مٹول، بہانہ بازی، لیت و لعل)، **مبادل:** (بدلے میں آنے والا، بدل)، **لالچ:** (حرص، طمع)، **ناجائز:** (شریعت یا قانون کی رُو سے غلط، ناقابلِ قبول)، **حربہ:** (تدبیر، حیلہ، بہانہ)، **جاگیر:** (وہ زمین جو بادشاہ یا حکومت کی طرف سے انعام کے طور پر دی جائے۔)، **جاگیردار:** (وہ شخص جسے حکومت کی طرف سے جاگیر ملے، زمین دار)،

قدرت: (خُدائی طاقت یا شانِ خُداوندی، خُدا کی ذات)، **انتقام:** (بدلہ، پاداش)، **حویلی:** (بڑا مکان، عالی شان مکان، محل سرا)، **کش مکش:** (کھینچا تانی، جھگڑا)، **تیمارداری:** (مریض کی دیکھ بھال، بیمار پُرسی)، **رنجش:** (آزردگی، ناخوشی، بگاڑ، اَن بَن)، **نیک فطرت:** (نیک سرشت، نیک طینت)، **دل چسپی:** (شوق، لگاؤ، رغبت)، **جذبات:** (جذبہ کی جمع، جوش، ولولہ، احساسات)، **باطنی:** (اندرونی، پوشیدہ، چھپا ہُوا)، **سہارا:** (امید، آسرا، بھروسہ، مدد)، **بدمعاش:** (وہ شخص جس کی روزی بُرے کاموں پر منحصر ہو، حرام خور)، **ڈیرا:** (زمین دار کا مکان جو گاؤں میں ہوتا ہے، گھر، رہائش، ٹھکانا)، **پُرجوش:** (جوش سے بھرا ہوا، جوشیلا، سرگرم)، **بے چینی:** (بے قراری، بے آرامی، پریشانی، گھبراہٹ)

نمبر (72) **ایک دم** (فوراً، فوری طور پر، اچانک)، **اطمینان:** (سکون، آرام لینا، تسلی)، **گھبرانا:** (پریشان ہونا، بوکھلانا، ڈر جانا)، **اثبات:** (اقرار، ہامی، ہاں)، **حیرت:** (تعجب، حیرانی)، **غافل:** (غفلت کرنے والا، بے پروا، بے فکر)، **خواہ مخواہ:** (بلاوجہ، بے ضرورت، مجبوراً)، **آزردگی:** (رنج، ناراضی، رنجش)، **گِلہ:** (شکوہ، شکایت)، **آندریں:** (انتڑیاں)، **آندریں جواب دے گئیں:** (پنجابی محاورہ، مُراد ہے میں نے پورا زور لگا لیا ہے لیکن اب ہمت جواب دے گئی ہے۔)

نمبر (73) **جواز:** (اجازت، منظوری، جائز ہونا، قانونی اجازت)، **مخاطب:** (وہ جس سے بات کی جائے یا کہی جائے، جس سے خطاب کیا جائے۔)، **شریف:** (نیک طبیعت، بھلا آدمی، معتبر، معزز)، **چونک:** (خوف، وحشت، ڈر)، **احتجاج:** (اعتراض، انکار، مخالفانہ آواز اُٹھانا)، **ضمیر:** (دل، قلب، من اور جی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ صحیح اور غلط میں تمیز کی اخلاقی حس)، **آزاد:** (خودمختار، بے فکر، بے غم)، **سودا:** (خرید و فروخت، لین دین، خریداری)، **جھجک:** (خوف، حیا، ہچکچاہٹ)

نمبر (74) **بوجھ:** (وزن، ذمہ داری، رنج و ملال)، **انسانیت:** (شرافت، تہذیب، تمیزداری، انسان ہونے کی فضیلت یا صفات)، **خوش نظر:** (ملن سار، بے تکلف، اچھی چیزوں کو پسند کرنے والا)، **تیز گام:** (تیز رفتار، جلد جلد قدم اٹھانے والا)، **شرارت آمیز:** (بدنیتی پر مبنی، شرارتی، شرارت والا)، **بدتمیز:** (ناشائستہ، پھوہڑ، گستاخ)، **انتظام:** (بندوبست، نظم و نسق)، **چکما دینا:** (فریب دینا، دھوکا دینا، بے وقوف بنانا)، **چونک کر:** (ڈر کر، خوف زدہ ہو کر)

نمبر (75) **حیرت سے:** (حیرانی سے، تعجب سے)، **تذبذب:** (شک و شبہ، تردد، غیر یقینی حالت)، **گنوار:** (جاہل، اُجڈ، غیر مہذب، بے وقوف)، **داغ دار:** (عیب دار، جس میں کچھ کھوٹ یا بُرائی ہو)، **قید:** (اسیر، گرفتار)

نمبر (76) **گناہ گار:** (خطا کار، مجرم، بدکار)، **بھگتنا:** (برداشت کرنا، جھیلنا، کیے کی سزا پانا)، **مُرخ:** (چہرہ، طرف، سمت)، **احسان** (اچھا سلوک، مہربانی کا برتاؤ، عملِ خیر)، **اظہار:** (ظاہر کرنا یا ہونا، انکشاف، بیان، گفت گو)، **زائل:** (دور ہونے والا، ہٹ جانے والا)

توضیحات

پلازا: ہسپانوی لفظ، (Platea) سے مشتق ہے۔ جس کے معنی شہری عمارت کے ہیں، دفاتر، مکانوں اور دکانوں کی عمارتیں وغیرہ۔

نقشہ: تصویر، روپ، عکس، وہ خاکہ جو مکان وغیرہ کی تعمیر سے پہلے کاغذ پر بنایا جاتا ہے، تعمیرِ منصوبہ یا تجویز۔

منصوبہ: وہ کام جس کا ارادہ کیا گیا ہو، کوئی اہم کام جس کا خیال یا تدبیر ذہن یا کاغذ میں محفوظ ہو۔

کیفے ٹیریا: ایک قسم کا ریستوران ہوتا ہے۔ یہ ایسا ریستوران ہوتا ہے، جس میں بیرا یا ویٹر نہیں ہوتا بلکہ گاہک خود ہی اشیائے خورد و نوش میز پر لے جاتا ہے۔

سبق کا خلاصہ

یہ کہانی احمد علی اور فقیر حسین کے درمیان کشمکش اور تنازعات کو بیان کرتی ہے۔ احمد علی اور فقیر حسین آپس میں رشتے دار ہیں۔ احمد علی ایک کاروباری شخص ہے جو شہر میں ایک نئے پلازے کی تعمیر کا منصوبہ بناتا ہے۔ پلازے میں سینما بنانے کے لیے اسے ملحقہ مکان

کی ضرورت ہے جو اس کے چچازاد بھائی فقیر حسین کا ہے۔ وہ اسے مختلف حیلوں بہانوں سے گھر بیچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے بدلے بہترین مکان کا لالچ بھی دیتا ہے۔ لیکن فقیر حسین راضی نہیں ہوتا۔ احمد علی کا بیٹا عابد، زبردستی اس سے مکان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اِس رویے سے فقیر حسین، اس کا بیٹا اختر اور بیٹی سعیدہ تنگ آ جاتے ہیں۔ اختر اپنے دوست رفیق کی مدد سے ان تمام حالات پر قابو پا لیتا ہے۔ رفیق ایک جرائم پیشہ فرد ہے جو جہانگیر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ لوگوں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتا ہے۔

ایک روز اختر اور اس کی بہن سعیدہ رفیق کے گھر جاتے ہیں۔ سعیدہ گھر میں قدم رکھتے ہی چاروں طرف اسے ڈھونڈتی ہے۔ رفیق گھر میں خاموش کھڑا ہوتا ہے اور سلامت ان دونوں کا استقبال کرتا ہے۔ رفیق کے رویے سے پشیمانی ظاہر ہو رہی ہے۔ اختر اور سعیدہ رفیق کو بتاتے ہیں کہ قدرت نے جہانگیر سے اس کے تمام گناہوں کا بدلہ لے لیا ہے اور وہ حویلی میں آگ لگنے سے جل کر مر گیا ہے۔ اس کی موت کا رفیق پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے تمام گناہوں کا ازالہ کر سکے اور معاشرے کا ایک بہترین انسان بن سکے۔ اختر اور سعیدہ رفیق کو سمجھاتے ہیں کہ وہ خود کو پولیس کے حوالے نہ کرے اور یہ کام ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ جس پر رفیق انھیں کہتا ہے کہ ایک اچھا انسان بننے کے لیے اسے تمام بوجھ گردن سے اتارنا ہوں گے اور یہ گناہوں کا کفارہ ادا کیے بغیر ممکن نہیں۔ جس پر سلامت اسے کہتا ہے کہ وہ کام تم نے اپنی خوشی سے نہیں کیے تھے۔ لیکن رفیق خود کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے کہ چاہے اپنی مرضی سے نہیں کیے تھے۔ مگر کیے تو تھے، قانون تو توڑا تھا اور لوگوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ سعیدہ رفیق سے محبت کرتی ہے اس لیے وہ اس کے موقف پر پریشان اور اداس ہو جاتی ہے۔ رفیق سلامت، اختر اور سعیدہ کے اِصرار کے باوجود اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

دوسری طرف مصنف کہانی کو نیا موڑ دیتا ہے۔ جہانگیر کی موت کے بعد احمد علی اور فقیر حسین کے تعلقات میں تبدیلی آتی ہے۔ احمد علی کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے فقیر حسین اس کے گھر آنا جانا شروع کرتا ہے۔ جس سے ان کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔ دونوں خاندانوں کی موجودگی میں احمد علی فقیر حسین سے سعیدہ کا ہاتھ اپنے بیٹے خالد کے لیے مانگتا ہے۔ جسے خود سعیدہ بھی اس کے کردار اور شرافت کی وجہ سے پسند کرتی ہے۔ لیکن جب احمد علی سعیدہ کو اپنے پاس بیٹھنے کو کہتا ہے تو وہ اس کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ جس پر فقیر حسین سعیدہ سے سوال کرتا ہے اور وہاں موجود تمام لوگ حیرت سے سعیدہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ احمد علی سعیدہ سے کہتا ہے کہ تم دونوں تو ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ سعیدہ اس بات کا اقرار کرتی ہے۔ وہ اپنی باتوں سے اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ وہ خالد سے نہیں بلکہ رفیق سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

رفیق کے جیل میں ہونے کے باوجود سعیدہ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے اور انھیں سمجھاتی ہے کہ اگر ایک گناہ گار توبہ کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرے تو ایسے شخص کو قبول کرنا چاہیے اور اگر ہم ہی رفیق کو قبول نہیں کریں گے تو باقی دنیا کیسے کرے گی۔ فقیر حسین کو سعیدہ کی یہ سوچ پسند آتی ہے اور وہ اسے مشورہ دیتا ہے کہ رفیق کے ساتھ اس کا تعلق احسان کے طور پر نہ ہو، بلکہ ایک حقیقی شراکت داری کے طور پر ہو۔

مرکزی خیال

اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان اپنی غلطیوں اور گناہوں سے توبہ کر کے نئی زندگی کا آغاز کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص توبہ کر کے اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کا ارادہ کرے تو اس کے اردگرد اور قریبی لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اس کا بھرپور ساتھ دیں۔ محبت اور ہمدردی کے ساتھ اس کی طرف قدم بڑھائیں۔ کیوں کہ یہی انسانیت ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق وسباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق وسباق

یہ کہانی فقیر حسین اور احمد علی کے درمیان کشمکش اور تنازعات کو بیان کرتی ہے۔ احمد علی اور فقیر حسین آپس میں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی ایک کاروباری شخص ہے جو شہر میں پلازے کا منصوبہ بناتا ہے۔ پلازے کے گراؤنڈ فلور میں سنیما بنانے کے لیے انھیں ملحقہ مکان کی ضرورت تھی، جو فقیر حسین کا تھا۔ احمد علی مختلف حیلوں بہانوں سے اس سے مکان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے اِس رویے سے فقیر حسین، اس کی بیٹی سعیدہ اور بیٹا اختر تنگ آجاتے ہیں۔ اختر اپنے جرائم پیشہ دوست رفیق کی مدد سے ان تمام حالات پر قابو پاتا ہے۔ آخر کار رفیق اپنی جرائم پیشہ زندگی کو ترک کرتا ہے اور اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے اور ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری طرف احمد علی کی بیماری اور جہانگیر کی موت کے باعث دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوجاتے ہیں۔ احمد علی اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا رشتہ مانگتا ہے۔ لیکن وہ خالد نہیں بلکہ رفیق کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔ کیوں کہ سعیدہ کے نزدیک رفیق کا ساتھ دینا، انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کے مترادف ہے۔

عبارت نمبر 1

اختر: (ہنستے ہوئے) یار سلامت! ایک تو تجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کی پڑی رہتی ہے۔

سلامت: تم مت بولو یار بیچ میں۔ میں باجی جی سے پوچھ رہا ہوں۔ تم ایسے ہی خواہ مخواہ۔۔۔

سعیدہ: نہیں سلامت بھائی۔ شکریہ۔ اب ہم چلیں گے۔ (رفیق سے) آپ آیئے نا کسی وقت۔ ابو بھی پوچھ رہے تھے آپ کو۔

رفیق: (آزردگی سے مسکراتے ہوئے) انھیں میرا سلام کہیے گا۔۔۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔۔۔ ہوسکتا ہے اس وقت تک انھیں میرا نام بھی بھول چکا ہو۔۔۔

سعیدہ: کیا؟ کیا مطلب؟

سلامت: (گِلے کے انداز میں) آپ ہی اس کو سمجھائیں باجی جی۔۔۔ میری تو آندریں جواب دے گئی ہیں بحث کر کر کے۔۔۔ استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف دو خاندانوں کے درمیان موجود تنازعات کو بیان کرتے ہیں۔ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے پلازے میں سنیما بنانے کے لیے ملحقہ مکان کی ضرورت ہے جو فقیر حسین کا ہے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے گھر بیچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ رضامند نہیں ہوتے۔ اختر اپنے دوست رفیق کی مدد سے ان تمام حالات پر قابو پاتا ہے۔ جہانگیر کی موت کے بعد اختر اور سعیدہ رفیق کے گھر جاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ رفیق اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے کے لیے خود کو قانون کے حوالے کر دیتا ہے۔ کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے، احمد علی کی بیماری کی وجہ سے فقیر حسین کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر ہوجاتے ہیں۔ احمد علی اپنی اس دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے لیے اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع

بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

یہ اقتباس ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جہاں مختلف کردار زندگی کے معمولات کے درمیان ایک دوسرے سے گفت گو کر رہے ہیں۔ لیکن روزمرہ بات چیت کے پس منظر میں حالات کی سنجیدگی بھی جھلک رہی ہے۔ یہ مکالمے اس وقت کے ہیں جب رفیق خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لیے ماحول ایک غیر یقینی کیفیت سے گزرتا ہے۔ باتوں میں بظاہر ہلکی پھلکی فضا ہے مگر ہر کردار اپنے اپنے انداز میں معاشرتی دباؤ اور بکھرتی قدروں سے نبرد آزما ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ سعیدہ اور اس کا بھائی، رفیق سے ملنے اس کے گھر جاتے ہیں۔ رفیق اختر کا دوست ہے جو احمد علی کے پیدا کردہ زمینی مسائل پر قابو پانے میں اختر کی مدد کرتا ہے۔ اس سے ملتے ہی سعیدہ نہایت پرجوش انداز میں اسے جہانگیر کے جیل کر مرنے کی خبر سناتی ہے۔ جہانگیر ایک پیشہ ور مجرم تھا جو زمینوں پر ناجائز قبضہ کر کے اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ رفیق بھی اسی کے ساتھیوں میں سے تھا۔ سعیدہ اور اختر کو دیکھ کر رفیق کا ملازم سلامت انھیں پیڑے والی لسی کی پیش کش کرتا ہے۔ جس پر ہنستے ہوئے اختر جواب دیتا ہے کہ یار سلامت تجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کی پڑی رہتی ہے۔ سلامت اختر سے اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم بیچ میں مت بولو! میں سعیدہ باجی سے پوچھ رہا ہوں۔ سعیدہ لسی کے لیے سلامت کو منع کر دیتی ہے اور رفیق کی طرف متوجہ ہو کر کہتی ہے کہ آپ کسی دن ہمارے گھر آئیں۔ ابا بھی آپ کا پوچھ رہے تھے۔ سعیدہ رفیق کو پیشہ ور مجرم ہونے کے باوجود پسند کرتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا۔ البتہ رفیق کے ساتھ اس کی ہمدردی اس کی محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ بقول شاعر:

ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حالِ دل کبھی اور وہ سمجھے نہیں یہ خامشی کیا چیز ہے (عدافاضلی)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ سعیدہ رفیق کو اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ابو بھی آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ یہ سن کر رفیق نہایت رنجیدہ سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اسے جواب دیتا ہے کہ اپنے ابا کو میرا سلام دینا۔ زندگی رہی تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ ہوسکتا ہے اس وقت تک انھیں میرا نام بھی بھول جائے۔ رفیق نہایت اداس اور مایوس ہونے کے باوجود چہرے پر مسکراہٹ سجائے سعیدہ کے سوال کا جواب دیتا ہے۔ دراصل رفیق اپنے گناہوں اور جرائم پیشہ زندگی پر نادم تھا۔ یہ احساسِ ندامت اسے لوگوں سے ملنے سے روک رہا تھا اور وہ لوگوں سے کنارہ کرنا چاہتا تھا۔ رفیق کا یہ کہنا کہ **''ہوسکتا ہے اس وقت تک انھیں میرا نام بھی بھول چکا ہو۔''** اس کے داخلی رنج وغم، تکلیف، اداسی، ناامیدی اور اضطراب کو بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کی وجہ سے شرمندہ تھا۔ اس لیے وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔

رفیق کا یہ رنجیدہ لہجہ سعیدہ کو پریشان کر دیتا ہے اور وہ نہایت پریشانی کے عالم میں رفیق سے پوچھتی ہے کہ آپ کی اس بات کا کیا مطلب ہے کہ ابا آپ کا نام تک بھول جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ رفیق خود جواب دیتا، سلامت شکوہ کے انداز میں سعیدہ سے کہتا ہے کہ باجی جی آپ اسے سمجھائیں۔ اس سے بحث کر کر کے میری ہمت جواب دے گئی ہے اور یہ ہے کہ سمجھتا ہی نہیں۔ استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔ دراصل رفیق کے باطن میں نیکی کا عنصر موجود ہے۔ ساری زندگی جرائم کرنے کے باوجود بھی اس کا ضمیر زندہ ہے۔ رفیق اپنے استاد جہانگیر کی عبرت ناک موت سے سبق حاصل کرتا ہے اور اپنے تمام گناہوں کا ازالہ کرنے کا سوچتا ہے۔ اس لیے وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تاکہ پولیس اسے اِس کے جرم کی سزا دے اور وہ خود کو گناہوں کے بوجھ سے آزاد کرا سکے۔ بقول امجد اسلام امجد:

''مجرموں کے لیے بھی اصلاح اور اصلاح کے بعد انھیں معاشرے کے فعال اور ذمے دار رکن بنانے کے مواقع فراہم ہونے چاہییں۔''

یہ عبارت مصنف کے اس خاص اسلوب کی مثال ہے جس میں وہ سادہ اور عام فہم زبان میں کرداروں کے جذبات کی

نمائندگی کرتے ہیں۔ مکالمے روزمرہ انداز کے ہیں لیکن قاری یا ناظران سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اس عبارت میں مصنف نے دکھایا ہے کہ زندگی بظاہر معمول کے ڈھب پر چلتی دکھائی دیتی ہے لیکن اندر سے ہر شخص کسی نہ کسی بوجھ یا کشمکش کا شکار ہوتا ہے، مکالموں کا انداز سادہ اور فطری ہے اسی لیے متاثر کن ہے۔

عبارت نمبر 2

سلامت: پھر وہی بات۔۔۔ (اختر کو مخاطب کرتے ہوئے) دیکھو یار بابو، اب جب کہ ہم یہ سارے غلط قسم کے کام چھوڑ رہے ہیں، شریف شہری بننے کا ارادہ کر رہے ہیں، تو کیا یہ کافی نہیں ہے؟ (اختر اثبات میں سر ہلاتا ہے) تو سمجھاؤ پھر ان کو۔ (استاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)

رفیق: یہ بات نہیں ہے سلامے۔ شریف آدمی بننے کے لیے مجھے وہ سارے بوجھ اپنی گردن سے اتارنے ہوں گے جو میں نے ان بارہ سالوں میں جمع کیے ہیں، سارے جرائم اور غیر قانونی کام جو میں کرتا رہا ہوں اُن کا کفارہ ادا کیے بغیر مجھے، ان لوگوں کے ساتھ (اختر اور سعیدہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سعیدہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔) کھڑا ہونے کا کوئی حق نہیں۔ میں کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف دو خاندانوں کے درمیان موجود تنازعات کو بیان کرتے ہیں۔ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ مکان کی ضرورت ہے، جو فقیر حسین کی ملکیت ہے احمد علی مختلف حیلوں بہانوں سے اسے گھر بیچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن وہ رضامند نہیں ہوتا۔ اختر اپنے دوست، رفیق کی مدد سے ان تمام حالات پر قابو پاتا ہے۔ رفیق جہانگیر کے ساتھ مل کر زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتا تھا۔ جہانگیر کی عبرت ناک موت کے بعد رفیق خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد کہانی میں نیا موڑ آتا ہے۔ احمد علی اور فقیر حسین کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔ احمد علی اپنی اِس دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے لیے اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اِس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے، جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

اس اقتباس میں وہ لمحہ دکھایا گیا ہے جب رفیق اپنے ماضی کے جرائم سے توبہ کر کے ایک نئی پاکیزہ زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ رفیق میں ماضی کی تاریکی سے نکل کر روشنی کی طرف قدم بڑھانے کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ رفیق کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف ظاہری تبدیلی پر قناعت نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے ضمیر کو بھی مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے پرانے جرائم کا بوجھ اتارنے کی بات کر رہا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف رفیق کی ذہنی کشمکش بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے اِس فیصلے سے سلامت، اختر اور سعیدہ اسے روکتے ہیں۔ لیکن وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔ کیوں کہ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کے عمل میں ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف غلط کام چھوڑ دینا کافی نہیں، بلکہ اسے اپنے ماضی کے گناہوں کا ازالہ بھی کرنا ہوگا۔ بقول عطا حسین فانی:

شرمندہ ہوں گناہ سے اپنے میں اِس قدر — کیا چشم پر گنہ کو تیری دو بدو کریں

سلامت، رفیق کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے اختر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب استاد کر شریف انسان کی طرح زندگی گزارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو کیا یہ کافی نہیں۔ اچھا شہری بننے کے لیے کیا ا۔ قانون کے حوالے کرے۔ دراصل سلامت کے نزدیک اچھا شہری بننے کے لیے گناہوں سے کنارہ کرنا ہی کا گئے غلط کاموں کا کفارہ ادا کرنا لازم نہیں۔ سلامت کی اِس سوچ سے اختر بھی ہم خیال نظر آتا ہے۔ وہ اختر سے کہتا ہے کہ استاد سے کہیں کہ جیل جانے کی ضد چھوڑ دیں۔ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیے بغیر بھی استاد اچھا انسا توبہ کرنے اور گناہوں سے کنارہ کرنے سے ہی ماضی کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ

''مگر وہ جنھوں نے توبہ کی، اپنی اصلاح کی اور حق کو بیان کر دیا، تو میں ان کی توبہ قبو توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔'' (سورۃ البقرۃ، آیت نمبر:160)

اور بقول اسماعیل میرٹھی:

اگر تم سے ہو جائے سرزد قصور — تو اقرار و توبہ

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ رفیق، سلامت اور اختر کی بات کو مسترد کر دیتا ہے کیوں کہ اپنے ضمیر کے لیے وہ خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لیے وہ سلامت سے کہتا ہے: ''کہ یہ بات نہیں ہے بننے کے لیے مجھے وہ سارے بوجھ اپنی گردن سے اتارنے ہوں گے جو میں نے ان بارہ سالوں میں جمع کیے نزدیک شریف شہری بننے کے لیے صرف اپنے ماضی کے تمام جرائم کو پس پشت ڈالنا کافی نہیں بلکہ اپنے کیے ضروری ہے۔ رفیق کے ذریعے مصنف نے اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ بظاہر مجرم نظر آنے والے شخص کے با موجود ہو سکتا ہے۔ رفیق اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اور خود پر سے گناہوں کا بوجھ اتارنے کے لیے عملی اقد کے نزدیک وہ اپنے تمام جرائم، غیر قانونی کام اور لوگوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں جیسے گناہوں سے اس وقت تک جب تک کہ وہ ان کا کفارہ ادا نہ کر لے۔ یعنی اپنے گناہوں کی سزا نہ پا لے۔ بقول شاعر:

دل پہ جب بوجھ بڑھا، رنج والم یاد آیا — ہم کو اپنے ہی گناہوں کا

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ رفیق میں موجود احساسِ جرم اسے سزا کا حق کے علاوہ اس میں موجود احساسِ ندامت اسے بار بار اپنے مجرم ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔ اس لیے وہ سلامت گناہوں کا کفارہ ادا کیے بغیر میں ان لوگوں یعنی سعیدہ اور اختر جیسے معزز لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونے کا حق نہیں اصلاح ہی نہیں چاہتا بلکہ وہ ان تمام منفی اثرات کو بھی ختم کرنا چاہتا ہے جو اس کے بُرے اعمال کا نتیجہ تھے۔ اس کا ادا کیے بغیر خود کو بہتر شخص نہیں بن سکتا اور وہ اس سماج میں جہاں سعیدہ اور اختر جیسے معزز لوگ ہیں، جنھوں نے زند نہیں کیا اور نہ ہی کسی کی حق تلفی کی، صرف گناہوں سے توبہ کر کے خود کو ان میں شمار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ان کے محسوس کرتا ہے اور ایسے معزز لوگوں میں خود کو عزت کے ساتھ کھڑا ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ بقول شاعر:

کوئی پرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا — زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کس کو

اقتباس کے آخر میں مصنف نے سعیدہ کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو کو بھی بیان کیا ہے۔ رفیق کا جیل جا۔ اقرار کرنا کہ میں معزز لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونے کے قابل نہیں، سعیدہ کو چونکا دیتا ہے۔ وہ رفیق کے خیالات اور اسے اس کے اِس فیصلے پر حیرانی ہوتی ہے کہ وہ اس قدر مثبت سوچ کا مالک ہے۔ اتنے جرم کرنے کے باوجود بھی موجود ہے۔ اس کے اندر ضمیر کی چنگاری ابھی بجھی نہیں۔

اس عبارت میں نہایت سادہ مکالماتی انداز میں ایک اہم اخلاقی کشمکش کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کردار جذباتی کیفیات اور اندرونی تضادات کو اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے۔ رفیق کے الفاظ میں ضمیر کی خلش، اصلاح کی

جذبہ جھلکتا ہے۔ یہ جذبہ اسے ایک مجرم سے ایک حساس انسان میں بدل دیتا ہے۔ سلامت کا ہلکا پھلکا انداز اور اختر کا سنجیدہ رویہ اس منظر کو توازن فراہم کرتے ہیں۔ یہ عبارت سادگی اور حقیقت پسندی کا ایک عمدہ نمونہ نظر آتی ہے۔

عبارت نمبر 3

سلامت: پر وہ کام تم نے اپنی خوشی سے تو نہیں کیے تھے۔

رفیق: (زور دیتے ہوئے) کیے تو تھے نا۔۔۔ قانون تو توڑا تھا نا۔۔۔ نقصان تو پہنچا ہے نا لوگوں کو میری وجہ سے۔

سلامت: وہ تو ٹھیک ہے پر۔۔۔ انصاف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

رفیق: انصاف ہی کے لیے تو میں یہ سب کر رہا ہوں سلامے!

اختر: مگر استاد! سلامت بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔ بارہ سال میں جو تم پر گزری ہے، یہ کم سزا تو نہیں۔

رفیق: نہیں اختر باؤ نہیں۔ (سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے) میں ٹھیک کر رہا ہوں نا سعیدہ بی بی؟

سعیدہ: (پریشانی میں) ہاں۔ رفیق صاحب۔۔۔!

اختر: (احتجاج آمیز انداز میں) یہ کیا کہہ رہی ہو؟

(سعیدہ کوئی جواب نہیں دیتی۔)

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی ایک کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سینما بنانے کے لیے فقیر حسین کا مکان درکار ہے۔ فقیر حسین اسے اپنا مکان نہیں بیچتا۔ اختر کا دوست رفیق جو جرائم پیشہ گروہ کا حصہ ہوتا ہے وہ احمد علی سے ان کی جان چھڑانے میں مدد کرتا ہے۔ رفیق اپنے ساتھی جہانگیر کی عبرت ناک موت سے سبق حاصل کرتا ہے اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے اس فیصلے سے اُسے اختر، سعیدہ اور سلامت روکتے ہیں۔ مگر وہ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد کہانی میں نیا موڑ آتا ہے۔ احمد علی اور فقیر حسین کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے لیکن سعیدہ، خالد سے شادی کی بجائے رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

اس منظر میں رفیق اپنی اصلاح کے فیصلے پر ثابت قدم دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنے ماضی کے گناہوں کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے ان کا کفارہ ادا کرنے پر بضد ہے، اختر اور سلامت اس کی جذباتی حالت کو سمجھتے اور اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رفیق کے دل میں ماضی میں کیے گئے اپنے بُرے اعمال کا پچھتاوا ہے اور وہ اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہونا چاہتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ رفیق اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے اور گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ سلامت، اختر اور اس کی بہن سعیدہ اسے جیل جانے سے منع کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم رہتا ہے۔ دراصل رفیق کا موقف یہ ہے کہ صرف اپنے ماضی کو پسِ پشت ڈالنا کافی نہیں، بلکہ معزز شہری بن کر معاشرے میں شامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی پوری پوری سزا پائے۔ تاکہ لوگوں کے ساتھ کیے گئے ظلم و زیادتی

کا بوجھ اس کی گردن سے اتر جائے اور وہ خود کو مطمئن کر سکے۔ اگرچہ رفیق ایک پیشہ ور مجرم ہے لیکن اس کے باطن میں نیکی موجود ہے۔ جس نے اسے توبہ کرنے اور راہِ راست پر چلنے پر مجبور کیا۔ ایسے لوگوں کا دنیا و آخرت میں بڑا مقام ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف لوٹ چل، اس حال میں کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔'' (سورۃ الفجر، آیت نمبر: 27-30)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ سلامت رفیق کو جیل جانے سے روکتا ہے اور ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ بدل لے۔ لیکن رفیق اپنے فیصلے پر بضد رہتا ہے۔ سلامت اسے مطمئن کرنے کے لیے کہتا ہے کہ بارہ سال جو جرم تم نے کیے ہیں اپنی خوشی سے تو نہیں کیے۔ یہاں مصنف نے رفیق کے ذریعے جرائم پیشہ لوگوں کی مجبوری کو ظاہر کیا ہے۔ یعنی ہر جرم کرنے والا شخص اپنی خوشی سے جرم نہیں کرتا۔ اس کے پیچھے بہت سے محرکات ہوتے ہیں جو اسے جرم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جیسے کسی طاقت ور شخصیت کا دباؤ، کسی مجبوری یا غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ رفیق نے بھی ایسی ہی کسی مجبوری کے تحت جرائم کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ اس لیے سلامت اسے کہتا ہے کہ جن جرائم کے سزاوار تم خود کو ٹھہراتے ہو، وہ تم نے اپنی مرضی سے نہیں کیے بلکہ طاقت ور شخصیت کے کہنے، غربت اور مجبوری کی وجہ سے کیے تھے۔ رفیق سلامت کی بات سے متاثر ہوئے بغیر اپنے فیصلے پر قائم رہتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ جو بھی تھا، خواہ میں نے جرم کسی مجبوری کے تحت کیے تھے، لیکن کیے تو تھے ناں! میں نے قانون توڑا لوگوں کو میری وجہ سے جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ان کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کیا۔ میری وجہ سے معصوم لوگوں کا خون بہا۔ دراصل رفیق اپنے کیے پر بہت نادم تھا۔ اس لیے وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے خود کو قانون کے حوالے کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ بقول شاعر:

ندامتیں مرے ماضی سے کر رہی ہیں سوال وہ ماہ و سال کی دولت کہاں لٹا دی ہے

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ سلامت رفیق کو مطمئن کرنے اور خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے فیصلے سے روکتا ہے۔ وہ اسے کہتا ہے اگرچہ تم نے گناہ کیے ہیں، لوگوں کے ساتھ ناحق کیا ہے مگر تم نے یہ سب اپنی مرضی سے تو نہیں کیا، انصاف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ دراصل سلامت کا یہ موقف ہے کہ چوں کہ رفیق نے جرم اپنی مرضی سے نہیں کیے۔ ایک خاص مجبوری غربت، طاقت ور شخصیت کے کہنے پر کیے ہیں۔ لہٰذا اس کے نزدیک انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ رفیق خود کو سزا کا مرتکب نہ ٹھہرائے بلکہ گناہوں سے کنارہ کر کے معزز شہری کی طرح زندگی گزارے اور خود کو مجرم سمجھنا چھوڑ دے۔ لیکن رفیق کے نزدیک انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اس کی وجہ سے کسی دوسرے انسان کو نقصان پہنچا ہے تو اسے اس کی پوری سزا ملنی چاہیے کیوں کہ قانون اور انصاف نیت یا حالت دیکھ کر نہیں بلکہ عمل کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر کسی نے جرم کیا ہے تو اسے اس کا پورا حساب دینا ہوگا، چاہے وہ کسی مجبوری میں ہی کیوں نہ کیا ہو۔ درحقیقت انصاف ایک اصولی چیز ہے، اور اسے ذاتی احساسات، ہمدردی یا تعلقات کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔'' (سورۃ النساء، آیت نمبر: 58)

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ اختر بھی سلامت کی رائے کی تائید کرتے ہوئے رفیق سے کہتا ہے کہ سلامت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بارہ سال جو تم پر گزری ہے، یہ سزا کم تو نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ رفیق نے جو جرم کیے وہ اپنی خوشی سے نہیں کیے۔ بارہ سال جرائم کی دنیا میں گزاری ہوئی زندگی کا بوجھ اس کی گردن پر ہے۔ اگرچہ اس دوران میں اسے باضابطہ طور پر کوئی سزا نہیں دی گئی، لیکن ان بارہ سالوں کی مشکلات خود ایک سزا ہیں۔ نیز رفیق اختر کی بات سے بھی اتفاق نہیں کرتا اور نہایت بے چینی اور بے بسی کے عالم میں اختر سے کہتا ہے کہ نہیں باؤ نہیں۔ یہ کہہ کر وہ سعیدہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں! سعیدہ بی بی۔ یعنی وہ اس سے اپنے جیل جانے والے فیصلے کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ جس پر سعیدہ نہایت پریشانی اور گھبراہٹ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یوں ہی سہی آپ کی گر یوں خوشی ہے مہرباں یوں ہی سہی (ابراہیم ذوق)

سعیدہ کی اس کیفیت کی بڑی وجہ اس کی رفیق کے ساتھ جذباتی وابستگی ہے۔ ایک طرف وہ اپنے اندر اس کے لیے محبت کے جذبات رکھتی ہے۔ دوسری طرف اس کے ضمیر کی آواز سے متاثر نظر آتی ہے۔ بقول شاعر:

عشق سنتے تھے جسے ہم یہ وہی ہے شاید — خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا (الطاف حسین حالی)

سعیدہ کے اس جواب پر اختر احتجاج آمیز لہجے یعنی اس کی رائے کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی اور اپنی ذہنی الجھن کے باعث، خاموش کھڑی رہتی ہے۔

اس عبارت میں فرد کی اخلاقی بیداری کو نہایت سادہ اور مؤثر مکالمات کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ رفیق کا کردار جذباتی کے ساتھ فکری سطح پر بھی بیدار ہے۔ وہ اپنے ماضی کے جرائم کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے۔ عبارت کا اسلوب جان دار اور دل کش ہے، کرداروں کی زبان کا قدرتی بہاؤ اور جذبات کی کشمکش، اسلوب کی ندرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف نے ایک عام منظر کو روحانی اور اخلاقی گہرائی کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری یا ناظر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

عبارت نمبر 4

رفیق: ضمیر پر بوجھ لے کر آزاد رہنے سے چند سال کی جیل کاٹ لینا برا سودا نہیں اختر۔۔۔ (جاتے جاتے رُکتا ہے۔) پھر تم بھی کسی جھجک کے بغیر مجھے اپنا دوست کہہ سکو گے۔۔۔ کہو گے نا!۔۔۔ (اختر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔) اچھا سعیدہ بی بی خدا حافظ!

سعیدہ: خدا حافظ

سلامت: (بے چینی سے آگے آتے ہوئے) کمال کرتے ہو یار استاد جی۔ تمھارا کیا خیال ہے، ہمارا کوئی ضمیر نہیں ہے۔۔۔ ہمارے اوپر کوئی بوجھ نہیں۔ اگر تم نے جیل کی دال روٹی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔۔۔ (سعیدہ سے) انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

(دونوں جاتے ہیں۔ رفیق چند لمحے دروازے میں رک کر سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔)

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ مکان درکار ہے، جو فقیر حسین کا ہے۔ وہ اپنا مکان بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے احمد علی کا بیٹا عابد انھیں کافی پریشان کرتا ہے۔ اختر کا دوست رفیق جو خود زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتا ہے وہ احمد علی سے ان کی جان چھڑاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھی جہانگیر کی عبرت ناک موت کی وجہ سے رفیق اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ سلامت، اختر اور سعیدہ اس کے اس فیصلے سے رضامند نہیں ہوتے لیکن وہ پھر بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین کی باہمی کشیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ احمد علی اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

یہ منظر اس وقت کا ہے جب رفیق اپنے ماضی کی تمام غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ایک نیا راستہ چن چکا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ چناں چہ اس نے خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ رفیق نے جرائم کے

اندھیروں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تو اس کے دوست بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس سے رفیق کی اخلاقی جدوجہد مزید باوقار بن گئی ہے۔ حضرت امام حسینؓ کا ارشاد مبارک ہے:

''ضمیر کی عدالت میں ضرور جایا کرو کیوں کہ وہاں کبھی غلط فیصلے نہیں ہوتے۔''

تشریح طلب عبارت میں مصنف بتاتے ہیں کہ رفیق اپنے جیل جانے کے فیصلے پر بضد رہتا ہے اور اپنے دوستوں کے منع کرنے کے باوجود بھی جیل جانے کے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ رفیق کے نزدیک ضمیر مطمئن ہونا زیادہ ضروری ہے اور اس کے لیے چند سال جیل میں گزارنا کوئی گھاٹے کا سودا نہیں۔ ضمیر کی قید جسمانی قید سے زیادہ سخت اور تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس لیے ساری زندگی ضمیر کی خلش میں مبتلا رہنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کر کے اس کی سزا بھگت لے اور یہی رفیق نے کیا۔ بقول شاعر:

دھو دیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے — تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا (مومن خاں مومن)

رفیق نہایت بے بسی اور اضطرابی کیفیت میں اختر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب میں جیل سے واپس آ جاؤں گا تو تم بلا جھجک مجھے اپنا دوست کہہ سکو گے ناں۔ رفیق اپنے ماضی پر اس قدر نادم ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے خود کو اختر اور سعیدہ جیسے معزز شہریوں میں شمار کرنے سے بھی کتراتا ہے۔ اس لیے وہ خود اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ گناہوں کے بوجھ کو ہلکا کر سکے اور خود کو بلا جھجک معزز شہریوں میں شمار کر سکے۔ اس کے علاوہ رفیق کے دل میں خلش بھی موجود تھی کہ چاہے اس نے جرائم کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اس قابل نہیں کہ اختر جیسے معزز شہری کا دوست کہلا سکے۔ نیز رفیق کے یہ جملے اس کی اندرونی کیفیت، اضطراب اور کشمکش کو بیان کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

وہ پوچھتے ہیں دلِ مبتلا کا حال اور ہم — جواب میں فقط آنسو بہائے جاتے ہیں (ہادی مچھلی شہری)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ اختر رفیق کی بات پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ جاتے ہوئے سعیدہ کو خدا حافظ کہتا ہے۔ سعیدہ اس کے لیے جذبات، احساسات اور محبت کا اظہار کیے بغیر اسے خدا حافظ کہتی ہے۔ سلامت رفیق کو اکیلے جانے سے روکتا ہے۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھتے ہوئے اس سے کہتا ہے کہ تمھارا کیا خیال ہے استاد ہمارا کوئی ضمیر نہیں۔ یعنی سلامت جو خود رفیق اور جہانگیر کے گروہ کا حصہ ہوتا ہے اور ان کے ساتھ بہت سے جرائم میں ملوث ہوتا ہے، وہ بھی رفیق کے ساتھ جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے کہ وہ بھی اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے جرائم کے مطابق سزا کاٹے گا تاکہ اس پر سے بھی گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور وہ باقی زندگی گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر معزز شہری کی طرح گزار سکے۔ نیز یہاں دوستی کے جذبات بھی ظاہر ہوتے ہیں کہ سلامت اپنے دوست رفیق کو اکیلے جیل جانے سے روکتا ہے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے خود بھی جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جاتے ہوئے سلامت سعیدہ سے ایک جملہ کہتا ہے کہ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

وہاں جانے کو سب دشوار ہی دشوار کہتے ہیں — وہاں جانے کا کوئی راستہ آسان پیدا کر (سیماب اکبرآبادی)

سلامت اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال کر اپنے استاد رفیق کا ساتھ دینے کے لیے جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ کیوں کہ سلامت کے نزدیک دنیا میں صرف ذاتی فائدہ یا اصول وضوابط ہی سب کچھ نہیں ہوتے۔ بلکہ انسانیت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی بھی زندگی کی بڑی حقیقت ہے۔ بقول شاعر:

فرشتے سے بڑھ کر ہے انسان بننا — مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ (الطاف حسین حالی)

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ رفیق اور سلامت گھر سے باہر قدم رکھتے ہیں۔ رفیق کچھ دیر دروازے میں رک کر سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ لمحہ ان دونوں کے درمیان گہری محبت اور جذباتی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ رفیق کا رک کر سعیدہ کی طرف دیکھنا اِس بات کی دلیل ہے کہ سعیدہ کی طرح اس کے دل میں بھی محبت کے جذبات موجود ہیں۔ یہ لمحہ جدائی کے دُکھ، محبت کی شدت اور ان کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ اقتباس کرداروں کی داخلی کشمکش اور ضمیر کی خلش کو نمایاں کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ دوستوں کی باہمی وابستگی کا بھی ایک زبردست عکس پیش کرتا ہے۔ رفیق کا کردار سچائی، ندامت اور قربانی سے عبارت ہے۔ سلامت کا ردِعمل اس بات کا ثبوت ہے کہ انسانیت ابھی باقی ہے۔ مصنف کا اسلوب سادہ مگر دل میں اتر جانے والا ہے۔ کرداروں کی گفت گو قاری کی فکر کو ایک نئی سطح پر لے جاتی ہے۔

عبارت نمبر 5

احمد علی: آج میں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے پیدل ساری دنیا میں گھوم جاؤں۔
نیلم: (شرارت آمیز انداز میں) مگر کراچی سے آگے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے ابو!
سلمٰی: (محبت سے) بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو تم۔
اختر: جی بالکل۔
نیلم: آپ تو مت بولا کریں بیچ میں۔
احمد علی: کیوں نہیں بولے گا یہ۔۔۔ بلکہ ہم تو ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ تم اس کے سامنے بول ہی نہ سکو۔ کیوں سلمٰی؟

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سنیما بنانے کے لیے ملحقہ مکان درکار ہوتا ہے۔ جو فقیر حسین کا ہے۔ وہ اپنا مکان بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے احمد علی کا بیٹا عابد انھیں کافی پریشان کرتا ہے۔ اختر کا دوست رفیق جو خود زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتا ہے وہ احمد علی سے ان کی جان چھڑاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھی جہانگیر کی عبرت ناک موت کی وجہ سے رفیق اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ سلامت، اختر اور سعیدہ اس کے اس فیصلے سے رضامند نہیں ہوتے لیکن وہ پھر بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین کی باہمی کشیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ احمد علی اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

اس عبارت میں دکھایا گیا منظر خوشی اور محبت سے بھرپور گھریلو فضا کا عکاس ہے۔ مہمانوں کی آمد پر احمد علی خوش ہے جس کی وجہ سے خاندان کے باقی افراد بھی ہنسی مذاق میں مصروف ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب رشتے مضبوط ہو رہے ہیں اور ہنسی مذاق میں دل کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی کی شدید علالت کے باعث فقیر حسین اس کے گھر جاتا ہے اور پورے خلوص سے اس کی تیمارداری کرتا ہے۔ جس سے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔

علی احمد کو ڈاکٹر نے پچاس قدم چلنے کی اجازت دی ہے۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق آہستہ آہستہ پچاس قدم چلتا ہے۔ اسے اس بات کی خوشی ہے کہ فقیر حسین اس کی تیمارداری کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے پچاس قدم چلنے کی اجازت دی تھی لیکن اس دن وہ نہ صرف حد سے تجاوز کرتا ہے بلکہ چلتے ہوئے اس کے اندر ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس کے اندر جینے کا ایسا

حوصلہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیدل ہی ساری دنیا گھومنا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کی وسعتوں میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی دنیا گھومنے کی خواہش محض پیدل چلنے اور فاصلہ طے کرنے کی بات نہیں بلکہ یہ زندہ دلی اور نئی امیدوں کا اعلان ہے، زندگی میں یہ تازہ خوشی ایک مہربان دوست کی آمد کا نتیجہ ہے۔ بقول شاعر:

دوستی درد کا درماں بھی ہے راحت بھی ہے دل کو جو چین ملے وہ تری صحبت بھی ہے

بیماری میں آدمی کے مزاج میں ناامیدی اور بے قراری آجاتی ہے۔ اس کی زندگی خزاں کی دھوپ کا منظر پیش کرنے لگتی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی دوست ملنے اور حال پوچھنے کے لیے آجائے تو آدمی پھر سے جی اٹھتا ہے۔ اس کی بے قراری کو قرار آجاتا ہے اور دل بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

تیرا چہرہ نظر آئے تو سکوں آجائے ورنہ دل کو تو کسی طور قرار آتا نہیں

فقیر حسین کی آمد سے تعلقات مضبوط ہوئے ہیں اور احمد علی کو بیماری کے احساس سے نجات ملی ہے۔ وہ ان سے مل کر ایسے خوش ہے جیسے کبھی بیمار تھا ہی نہیں۔ وہ سب کے ساتھ ہنسی مذاق میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آج میں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے پیدل ساری دنیا میں گھوم جاؤں۔

یہ جملے احمد علی کی داخلی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ احمد علی کو صحت یاب دیکھ کر سب لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ اس کی بیٹی نیلم شرارت آمیز لہجے میں کہتی ہے کہ آپ پیدل ساری دنیا گھومنا چاہتے ہیں۔ لیکن کراچی سے آگے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے۔ نیلم کی اس شوخ مزاجی پر اس کی ماں، سلمٰی اس سے کہتی ہے کہ تم بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو۔ ان جملوں سے ان کی باہمی محبت اور خوشی جھلکتی ہے۔ اختر نیلم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور ان کے بڑے بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ پیار بھرے لہجے میں سلمٰی کی بات کی تائید کرتا ہے۔ جس پر نیلم اس سے خفا ہو کر کہتی ہے کہ آپ بیچ میں مت بولا کریں۔ ان کی آپس کی یہ نوک جھونک دیکھ کر احمد علی مسکراتا ہے اور اپنی بیٹی سے کہتا ہے کہ اختر کیوں نہ بولے اور اس کی ماں یعنی سلمٰی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ تم اس کے سامنے کچھ نہ بول سکو۔

احمد علی ظاہری شرارت سے کہیں زیادہ گہری بات کرتا ہے۔ احمد علی دراصل اپنی بیٹی نیلم کی شادی اختر سے کرنا چاہتا ہے۔ یہاں وہ اسی خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ ایک سنجیدہ بات ہے لیکن وہ خیال رکھتا ہے کہ اس کی بات سے سب کے چہروں پر مسکراہٹ باقی رہے۔

یُوں مُسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یُوں لب کشا ہوئے کہ گلستان بنا دیا (اصغر گونڈوی)

احمد علی کا یہ جملہ محض ایک مذاق نہیں بلکہ باپ کے دل میں بیٹی کے لیے منتخب کیے گئے رشتے کی خاموش منظوری ہے۔ وہ خود اس رشتے پر خوش ہے اس لیے اس نے یہ بات سب کے درمیان محبت، ہنسی اور خوشی کے ماحول میں کی ہے۔

یہ عبارت خاندانی تعلقات کی گرمی اور جذبوں کی صداقت کی ترجمان ہے۔ یہ مشرقی روایت کے ساتھ ساتھ محبت آمیز اندازِ گفت گو کی بھی عمدہ مثال ہے۔ احمد علی کا انداز اختیار سے بھرپور لیکن رشتوں کو جوڑنے والا ہے۔ نیلم اور اختر کے درمیان نوک جھونک ان کے تعلق کی مضبوطی اور قبولیت کا اشارہ دیتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں باپ اپنے دل کی بات مسکراہٹوں میں کہہ جاتا ہے اور ایک نیا رشتہ خاموشی سے قبولیت کا زینہ چڑھنے لگتا ہے۔

عبارت نمبر 6

فقیر حسین: (مسکراتے ہوئے) جو مانگنا ہو سیدھی طرح مانگنا، چکمہ نہ دینا پہلے کی طرح۔
احمد علی: نہیں فقیر حسین! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں، خیر چھوڑو اسے، سعیدہ بیٹی ذرا یہاں آنا۔
(سعیدہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔) تم بھی آؤ خالد بیٹا۔
خالد جی! (اُٹھ کر اس کے پاس بیٹھتا ہے۔) یہاں آؤ بیٹی! میرے پاس۔

سعیدہ: میں یہیں ٹھیک ہوں چچا جان۔
احمد علی: ارے نہیں بھئی تمھیں پتا نہیں میں تمھیں یہاں کیوں بلا رہا ہوں۔ کیوں فقیر حسین؟
(مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ فقیر حسین پہلے مسکراتا ہے پھر غور سے سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔)
فقیر حسین: کیا بات ہے سعیدہ بیٹی؟
سعیدہ: (اٹکتے ہوئے) ابو! چچا جان مجھے جس لیے۔۔۔ اپنے پاس بلا رہے ہیں، مَیں۔۔۔ مَیں۔۔۔ وہ۔۔۔ مَیں نہیں کر سکتی۔
سلمٰی: (حیرت سے) مگر بیٹی! خالد اور تم تو۔۔۔
احمد علی: ہاں بیٹی! تم دونوں تو۔۔۔۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ گھر درکار ہے، جو فقیر حسین کا ہے۔ وہ مختلف حیلے بہانے سے اسے وہ گھر بیچنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فقیر حسین رضامند نہیں ہوتا۔ احمد علی کا بیٹا عابد انھیں بہت پریشان کرتا ہے۔ فقیر حسین کے بیٹے اختر کا جرائم پیشہ دوست رفیق، احمد علی سے ان کی جان چھڑاتا ہے۔ رفیق اپنے ساتھی جہانگیر کی عبرت ناک موت کی وجہ سے اپنے گناہوں کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اور جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اختر، سعیدہ اور سلامت اسے ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ مگر وہ کسی کی نہیں سنتا۔ بالآخر سلامت بھی اس کے ساتھ جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری طرف کہانی کا رخ بدل جاتا ہے۔ احمد علی کی علالت کے باعث فقیر حسین کے ان سے تعلقات بحال ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی رشتے داری کو مزید گہرا کرنے کے لیے اپنے بچوں کی آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ سعیدہ خالد سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اِس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

یہ منظر اس وقت کا ہے جب احمد علی کی تیمارداری کے لیے فقیر حسین اس کے گھر گیا ہے۔ احمد علی پہلے شدید علیل تھا لیکن اب روبہ صحت ہے۔ فقیر حسین کو اپنے گھر میں دیکھ کر احمد علی کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ سارے گھر کا ماحول خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ اس موقع پر احمد علی اپنے بیٹے خالد اور سعیدہ کو اپنے پاس بلا کر ان کی منگنی کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ منظر کی فضا میں محبت، دوستی اور خوشی کے رنگ گھلے ہوئے ہیں۔ خالد اپنے باپ کے پاس جاتا ہے مگر سعیدہ سمجھ جاتی ہے اور انکار کر دیتی ہے۔ اس کے لہجے کی جھجک اور انکار سب کو چونکا دیتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اشاروں کنایوں میں اپنی بیٹی نیلم اور اختر کی شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔ وہ اسے اختر کے سامنے کم بولنے کو کہتا ہے۔ جس پر فقیر حسین نیلم کو اپنے پاس بلاتے ہوئے کہتا ہے کہ تم دونوں میری بیٹی کو کیوں تنگ کر رہے ہو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فقیر حسین بھی اس رشتے پر رضامند ہے۔ نیلم فقیر حسین کے پاس جانے کی بجائے سب کی طرف حیرت سے دیکھتی ہے اور شرما کر کمرے میں چلی جاتی ہے۔ جس سے ماحول مزید خوش گوار ہو جاتا ہے۔ احمد علی اپنے بیٹے خالد کے لیے فقیر حسین کی بیٹی سعیدہ کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہے۔

وہ فقیر حسین سے کہتا ہے کہ: ''میں کچھ مانگنا چاہتا ہوں'' اس کے لہجے میں تردد اور حجاب ہے۔ یہ تردد اس لیے ہے کہ فقیر حسین سے اس کی بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگنا چاہتا ہے۔ کسی بیٹی کے باپ سے براہِ راست ایسی بات کرنے سے پہلے

ایک تمہید باندھنا ہماری معاشرتی روایت ہے۔ فقیر حسین بھی احمد علی کے مزاج کو بھانپ لیتا ہے اور مسکرا کر کہتا ہے: ''جو مانگنا ہو سیدھی طرح مانگنا، چکمانہ دینا پہلے کی طرح۔'' فقیر حسین اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جب احمد علی اس کے مکان پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن فقیر حسین اس کی بات مان کر مکان نہیں بیچ رہا تھا۔ احمد علی نے اسے چکما دینے کی پوری کوشش کی لیکن فقیر حسین اس کی باتوں میں نہ آیا۔ اسی دوران میں ان کی دشمنی ہوگئی اور معاملات خراب ہو گئے۔ احمد علی، فقیر حسین کے مکان پر قبضے میں ناکام رہا۔ بیماری کے بعد اب احمد علی کے فقیر حسین کے ساتھ تعلقات اچھے ہو چکے ہیں اس لیے وہ دونوں اپنے بچوں کے رشتے کا سوچ رہے ہیں۔ فقیر حسین کا اس واقعے کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ احمد علی کی جھجک کم ہو جائے اور وہ اپنے دل کی بات بے تکلفی سے کر لے۔ فقیر حسین کا مزاج دیکھ کر آخر احمد علی اپنے دل کی بات زبان پر لے آتا ہے۔

وہ اپنی خواہش ظاہر کرنے کے لیے فقیر حسین سے کہتا ہے کہ میرا خیال ہے، بھائی فقیر حسین، اب جب کہ اللہ نے ہم سب پر مہربانی کر دی ہے تو میں تم سے بھی کچھ مانگ ہی لوں۔ یعنی وہ اپنی رشتے داری بحال ہونے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سمجھتا ہے اور اسی رحمت کے زیرِ اثر وہ اپنے بچوں کا آپس میں رشتے کرنا چاہتا ہے۔ فقیر حسین اسے بات کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جو مانگنا ہے وہ سیدھی طرح مانگنا پہلے کی طرح دھوکا نہ دینا۔ یعنی وہ احمد علی کی فطرت سے واقف ہونے کی وجہ سے اسے چالاکی سے باز رہنے کو کہتا ہے۔ احمد علی ماضی میں اپنے مفاد کے لیے بہت سے لوگوں کا نقصان کر چکا تھا اور اسی مفاد کی خاطر وہ فقیر حسین کو اس کا گھر بیچنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بہرحال، احمد علی فقیر حسین سے کہتا ہے کہ اس نے یہ تمام چالاکیاں اور دھوکے بازی چھوڑ دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سعیدہ کو اپنے پاس بلاتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے بیٹے خالد کو بھی اپنے پاس بلاتا ہے۔ سعیدہ چوں کہ رفیق سے محبت کرتی ہے اور اس کے دل میں رفیق کے لیے ہمدردی ہے اس لیے وہ حیرت سے سب کی طرف دیکھتی ہے اور احمد علی کے پاس بیٹھنے سے بھی جھجکتی ہوئی کہتی ہے کہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ وہ جانتی ہے کہ احمد علی اسے اپنی بہو بنانے کے ارادے سے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ کیوں کہ وہ خالد سے شادی کرنے کے حق میں نہیں ہے اِس لیے وہ اپنے گھر والوں کا فیصلہ سن کر حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر:

چلنے کا حوصلہ نہیں رُکنا محال کر دیا عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا (پروین شاکر)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ احمد علی کے بے حد اِصرار پر بھی سعیدہ اس کے پاس نہیں بیٹھتی۔ جس پر وہ مسکراتے ہوئے سعیدہ سے کہتا ہے کہ تمھیں معلوم ہی نہیں ہے میں تمھیں اپنے پاس کیوں بلا رہا ہوں۔ سعیدہ کے بار بار انکار کرنے پر فقیر حسین اس سے پوچھتا ہے کہ کیا بات ہے بیٹی۔ فقیر حسین کے پوچھنے پر سعیدہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے اور خالد سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کا یہ موقف سن کر سب حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ احمد علی اور اس کی بیگم سلمٰی اس سے پوچھتے ہیں کہ تم اور خالد تو ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جس پر سعیدہ کہتی ہے کہ وہ دور اور تھا۔ اب وہ خالد کی بجائے رفیق کو اپنانا چاہتی ہے۔

اس اقتباس کا اختتام ایک گہرے جذباتی لمحے پر ہوتا ہے۔ سعیدہ کا نرم لہجہ، ہچکچاہٹ اور اس کے لفظوں کی لڑکھڑاہٹ اس کی باطنی کشمکش کی غمازی کرتی ہے۔ وہ خالد سے رشتے سے انکار تو کر دیتی ہے مگر یہ انکار کسی غرور یا غصے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک باوقار قربانی کا اظہار ہے۔ اس کا جملہ **''چچا جان مجھے جس لیے اپنے پاس بلا رہے ہیں، میں۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ وہ نہیں کر سکتی''** ایک سادہ سا جملہ ہے جو اس کے دل کی بات کو اچھی طرح ظاہر کر رہا ہے۔ اس کے لہجے میں ایک عزم چھپا ہے۔ وہ رفیق کے کردار میں مثبت تبدیلی کی وجہ سے اس کا ساتھ دینا چاہتی ہے۔

مصنف نے اس نازک جذبے کو بیان کرنے کے لیے سعیدہ کے تاثرات، اس کی خاموشی اور ٹوٹے پھوٹے جملوں کا سہارا لیا ہے۔ وہ واضح نہیں ہونے دیتے کہ سعیدہ کس لیے انکار کر رہی ہے۔ ماحول کی فضا، کرداروں کے مکالموں اور سعیدہ کی جھجک سے سب کچھ خود بخود ظاہر ہوتا ہے۔ کرداروں کی گفت گو ماحول اور ان کے جذبات سے مکمل ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

عبارت نمبر 7

فقیر حسین: (حیرت سے) خالد کو تو تم بہت پسند کرتی ہو بیٹی۔

سعیدہ: خالد بہت اچھے ہیں ابو! بہت اچھے، مگر آپ کہا کرتے ہیں نا ابو کہ کسی دوسرے کے لیے کچھ کرنا ہو تو اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر سے اپنے حصے سے کچھ کاٹ کر اسے دینا پڑتا ہے۔

فقیر حسین: ہاں ہاں بیٹی!

سعیدہ: مَیں نے بھی یہی سوچا ہے ابو۔ ہم سب کے پاس سب کچھ ہے۔ آرام، سکون، توجہ خوشی، محبت۔ لیکن ایک شخص ایسا ہے ابو جس کے پاس ان میں سے ایک بھی چیز نہیں۔ بالکل اکیلا ہے وہ۔

فقیر حسین: (حیرت سے) کس کی بات کر رہی ہو بیٹی؟

اختر: (چند لمحے سعیدہ کے تذبذب کو دیکھتا ہے اور ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔) رفیق؟ تم رفیق کی بات کر رہی ہو نا؟

(سعیدہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) مگر سعیدہ۔۔۔ رفیق۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ مکان درکار ہوتا ہے۔ جو فقیر حسین کا ہے۔ وہ اپنا مکان بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے احمد علی کا بیٹا عابد انھیں کافی پریشان کرتا ہے۔ اختر کا دوست رفیق جو خود زمینوں پر ناجائز کرتا ہے وہ احمد علی سے ان کی جان چھڑاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھی جہانگیر کی عبرت ناک موت کی وجہ سے رفیق اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ سلامت، اختر اور سعیدہ اس کے اس فیصلے پر رضامند نہیں ہوتے لیکن وہ پھر بھی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین کی باہمی کشیدگی ختم ہو جاتی ہے۔ احمد علی اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''وبلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

تشریح طلب عبارت اس منظر کو سامنے لاتی ہے جب سعیدہ، خالد کے ساتھ رشتے سے انکار کر دیتی ہے اور سب پر حیرت چھا جاتی ہے۔ باپ کے پوچھنے پر سعیدہ اشاروں اور مہذب الفاظ میں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کسی کے لیے قربانی دینا چاہتی ہے۔ اس کے اندازِ گفت گو سے ماحول میں ایک سوالیہ سکوت چھا جاتا ہے۔ اختر سعیدہ کی الجھن کو سمجھتے ہوئے اس کی مدد کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا تم رفیق کی بات کر رہی ہو؟ سعیدہ اثبات میں سر ہلا دیتی ہے اور ایک نیا انکشاف سامنے آتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ سعیدہ کا انکار سن کر سب حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فقیر حسین اس سے کہتا ہے کہ بیٹی تم تو خالد کو پسند کرتی تھی۔ جس کے جواب میں وہ کہتی ہے کہ خالد بہت اچھے ہیں ابو! بہت اچھے، مگر آپ کہا کرتے ہیں نا ابو کہ کسی دوسرے کے لیے کچھ کرنا ہو تو اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر سے اپنے حصے کو کاٹ کر اسے دینا پڑتا ہے۔ یہ جملے ایک جذباتی المیے کو بیان کرتے ہیں۔ جہاں ایک طرف والدین کی خواہش، عزت اور فرماں برداری ہے تو دوسری طرف دل کی سچائی، محبت اور خوشی۔ یعنی وہ پہلے خالد کو ہی پسند کرتی تھی۔ لیکن رفیق کی نیک نیتی اور باطن میں موجود سچائی اسے یہ فیصلہ کرنے پر

مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خالد کو چھوڑ کر رفیق کو اپنائے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے والد کے سامنے اس کے جملے دہراتی ہے کیوں کہ اس کے نزدیک اگر وہ رفیق کو نہیں اپنائے گی تو بھری دنیا میں کوئی بھی اس کے جرائم سے بھرے ماضی کی وجہ سے اسے قبول نہیں کرے گا۔ اس لیے اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کے لیے ضروری ہے کہ رفیق کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فقیر حسین سے کہتی ہے کہ کسی کے لیے کچھ کرنا ہو تو اپنے حصے سے کچھ کاٹ کر اسے دینا پڑتا ہے۔ بقول شاعر:

یہی ہے عبادت یہی ہے دین و ایماں کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں (الطاف حسین حالی)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ سعیدہ کی بات سے فقیر حسین اتفاق کرتا ہے۔ لیکن سعیدہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔ وہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مزید وضاحت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم سب کے پاس سب کچھ ہے۔ آرام، سکون، توجہ، خوشی، محبت۔ لیکن ایک ایسا شخص ہے ابو جس کے پاس ان میں سے ایک چیز بھی نہیں ہے۔ بالکل اکیلا ہے وہ۔ فقیر حسین اپنی بیٹی کی بات سمجھ نہیں پاتا اور اس سے پوچھتا ہے کہ وہ کس کی بات کر رہی ہے۔ اختر دونوں باپ بیٹی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا ہوتا ہے۔ وہ نہایت پریشانی اور تجسس سے اپنی بہن سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے ''تم رفیق کی بات کر رہی ہو نا؟'' جس پر سعیدہ ہاں میں سر ہلاتی ہے اور تصدیق کرتی ہے کہ واقعی وہ رفیق کے بارے میں بات کر رہی ہے۔

دراصل سعیدہ کی زبان سے ادا ہونے والا ہر ایک جملہ اس کے اندر موجود احساس، ہمدردی، قربانی اور انسانیت سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

حقیقت کا کہے جو حال، کرا ایسی زباں پیدا محبت کے سنیں جو گیت، ایسے کان پیدا کر

(سیماب اکبرآبادی)

وہ یہ سوچتی ہے کہ دنیا میں سب کو خوشی اور سکون میسر ہونا چاہیے۔ خالد سے زیادہ رفیق جیسے تنہا شخص کو اس کے ساتھ کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس نے گناہوں کی زندگی کو ترک کر کے نیکی کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے جیل جانے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ لہٰذا ان تمام عناصر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سعیدہ خالد کی بجائے رفیق سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ نیز وہ رفیق جیسے بے سہارا کو سہارا دینے کے لیے خود کو پیش کرتی ہے۔ اس کے الفاظ میں ایک گہری انسانیت پرستی اور خلوص ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی کی دولت، رتبے یا ظاہری حالات سے متاثر ہونے کی بجائے اس کے درد کو محسوس کرتی ہے اور اس کی زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش رکھتی ہے۔ بقول شاعر:

آدمی کا آدمی ہر حال میں ہمدرد ہو اک توجہ چاہیے انساں کو انساں کی طرف

(حفیظ جونپوری)

اس عبارت میں سعیدہ کا کردار بہت جان دار اور جرأت مندانہ نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس کے خالد کے ساتھ رشتے سے انکار کو بہت باوقار اور سلجھے ہوئے طریقے سے پیش کیا ہے۔ سعیدہ کے لہجے میں کوئی تلخی، کوئی بغاوت اور کوئی شکایت نہیں۔ اس کے انکار کے پیچھے ایک گہری سوچ، خلوصِ نیت اور انسانیت کا درد نظر آتا ہے۔ وہ اپنے باپ کی بات کا بھرم بھی رکھتی ہے اور اپنی بات بھی دھیمے لہجے اور سلیقے کے ساتھ واضح کرتی ہے۔

مصنف نے سعیدہ کے کردار کو بہت بلند دکھایا ہے۔ اس کے کردار میں روایتی نسوانی جذباتیت کے بجائے وقار اور سلیقہ نظر آتا ہے۔ اس عبارت میں مصنف کے اسلوب کی گہرائی، فکری پختگی اور لطافت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

عبارت نمبر 8

سعیدہ: تم تو اسے جانتے ہو اختر! ہم سب سے زیادہ جانتے ہو۔ وہ پڑھا لکھا نہیں۔ شکل سے گنوار لگتا ہے۔ اس کا ماضی داغ دار ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس کی اپنی مرضی سے نہیں ہوا۔ اتنی اذیت اور تکلیف دیکھنے کے باوجود اگر کسی آدمی کے اندر انسان زندہ رہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے اختر، حفاظت کرنی چاہیے اس کی۔

اختر: ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔

احمد علی: کون ہے یہ رفیق؟

عابد: ڈیڈ! یہ وہی ہے جس نے مجھے سردار جہانگیر کی قید سے نکالا تھا۔

سلمٰی: کیا کرتا ہے؟

عابد: مگر سعیدہ! وہ تو۔۔۔ اختر بتا رہا تھا کہ HE IS UNDER ARREST (سعیدہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) تو۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔

سعیدہ: کسی اور کو ہونہ ہو، ہمیں تو پتا ہے عابد کہ اس نے جو کچھ کیا، کیوں کیا تھا۔ اگر ایک گناہ گار توبہ کر لے، کفارہ ادا کر دے اپنے جرموں کا، سزا بھگت لے اپنی غلطی کی، تو کیا اس کے بعد بھی معاشرہ اسے قبول نہ کرے!

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں آپس میں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری مفاد پرست شخص ہے۔ اسے اپنے نئے تعمیر کردہ پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ مکان کی ضرورت پڑتی ہے، جو کہ فقیر حسین کا ہے۔ وہ اسے اپنا مکان بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جس پر اس کا بیٹا عابد فقیر حسین کے گھر والوں کو بہت پریشان کرتا ہے۔ اختر کا دوست رفیق زمینوں پر ناجائز قبضہ کرنے والے گروہ کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ عابد سے ان کی جان چھڑانے میں مدد کرتا ہے۔ جہانگیر کی عبرت ناک موت کے باعث رفیق اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے وہ جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ رفیق کے ساتھ اس کا دوست سلامت بھی خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری طرف دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات بہتر ہو جاتے ہیں۔ احمد علی اپنی رشتے داری کو مزید مضبوط بنانے کے لیے اپنے بیٹے خالد کے لیے سعیدہ کا ہاتھ مانگتا ہے۔ جس پر سعیدہ سب کے سامنے انکار کر کے رفیق کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ فقیر حسین سعیدہ کو سمجھاتا ہے کہ اگر تم نے رفیق کو سہارا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اسے رحم کا احساس نہ ہونے دینا۔ احسان کے اظہار سے برکت ضائع ہو جاتی ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

اس عبارت میں سعیدہ، خالد کے ساتھ رشتے سے انکار کی وجہ بتا رہی ہے۔ وہ رفیق سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ عابد اسے رفیق کے بارے میں بتاتا ہے کہ وہ زیرِ حراست ہے۔ لیکن سعیدہ کو رفیق اس لیے پسند ہے کہ وہ ماضی کے گناہوں پر نادم ہے اور ان سے توبہ کر چکا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ ایسے شخص کا ساتھ دینا ایک اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔ وہ رفیق میں نیکی اور سچائی کی وہ جھلک دیکھتی ہے جسے اکثر لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ سعیدہ اختر سے کہتی ہے کہ تم رفیق کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو۔ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے شکل سے گنوار لگتا ہے۔ اس کا ماضی داغ دار ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس کی مرضی سے نہیں ہوا۔ اتنی اذیت اور تکلیف دیکھنے کے باوجود اگر کسی آدمی میں انسانیت زندہ رہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔ دراصل سعیدہ کی باتیں اصلاح، توبہ اور انسانیت کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس کا ہر ایک لفظ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ماضی کی برائیوں کے باوجود، اگر کوئی شخص سچی توبہ کرے اور نیکی کی راہ اختیار کرے تو اسے موقع ضرور دینا چاہیے۔ ہمارے دین میں بھی ایسے لوگوں کو خوب سراہا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''
(سورۃ البقرہ: آیت نمبر:222)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

''مگر جو شخص توبہ کرے، ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور جو توبہ کرے اور نیک عمل کرے، وہ حقیقت میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے جیسا کہ رجوع کرنے کا حق ہے۔'' (سورۃ الفرقان آیت نمبر:68 تا 71)

سعیدہ کے ذریعے مصنف نے ہمارے معاشرے میں موجود اس بات کی عکاسی کی ہے کہ معاشرہ ہمیشہ لوگوں کے ماضی کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے اور اس کے سدھر جانے کی کوششوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اصل انسان وہی ہے جو مشکل حالات اور برے اعمال سے نکل کر اپنی گناہوں بھری زندگی ترک کر کے نیکی کی راہ پر گامزن ہو۔ اس کے باوجود کہ رفیق ان پڑھ ہے اور اس کا ماضی بھی داغ دار ہے۔ سعیدہ ان تمام چیزوں کو نظر انداز کر کے صرف اس بنیاد پر اسے اپنانا چاہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس لیے سعیدہ اختر سے کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی تمام برائیوں سے توبہ کر کے نیکی کا راستہ اختیار کرے تو اسے ماضی کی بنیاد پر رد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس کی حفاظت کرنی چاہیے، اور اسے خود کو ثابت کرنے کا ایک موقع دینا چاہیے۔ ان تمام باتوں کے پیشِ نظر وہ خالد کی بجائے رفیق سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ بقول شاعر:

؎ درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں
(خواجہ میر درد)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ سعیدہ کی زبانی رفیق کا تذکرہ سن کر احمد علی اس سے پوچھتا ہے کہ کون ہے رفیق۔ جس پر اس کا بیٹا عابد اسے بتاتا ہے کہ رفیق وہ ہے جس نے اسے جہانگیر کے قبضے سے آزاد کرایا تھا۔ دراصل احمد علی اور اس کا بیٹا دونوں کاروباری تھے اور شہر میں مختلف جگہوں پر پلازے بناتے تھے۔ جہانگیر کا تعلق ایک ایسے گروہ سے تھا جو زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں عابد اور جہانگیر کا ایک تنازعہ ہو جاتا ہے اور وہ اسے یرغمال بنا لیتا ہے۔ اس سلسلے میں رفیق ان کی مدد کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کا تعلق بھی جرائم کی دنیا سے ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عابد کو جہانگیر کی قید سے آزاد کراتا ہے۔ سلمٰی پوچھتی ہے کہ رفیق اب کیا کرتا ہے۔ لیکن کوئی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ عابد سعیدہ سے کہتا ہے کہ تم رفیق کو اپنانا چاہتی ہو، لیکن اختر بتا رہا تھا کہ وہ تو جیل میں ہے۔ جس پر سعیدہ اسے ہاں میں جواب دیتی ہے اور اپنے فیصلے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ کسی اور کو معلوم ہو یا نہ ہو، ہمیں معلوم ہے کہ رفیق نے جو بھی گناہ کیے ہیں وہ اس نے اپنی خوشی سے نہیں کیے۔ بلکہ مجبوری کے تحت کیے ہیں۔ غربت، طاقت ور لوگوں کا زور اور معاشرتی مسائل انسان کو گناہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنی خوشی سے گناہوں پر آمادہ نہیں ہوتا۔ وقت اور حالات اسے مجرم بنا دیتے ہیں۔ اس لیے اگر رفیق دوبارہ نیکی کی طرف آنا چاہتا ہے تو ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ایک شخص اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور اپنے گناہوں کی سزا بھی بھگت لے پھر بھی معاشرہ اس کے ماضی کے گناہوں کی وجہ سے اسے قبول نہ کرے تو یہ اس شخص کے ساتھ زیادتی ہے۔ سعیدہ کے نزدیک ایسے لوگوں کا ساتھ دینا ہی انسانیت ہے۔ بقول شاعر:

؎ بُرائی کے علاوہ بھلائی بھی ہوتا ہے ہر آدمی میں کوئی دوسرا بھی ہوتا ہے (انور شعور)

اس عبارت میں مصنف انسانی ہمدردی اور اصلاحِ معاشرہ کا ایک فکر انگیز زاویہ پیش کرتے ہیں۔ یہاں سعیدہ کا کردار ایک پُر اعتماد انسان کا ہے جو معاملات کو گہری نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی گفت گو میں سچائی، ہمدردی اور شعور ہے۔ سعیدہ کے مکالموں میں نرمی، احساس اور ایثار کا جذبہ نمایاں ہے۔ عبارت کے آخر میں سعیدہ کے الفاظ صرف ایک شخص کی حمایت نہیں بلکہ اس نظام کے خلاف احتجاج ہیں جو توبہ کے بعد بھی انسان کو گناہوں کے سائے سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔

عبارت نمبر ۱

احمد علی: کیوں نہیں کرے بیٹی۔ مگر اس کے لیے تم۔ تم کیوں؟

سعیدہ: اس لیے چچا جان کہ اس تصویر کا یہ رخ صرف ہم لوگوں نے دیکھا ہے۔ اگر ہم اُسے معاف نہیں کر سکتے تو باقی دنیا کیسے کرے گی۔ (فقیر حسین کی طرف دیکھتی ہے۔)
میں نے ٹھیک کہا ہے نا ابو!

فقیر حسین: تم نے بہت اچھا سوچا ہے بیٹی، لیکن اگر تم نے اسے سہارا دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اُسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ تم نے اس پر رحم کھا کر اسے قبول کیا ہے۔ احسان کے اظہار سے اس کی برکت زائل ہو جاتی ہے، بیٹی!

سعیدہ: مجھے اس کا احساس ہے ابو! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ (وہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لگتی ہے۔) مجھے شاید یہ بات اس طرح نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ابو! مجھے معاف کر دیجیے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ احمد علی اور فقیر حسین دونوں آپس میں چچازاد بھائی ہیں۔ احمد علی کاروباری شخص ہے۔ اسے اپنے پلازے میں سینما بنانے کے لیے ملحقہ مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ حسین کا ہے۔ احمد علی اور اس کا بیٹا عابد زبردستی وہ مکان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اختر کا دوست رفیق جو ایک جرائم پیشہ شخص ہے وہ ان کی مدد کرتا ہے۔ جہانگیر کی عبرت ناک موت کے بعد رفیق اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور خود کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کے ساتھ سلامت بھی اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جیل جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری طرف کہانی میں نیا موڑ آتا ہے۔ احمد علی کی علالت کے باعث فقیر حسین اس کی تیمارداری کرتا ہے اور ان کے باہمی تعلق دوبارہ خوش گوار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی رشتے داری کو مزید بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے اپنے بچوں کی آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ لیکن سعیدہ رفیق کی نیک نیتی کی وجہ سے خالد کی بجائے رفیق سے شادی کرنے کا فیصلہ سناتی ہے۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے۔ اِس لیے اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

امجد اسلام امجد اردو کے مشہور شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں عام انسان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ڈراموں میں وہ معاشرتی سچائیوں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ اور حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ ''دہلیز'' ان کا اہم ڈرامہ ہے جس میں معاشرتی ناانصافی اور انسانی رویوں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔

یہ منظر اس لمحے کا ہے جب سعیدہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے اور خالد کے بجائے رفیق کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ رفیق کے ماضی کو جانتے ہوئے سب لوگ سعیدہ کے فیصلے پر حیران ہوتے ہیں۔ سعیدہ کے دل میں رفیق کے لیے جو ہمدردی اور قبولیت کا جذبہ ہے وہ اس پر قائم رہتی ہے۔ فقیر حسین اس کے فیصلے کی تائید کرتا ہے اور اسے ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتا ہے۔

جب سعیدہ نے بتایا کہ وہ رفیق کو پسند کرتی ہے کیوں کہ اس نے جرائم سے توبہ کر لی ہے تو سب کو حیرت ہوئی۔ سعیدہ کہتی ہے کہ کیا اگر کوئی شخص اپنے جرائم کی سزا بھگت لے اور گناہوں سے توبہ کر لے تو پھر بھی معاشرہ اسے قبول نہ کرے تو احمد علی کہتا ہے کہ ایسا شخص قابلِ تحسین ہے لیکن تمھیں اس کا ساتھ دینے کی کیا ضرورت ہے؟۔ اس کے لیے تمھیں قربانی دینے کی ضرورت کیوں ہے؟ سعیدہ کہتی ہے کہ ''اگر ہم اسے معاف نہیں کر سکتے تو باقی دنیا کیسے معاف کرے گی۔'' اس بات سے سعیدہ کی اخلاقی ذمہ داری کا احساس جھلکتا ہے۔

مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا — وہ پیر ہیں مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں (علامہ اقبالؒ)

سعیدہ احمد علی سے کہتی ہے کہ چچا جان صرف ہم نے رفیق کا یہ رُخ دیکھا ہے کہ کیسے گناہوں کی دنیا سے بیزار ہو کر اس نے توبہ کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے جیل جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اپنے آپ کو خود سزا دینا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہم اس کی زندگی کی تمام مشکلات سے واقف ہیں۔ تصویر کا یہ رخ صرف ہم لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس لیے اگر ہم اسے معاف نہیں کریں گے تو باقی دنیا اسے کیسے معاف کرے گی۔ اس کی طرف محبت کا پہلا قدم ہمیں ہی بڑھانا ہوگا۔ فقیر حسین خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے اور وہ اسے مخاطب کر کے کہتی ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا ابو! جس پر فقیر حسین نہایت حکمت بھرے لہجے اور انداز میں اس سے کہتا ہے کہ تم نے بہت اچھا سوچا ہے بیٹی لیکن اگر تم نے اسے سہارا دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اسے یہ احساس کبھی نہ ہونے دینا کہ تم نے اس پر ترس کھا کر ایسا کیا ہے۔ کیوں کہ جب انسان کسی پر کیا گیا احسان جتانے لگے تو اس سے نہ صرف سامنے کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے بلکہ اس کی نیکی کی قدر و قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ سچی مدد وہی ہوتی ہے جس میں دوسروں کی عزت اور خودداری کا مکمل خیال رکھا جائے۔

آدمی کا آدمی ہر حال میں ہمدرد ہو — اِک توجہ چاہیے انساں کو انساں کی طرف (حفیظ جونپوری)

قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ میں بھی احسان کی بہت فضیلت آئی ہے۔ اسلام میں احسان یعنی نیکی، بھلائی اور حسنِ سلوک کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

ترجمہ: ''بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

احسان انسان کے دل کو پاکیزگی، سکون اور قربِ الٰہی عطا کرتا ہے۔ احسان کرنے والے کو لوگ پسند کرتے ہیں اور اس کو ہر جگہ عزت ملتی ہے۔ احسان کرنے سے معاشرہ نرم مزاج، ہمدرد اور پرامن بنتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں بہترین جزا کی خوش خبری دی گئی ہے۔

لیکن طرح احسان کرنا بہت فضیلت کی بات ہے لیکن احسان جتانا ایک کمتر اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ احسان جتانے سے نیکی ضائع ہو جاتی ہے اور آدمی اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس پر احسان جتایا جائے اس کا دل دکھی ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں بھی احسان جتا کر کسی کا دل دکھانے کی سخت مذمت آئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو'' (بقرہ:264)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کے بعد احسان جتانا نیکی کی قدر و قیمت کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی لیے فقیر حسین بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

''احسان کے اظہار سے اس کی برکت زائل ہو جاتی ہے۔''

سعیدہ اپنے باپ کی باتیں نہایت غور سے سنتی ہے اور جواب میں کہتی ہے کہ مجھے آپ کی کہی ہوئی ہر بات کا احساس ہے۔ رفیق کو منتخب کرنے کے بعد میں کبھی اسے یہ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ میں نے اس جیسے مجرم کو قبول کر کے اس کے ساتھ احسان کیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی بات مکمل کر کے فقیر حسین کے گلے لگ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے یہ بات اِس طرح نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مشرقی لڑکیوں کی یہ خوبی سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے باپ، بھائی کے سامنے اپنی پسند کا اظہار نہیں کرتیں۔ لیکن سعیدہ ہمت کر کے اپنے دل کی بات تمام لوگوں کو بتا دیتی ہے۔ پھر اس کے بعد فقیر حسین سے معافی مانگ کر اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ اسے یہ بات ایسے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ جملہ سعیدہ کی عقل مندی کو ظاہر کرتا ہے۔

اس عبارت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر کوئی اپنی اصلاح کا ارادہ کر لے اور سچے دل سے اپنے گناہوں اور جرائم سے توبہ کر لے تو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ ایسے شخص کی عزتِ نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس عبارت میں مصنف نے نہایت سادگی سے مگر دل کو چھو لینے والے انداز میں دکھایا ہے کہ کس طرح ایک نادم اور تائب شخص کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے۔ فقیر حسین کی باتیں معاشرتی دانش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سعیدہ کا ردِعمل ایک حساس بیٹی اور باحوصلہ عورت کے کردار کی عکاسی کرتا ہے۔

مشقی سوالات

سوال نمبر:۱۔ مختصر جواب دیں۔

۱۔ ''استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔'' متن کے مطابق یہ بات کس کردار نے کس کے بارے میں کہی؟

جواب۔ ''استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔'' متن کے مطابق یہ بات سلامت نے رفیق کے بارے میں کہی تھی۔

۲۔ جب اختر نے رفیق کا نام لیا تو سعیدہ نے رفیق کے بارے میں کن جذبات کا اظہار کیا؟

جواب۔ جب اختر نے رفیق کا نام لیا تو سعیدہ نے بے چین ہو کر چاروں طرف دیکھا اور کہا ''کہاں گیا وہ۔۔۔ رفیق صاحب''

۳۔ ''ضمیر پر بوجھ لے کر آزاد رہنے سے چند سال کی جیل کاٹ لینا بُرا سودا نہیں۔'' اس جملے کی وضاحت سیاق وسباق کے حوالے سے کریں۔

جواب۔ ''ضمیر پر بوجھ لے کر آزاد رہنے سے چند سال کی جیل کاٹ لینا بُرا سودا نہیں۔'' اس جملے میں رفیق کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اپنے گناہوں پر نادم ہے اور قانون کے مطابق ان کی سزا پانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی قانون شکنی کی پاداش میں خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے تا کہ اس کے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ضمیر کا بوجھ جیل سے بڑی سزا ہے۔

۴۔ فقیر حسین نے بیٹی کو کیا نصیحت کی؟

جواب۔ فقیر حسین نے بیٹی کو نصیحت کی کہ وہ کبھی رفیق کو اپنے احسان کا احساس نہ ہونے دے۔

۵۔ ڈراما دہلیز کے اہم کرداروں کا تعارف کروائیں۔

جواب۔
احمد علی: ایک کاروباری دولت مند شخص۔
جہانگیر: ایک ظالم وڈیرہ جو لوگوں کی جائیداد پر قبضہ کر لیتا ہے۔
فقیر حسین: احمد علی کا چچازاد بھائی جو نہایت خوددار اور غیرت مند ہے۔
سعیدہ: فقیر حسین کی سمجھ دار اور باشعور بیٹی۔
اختر: فقیر حسین کا بیٹا اور رفیق کا دوست۔
سلامت: رفیق کا چیلا۔ اختر کا دوست۔
رفیق: اختر کا دوست، بظاہر بدمعاش لیکن نیک فطرت۔
نیلم: احمد علی کی شریر بیٹی، اختر کی منگیتر۔
سلمیٰ: احمد علی کی بیوی۔
خالد: احمد علی کا بیٹا جو سعیدہ کو پسند کرتا ہے۔
عابد: احمد علی کا بیٹا جو اپنے باپ کی طرح، جہانگیر کے ساتھ مل کر قبضے کرتا تھا۔

سوال نمبر:۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ متن کے مطابق ڈرامے کا سب سے متحرک اور مرکزی کردار ہے۔

الف۔ رفیق ب۔ سعیدہ ج۔ خالد د۔ فقیر حسین

۲۔ ''دہلیز'' اصناف ادب کے لحاظ سے ہے:

الف۔ ناول ب۔ ڈراما ج۔ داستان د۔ افسانہ

۳۔ رفیق جرم کی دنیا میں گھر ا رہا:

الف۔ دس سال ب۔ بارہ سال ج۔ چودہ سال د۔ سولہ سال

۴۔ رفیق نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا:

الف۔ دوسروں کو سبق سکھانے کے لیے ب۔ خود کو چھپانے کے لیے
ج۔ جرم کی دنیا سے بچنے کے لیے د۔ ضمیر کا بوجھ اتارنے کے لیے

۵۔ بیماری سے صحت یاب ہوا:

الف۔ عابد ب۔ خالد ج۔ اختر د۔ احمد علی

۶۔ ''انصاف ہی کے لیے تو میں یہ سب کر رہا ہوں سلامے!'' اس جملے میں ''سلامے'' اسم علم کے مطابق ہے۔

الف۔ کنیت ب۔ عرف ج۔ تخلص د۔ خطاب

جوابات

۱	سعیدہ	۲	ڈراما	۳	بارہ سال	۴	ضمیر کا بوجھ اتارنے کے لیے	۵	احمد علی
۶	عرف								

سوال نمبر:۳۔ متن کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ اگر تم نے .....کی دال روٹی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔
۲۔ فقیر حسین پہلے .....ہے پھر غور سے سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔
۳۔ رفیق چند لمحے دروازے میں رک کر .....کی طرف دیکھتا ہے۔
۴۔ آج میں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے پیدل ساری .....میں گھوم جاؤں۔
۵۔ احسان کے .....سے اس کی برکت زائل ہو جاتی ہے۔

جوابات

۱	جیل	۲	مسکراتا	۳	سعیدہ	۴	دنیا	۵	اظہار

سوال نمبر:۴۔ آپ کے نزدیک ڈراما ''دہلیز'' کا سب سے فعال کردار کون سا ہے؟ اپنی بات کی وضاحت میں دلائل دیں۔

جواب۔ ڈراما ''دہلیز'' کا سب سے فعال کردار ''سعیدہ'' ہے۔ وہ ایک متحرک اور حساس کردار ہے۔ وہ معاملہ فہم اور سمجھ دار ہے۔ وہ لوگوں کے جذبات کو سمجھ سکتی ہے اور اس پر بروقت ردعمل دے سکتی ہے۔ وہ کٹھ پتلی نہیں بلکہ خود مختار ہے۔ وہ اپنے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے کی جرات رکھتی ہے اور یہ فیصلے لوگوں سے منوانے کا فن بھی جانتی ہے۔ ایک طرف وہ برائی اور ناانصافی کے خلاف کھڑی ہو سکتی ہے تو دوسری طرف اچھائی اور نیکی کا ساتھ دینے کے لیے مشکل سے مشکل قدم بھی اٹھانے کو تیار ہے۔ وہ ایک مودب بیٹی، قابلِ احترام بہن، اچھی دوست اور وفادار شعار ساتھی ہے۔

سوال نمبر:۵۔ طلبہ دینی اور اخلاقی تناظر میں توبہ کی فضیلت بیان کریں۔

جواب۔ توبہ کا مطلب ہوتا ہے پناہ مانگنا، مغفرت چاہنا، کسی بُری عادت کو چھوڑ دینا۔ توبہ تزکیہ نفس اور ضمیر کے اطمینان کے لیے سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مذہبی طور پر توبہ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کو بہت پسند فرماتا ہے۔ توبہ کرنے والے کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے توبہ کرنے والے کی تعریف فرماتا ہے۔

اگر اخلاقی تناظر میں دیکھا جائے تو توبہ معاشرے میں امن اور اطمینان کی ضامن ہے۔ اس سے معاشرے میں برائی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ جب کوئی برا شخص اپنے برے اعمال سے توبہ کرتا ہے تو معاشرے میں اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ انسان کا اخلاق بہت مضبوط ہوتا ہے اور وہ پُر اعتماد طریقے سے لوگوں سے میل جول رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں اس کی عزت اور وقار بڑھ جاتا ہے۔

سوال نمبر:۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

گزشتہ ہفتے ہمارے کالج کی طرف سے تفریحی مقام کی سیر کا انعقاد کیا گیا اور سیر کا مرکز ''مری'' کی وادی اور اس کا قرب و جوار طے پایا۔ ہمارے تمام اساتذہ نے مل کر تمام انتظامات ترتیب دیے، بسوں کا انتظام کیا۔ ۳۰/جون ۲۰۲۵ء کو صبح ۹ بجے تک تمام طلبہ کالج میں جمع ہو کر بذریعہ کوسٹر سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر چار گھنٹے کا تھا۔ میں نے اور میرے تمام دوستوں نے خوب مزے کیے۔ راستے میں ایک مسجد کے سامنے نماز ظہر ادا کرنے کے لیے کوسٹر روکی گئی۔ ہم سب نے باوضو ہو کر نماز ادا کی۔ مسجد کے قریب ہی ایک ڈھابا تھا۔ طلبہ نے وہاں سے گرما گرم پکوڑے، سموسے کھائے اور لطف اندوز ہوئے۔ کوسٹر دوبارہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئی اور دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم مری پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہمیں مری کی مال روڈ کی سیر کا موقع میسر آیا جہاں اردگرد کی دکانوں سے ہم نے خشک میوہ جات کے ساتھ ساتھ

اور بھی بہت سی چیزیں خریدیں۔ مال روڈ کے بعد ہم نے وادیٔ مری کی معروف گلیوں کی سیر کی۔ ہم گھوڑا گلی، چھانگلہ گلی اور تھیا گلی بھی گئے یہاں کا دل کش ٹھنڈا موسم ہمیشہ یاد رہے گا۔ مری میں ہمارا قیام مال روڈ کے کنارے ایک خوب صورت ہوٹل میں تھا۔ جب ہم سیر سپاٹے سے تھک گئے تو ہوٹل کا رخ کیا۔ ایک رات آرام کے لیے ہوٹل کے چند کمرے کرائے پر لیے گئے تھے۔ باقی دوستوں کی طرح میں بھی تکاوٹ سے چُور اپنے کمرے میں جاتے ہی لیٹ گیا اور صبح کہیں جا کے میری آنکھ کھلی۔ تمام طلبہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے اساتذہ کے ہمراہ ناشتا کیا۔ گیارہ بجے تک مزید سیر کا وقت مختص تھا۔ وقت مقررہ پر تمام لوگ ہوٹل میں اکٹھے ہوئے اور اپنا سامان باندھ کر واپسی کے لیے بارہ گربس میں سوار ہو گئے۔ اس سفر میں ہمیں اپنے اساتذہ کی قربت بھی نصیب رہی اور تفریح کا موقع بھی میسر آیا۔ مجھے یہ تفریحی دورہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

سوالات:

۱۔ **عبارت میں کس سفر کی روداد بیان کی گئی ہے؟**

جواب۔ عبارت میں کالج کی طرف سے مری اور اس کے گردونواح کے تفریحی سفر کی روداد بیان ہوئی ہے۔

۲۔ **سفر کے اختتام پر طلبہ کہاں پہنچے؟**

جواب۔ سفر کے اختتام پر طلبہ ہوٹل میں پہنچ گئے۔

۳۔ **اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔** جواب۔ ''مری کی سیر''

۴۔ **مال روڈ سے کس چیز کی خریداری کی گئی؟**

جواب۔ مال روڈ سے خشک میوہ جات اور بہت سی چیزیں خریدی گئیں۔

۵۔ **سیر وسیاحت کے لیے کون سی تاریخ مقرر تھی اور سفر کا آغاز کس وقت ہوا؟**

جواب۔ سیر وسیاحت کے لیے ۳۰/جون کی تاریخ مقرر تھی اور سفر کا آغاز صبح ۹ بجے ہوا۔

زبان شناسی:

حروف کی اقسام: اردو میں حروف کی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے حرف بیان، حرف تاکید اور حرف علت کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ مزید چند ایک حروف کی اقسام درج ذیل ہیں:-

حروف جار: وہ حروف ہیں جو اسما اور افعال کو آپس میں ملاتے ہیں۔ مثلاً: میں، سے، پر، تک، ساتھ، اوپر، نیچے، لیے، آگے، وغیرہ۔

حروف اضافت: وہ حروف ہیں جو اسموں کے باہمی تعلق اور ملکیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اردو میں کا، کے، کی حروف اضافت ہیں۔

حروف عطف: وہ حروف ہیں جو اسموں یا جملوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ مثلاً: و، اور، نیز، پھر، بھی وغیرہ۔

حروف استفہام: وہ حروف ہیں جو کچھ پوچھنے یا سوال کرنے کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: کیا، کیوں، کہاں، کب، کون، وغیرہ۔

حروف تشبیہ: وہ حروف ہیں جو کسی چیز کو دوسری کے مانند قرار دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً: مانند، طرح، جیسا، وغیرہ۔

سوال نمبر:۷۔ حروف کے نام کالم ''الف'' میں جب کہ ان کی مثالیں کالم ''ب'' مین درج ہیں، کالم ''ج'' میں مثال کے مطابق حروف کے نام لکھیے:

کالم (الف)	کالم (ب)	کالم (ج) جوابات
حروف جار	جیسا	پر
حروف اضافت	کہاں	کا
حروف عطف	کا	اور
حروف استفہام	اور	کہاں
حروف تشبیہ	پر	جیسا

سوال نمبر:۸۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں۔ آزردگی، کفارہ، انتظام، چکمہ، اذیت

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
آزردگی	آزُردَگی	کفارہ	کَفّارَہ	انتظام	اِنتِظام	چکما	چَکّما
اذیت	اَذِیّت						

سوال نمبر:۹۔ سبق ''دہلیز'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب۔ دیکھیے سبق کا خلاصہ

مکالمہ لکھنا:

مکالمہ کے لغوی معنی ہیں کلام، کلام کرنا۔ اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ افراد کے مابین کسی موضوع سے متعلق گفت گو کرنے کو مکالمہ کہتے ہیں۔ اچھا مکالمہ وہ ہے جس میں روز مرہ بات چیت کا انداز اور بے تکلف لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہو، جو حقیقی زندگی کے قریب ہو اور انداز گفت گو میں مخاطب کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھا گیا ہو۔ مکالمہ میں تمام کردار اپنی شخصیت، اپنے خیالات و تصورات کا اظہار عمدہ گفت گو سے کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت اور کرداروں کی سیرت اور فطرت کی واضح تصویر کشی کے لیے مکالمے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

سوال نمبر:۱۰۔ ''جدید ذرائع ابلاغ کی اہمیت'' کے موضوع پر تین طلبہ کے درمیان مکالمہ تحریر کریں اور جماعت میں پیش کریں۔

جواب۔ عملی کام (راہ نمائی کے لیے دیکھیے حصہ مکالمہ نویسی)

سوال نمبر:۱۱۔ طلبہ مل کر قرارداد پاکستان کو رول پلے کے انداز میں پیش کریں۔

جواب۔ عملی کام

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

۱۔ **اُردو شاعر، ڈراما نگار اور گیت نگار تھے:**

(الف) مجید امجد (ب) امجد اسلام امجد (ج) ن م راشد (د) اختر شیرانی (ب)

۲۔ **امجد اسلام امجد نے کتابیں لکھیں:**

(الف) بیس سے زائد (ب) تیس سے زائد (ج) چالیس سے زائد (د) پچاس سے زائد (ج)

۳۔ **امجد اسلام امجد کی پیدائش _____ کو لاہور میں ہوئی:**

(الف) 4۔اگست 1944ء (ب) 8۔اگست 1947ء

(ج) 10۔اگست 1948ء (د) 14۔اگست 1950ء (الف)

۴۔ **امجد اسلام امجد نے بی۔اے کیا:**

(الف) گورنمنٹ کالج سے (ب) اورینٹل کالج سے (ج) اسلامیہ کالج سے (د) سول لائن کالج سے (ج)

۵۔ **امجد اسلام امجد نے ایم۔اے اُردو کیا:**

(الف) اسلامیہ یونی ورسٹی سے (ب) زکریا یونی ورسٹی سے (ج) سرگودھا یونی ورسٹی سے (د) پنجاب یونی ورسٹی سے (د)

۶۔ **امجد اسلام امجد نے اپنے کیریئر کا آغاز استاد کی حیثیت سے کیا:**

(الف) ایم اے او کالج سے (ب) پنجاب یونی ورسٹی سے (ج) اسلامیہ کالج سے (د) سول لائن کالج سے (الف)

۷۔ **امجد اسلام امجد پاکستان ٹیلی وژن نیٹ ورک کے ڈائریکٹر رہے:**

(الف) 1960ء تا 1965ء (ب) 1975ء تا 1979ء (ج) 1980ء تا 1985ء (د) 1990ء تا 1994ء (ب)

۸۔ **امجد اسلام امجد کو اُردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر بنا دیا گیا:**

(الف) 1989ء (ب) 1992ء (ج) 1994ء (د) 1998ء (الف)

۹۔ **امجد اسلام امجد کی شخصیت پر تقریباً تنقیدی کتابیں لکھی جا چکی ہیں:**

(الف) سات سے زائد (ب) دس سے زائد (ج) بارہ سے زائد (د) پندرہ سے زائد (ب)

۱۰۔ **امجد اسلام امجد کو تمغائے حسنِ کارکردگی ملا:**

(الف) 1985ء میں (ب) 1987ء میں (ج) 1989ء میں (د) 1992ء میں (ب)

۱۱۔ **امجد اسلام امجد کو ستارۂ امتیاز ملا:**

(الف) 1998ء میں (ب) 2000ء میں (ج) 2002ء میں (د) 2004ء میں (الف)

12۔ امجد اسلام امجد کو ہلالِ امتیاز ملا:
(الف) 2019ء میں (ب) 2020ء میں (ج) 2022ء میں (د) 2023ء میں (د)

13۔ امجد اسلام امجد کی وفات ہوئی:
(الف) 10۔فروری 2019ء (ب) 10۔فروری 2021ء (ج) 10۔فروری 2022ء (د) 10۔فروری 2023ء (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ سبق دہلیز کے مصنف کا نام ہے:
(الف) احمد ندیم قاسمی (ب) انتظار حسین (ج) امجد اسلام امجد (د) غلام عباس (ج)

2۔ سبق دہلیز کی صنف ہے:
(الف) ڈرامہ (ب) افسانہ (ج) ناول (د) داستان (الف)

3۔ سبق دہلیز ماخوذ ہے:
(الف) دن (ب) فشار (ج) وارث (د) دہلیز (د)

4۔ ڈرامہ دہلیز کے کردار ہیں:
(الف) دس (ب) بارہ (ج) چودہ (د) سولہ (ج)

5۔ احمد علی کے پلازے کا نقشہ فائنل کرنے والا ہے:
(الف) ریحان (ب) رحمان (ج) عرفان (د) ذیشان (ب)

6۔ ایک نئے پلازہ کی تعمیر کر رہا ہے:
(الف) رحمٰن (ب) محمد علی (ج) سعید (د) احمد علی (د)

7۔ احمد علی کا بیٹا ہے:
(الف) عابد (ب) شاہد (ج) زاہد (د) راشد (الف)

8۔ احمد علی کا رشتہ کا بھائی ہے:
(الف) خادم حسین (ب) عابد حسین (ج) فقیر حسین (د) محمد حسین (ج)

9۔ فقیر حسین کی بیٹی ہے:
(الف) عابدہ (ب) سعیدہ (ج) زاہدہ (د) شاہدہ (ب)

10۔ اختر طالب علم ہے:
(الف) فرسٹ ایئر (ب) سیکنڈ ایئر (ج) تھرڈ ایئر (د) فورتھ ایئر (د)

11۔ احمد علی شہر میں ایک _____ کی تعمیر کا منصوبہ بنا رہا ہے:
(الف) سنیما (ب) پلازے (ج) تھیٹر (د) فیکٹری (ب)

12۔ احمد علی کو پلازے کے متعلق بریفنگ دینے آتا ہے:
(الف) احسان (ب) رحمان (ج) ذیشان (د) اذلان (ب)

13۔ کتنی زمین میسر آجائے تو ایک عدد سنیما گراؤنڈ فلور پر تعمیر ہو جائے گا؟
(الف) دو سو گز (ب) تین سو گز (ج) چار سو گز (د) پانچ سو گز (د)

14۔ مطلوبہ زمین پر بنا مکان ہے:
(الف) احمد حسین کا (ب) فقیر حسین کا (ج) محمد حسین کا (د) زاہد حسین کا (ب)

15۔ فقیر حسین احمد علی کا ہے:
(الف) بھائی (ب) ہمسایہ (ج) رشتے کا بھائی (د) ماموں زاد (ج)

16۔ احمد علی کا بیٹا فقیر حسین سے اپنی تمام ہٹ دھرمی، زور زبردستی سے مکان لینے کی ضد کرتا ہے:
(الف) زاہد (ب) عابد (ج) شاہد (د) مہد (ب)

17۔ رحمان کہتا ہے کہ سنیما ہونا چاہیے:
(الف) گراؤنڈ فلور پر (ب) فرسٹ فلور پر (ج) سیکنڈ فلور پر (د) تھرڈ فلور پر (الف)

18۔ اختر اور سعیدہ جاتے ہیں:
(الف) سلامت کے ڈیرے پر (ب) جہانگیر کے ڈیرے پر (ج) رفیق کے ڈیرے پر (د) احمد کے ڈیرے پر (ج)

19۔ اختر خوش خبری دیتا ہے:
(الف) سلامت کو (ب) احمد علی کو (ج) عابد کو (د) رفیق کو (د)

20۔ آگ میں جل کر مر جاتا ہے:
(الف) سردار تجمل (ب) سردار جہانگیر (ج) سردار زوار خاں (د) سردار وزیر خاں (ب)

21۔ خود کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے:
(الف) عابد (ب) احمد علی (ج) خالد (د) رفیق (د)

22۔ رفیق کہتا ہے کہ شریف آدمی بننے کے لیے مجھے سارے بوجھ اتارنے ہوں گے:
(الف) سر سے (ب) گردن سے (ج) کندھے سے (د) پیٹھ سے (ب)

23۔ رفیق نے جرائم کیے:
(الف) پانچ سال تک (ب) دس سال تک (ج) بارہ سال تک (د) چودہ سال تک (ج)

24۔ رفیق اپنے گناہوں کا ادا کرنا چاہتا ہے:
(الف) معاوضہ (ب) کفارہ (ج) صدقہ (د) صلہ (ب)

25۔ نیلم بیٹی ہے:
(الف) احمد علی کی (ب) فقیر حسین کی (ج) رفیق کی (د) رحمان کی (الف)

26۔ احمد علی کی بیوی کا نام ہے:
(الف) عظمیٰ (ب) شاہدہ (ج) زاہدہ (د) سلمیٰ (د)

27۔ خالد بیٹا ہے:
(الف) فقیر حسین کا (ب) احمد علی کا (ج) رحمان کا (د) رفیق کا (ب)

28۔ سعیدہ شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے:
(الف) خالد کے ساتھ (ب) سلامت کے ساتھ (ج) رفیق کے ساتھ (د) رحمان کے ساتھ (ج)

سبق:۱۱ تاریخ کا کفن

مُصنف
امر جلیل
پیدائش: 8 نومبر 1936ء

مصنف کا تعارف

امر جلیل کا اصل نام قاضی عبدالجلیل ہے۔ وہ سندھ کے شہر روہڑی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی اور پھر نواب شاہ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کراچی یونی ورسٹی سے اکنامکس اور تاریخ کے مضامین میں ماسٹرز کیے۔ سندھی اور انگریزی زبان میں افسانے، ڈرامے، مضامین اور کالم لکھ کر شہرت حاصل کی۔ اب تک ان کی بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

امر جلیل نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے زمینداروں، وڈیروں اور جعلی پیروں کو افسانوی انداز میں پیش کیا۔ امر جلیل نے ہمیشہ جمہوریت کے حق میں اور آمریت کے خلاف لکھا۔ سندھی زبان میں ان کے متعدد ناول اور افسانے چھپ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں کے تراجم مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعوں میں ''دل جی دنیا''، ''جدھن مان نہ ھوندس''، ''تاریخ کا کفن'' وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بہت سے پاکستانی اور عالمی اعزازات اپنے نام کر چکے ہیں جن میں پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ اور کمالِ فن ایوارڈ شامل ہیں۔

امر جلیل کو بچپن ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ انھوں نے پہلی کتاب اس وقت لکھی جب ان کی عمر فقط دس سال تھی۔ اس کے علاوہ انھیں کرکٹ کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ چناں چہ وہ ایک عرصہ تک مقامی سطح پر فرسٹ کلاس کرکٹ میں بطور بیٹس مین اور وکٹ کیپر کھیلتے رہے۔

امر جلیل نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان کراچی سے کیا جہاں سے ان کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ اسلام آباد میں انھوں نے ملازمت کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں میں کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر کراچی شفٹ ہو گئے مگر پڑھنے لکھنے کا شوق بدستور جاری رہا۔

امر جلیل نہایت محنتی شخص ہیں۔ انھوں نے اپنی ضعیف العمری کا کبھی خیال نہیں کیا اور آج کل بھی پاکستان کے مختلف اخباروں بالخصوص ''ڈان'' اور ''دی نیشن'' میں حالاتِ حاضرہ پر کالم لکھتے ہیں، اس کے علاوہ سندھ ٹیلی وژن پر بطور اینکر پرسن بھی کام کرتے ہیں۔ شامل نصاب افسانہ ''تاریخ کا کفن'' میں امر جلیل نے سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تقسیم کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ افسانہ سندھی زبان سے اُردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے مترجم ننگر چنا سندھ کے ممتاز دانش ور، شاعر، ترقی پسند ادیب اور باکمال ترجمہ نگار ہیں اُنھوں نے اُردو، پشتو، سرائیکی اور سندھی ادب کے شہ پارے ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچائے ہیں۔

یہ سبق پڑھنے کے بعد طلبہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ:

- ☆ طلبہ کو فنِ افسانہ نگاری سے آگاہ کرنا۔
- ☆ طلبہ کو امر جلیل کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات بالخصوص سندھی ادب سے روشناس کرانا۔
- ☆ طلبہ پر طبقاتی نظام کی بدصورتی کو آشکار کرنا۔
- ☆ طلبہ کے دِلوں میں افلاس اور غربت کے مارے لوگوں کی مدد اور احترام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔
- ☆ طلبہ کو باور کرانا کہ علاقائی ادب کے مطالعہ سے قومی وحدت کو استحکام اور پاکستانی ثقافت میں دل کشی پیدا ہوتی ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی

نمبر (81) کالا کلوٹا: (حد درجہ سیاہ فام شخص، نہایت کالا آدمی)، نحیف ونزار: (بہت زیادہ کمزور اور لاغر)، چیتھڑے پہنے ہوئے: (پھٹے پُرانے کپڑوں میں ملبوس شخص)، ادھیڑ عمر: (جوانی کے اختتام اور بڑھاپے کے آغاز کی عمر، جوانی اور بڑھاپے کے بیچ کی عمر)،

طویل قامت: (قد وقامت میں لمبا، دراز قد، بلند قامت، بہت اونچا)، پُشت: (جسم کا پچھلا حصہ، شانوں سے لے کر ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے تک، پیٹھ)، اُجلا: (صاف ستھرا، سفید)، عقیدت: (کسی بات کو درست اور برحق جان کر اس پر دل جمانا، دل کا بھروسہ، اعتقاد، ارادت، خلوص ومحبت)، جوش وخروش: (بہت زیادہ ولولہ یا ہیجان، جوش کی زیادتی)، زیر و بم: (نشیب وفراز، اونچ نیچ، اتار چڑھاؤ)، سیدھے سبھاؤ: (آہستگی سے، نرمی اور ملائمت سے، آسانی سے)، بیدار: (جاگتا ہوا، ہوشیار جو سویا ہوا نہ ہو)، مؤدب: (آدابِ مجلس سے واقف، تہذیب یافتہ، مہذب، تربیت یافتہ)، وعظ: (نصیحت، تلقین، ہدایت، مذہبی نصیحت جو زبانی کی جائے)، کبھی کبھار: (کبھی کبھی، بعض اوقات، کسی روز)، اونگھ: (نیند سے آنکھیں بند ہونے اور نیم غافل ہونے کی کیفیت، نیم خوابی کی سی حالت، غنودگی)، مُصلّیٰ: (نماز پڑھنے کی جگہ، جائے نماز، بوریا، دری وغیرہ جس پر نماز پڑھی جائے)، ٹخنا: (ایڑی اور پنجہ کے بیچ کا حصہ، پاؤں کے نیچے کا حصہ)، قہر: (آفت، قیامت، شامت، مصیبت، غضب)، کنگال: (نادار، مفلس، قحط زدہ، تباہ حال)،

نمبر (82) احمق: (بے وقوف، ناسمجھ، جس میں بات کو سمجھنے کی صلاحیت کم ہو یا نہ ہو)، کورا: (نیا، سادہ، صاف)، پُراسرار: (پوشیدہ، چھپا ہوا، جس میں کچھ راز یا بھید ہو)، بپھرنا: (غصے میں بھرنا، جھلانا، غضب ناک ہونا، قابو سے باہر ہو جانا)، ابھرنا: (سطح سے نمایاں ہونا، آس پاس کی نسبت اٹھا ہوا یا پھولا ہونا)، سُنا اَن سنا کرنا: (سُن کر ٹال دینا، کسی بات کی پروا نہ کرنا)، حقارت آمیز: (ذلت اور اہانت سے بھرا ہوا)، ٹولی: (چند افراد کا گروہ، چھوٹی جماعت، جتھا)، قہقہہ: (زور سے ہنسنا، بلند آواز سے ہنسنا، ٹھٹھا)، فی البدیہہ: (بے سوچے، فوراً، برمحل)، ناتواں: (کمزور، ضعیف، جس میں اُٹھنے کی سکت نہ ہو)، شیرینی: (مٹھائی، حلاوت، خوش گواری، مٹھاس)، بٹنا: (تقسیم ہونا)

نمبر (83) کھلبلی: (شورش، ہلڑ، بھگدڑ، افراتفری، ہلچل، وہ اضطراب جو کسی پریشان کن امر یا حادثے کی وجہ سے پیدا ہو)، نگہداشت: (نگرانی، حفاظت، نگہبانی)، شترمرغ: (صحرائے افریقہ وعرب کے ایک پرند کا نام جو بعض اعضا میں اونٹ سے مشابہ ہے)، جھپٹنا: (حملہ کرنا، چھیننا، ہاتھ مارنا)، پُرحشمت: (شان وشوکت والے، رعب ودبدبہ والے)، نڈر: (بے خوف آدمی، بے باک، دلیر، بہادر)، شوروغل: (چیخ وپکار)، زینہ: (سیڑھی، اونچائی پر جانے کا ذریعہ، وسیلہ)، تماشا: (نمائش، دکھاوا، کرتب، سیر و تفریح، نظارا، کھیل)، مخلوق: (دنیا کے لوگ، دنیا والے، بہت سے لوگوں کا مجمع، پیدا کیا ہوا)، وھیان: (توجہ، التفات)، انواع: (قسمیں، اقسام)، بدھنی: (عیاش، بدکار، زنا کار)، بدمعاش: (وہ شخص جس کی روزی بُرے کاموں پر منحصر ہو۔ حرام خور، اوباش، بُرے چلن کا)، ٹھُنڈا: (بازاری آدمی، بدوضع، بے نام ونگ، بدمعاش، غنڈہ)

نمبر (84) ہلہ: (حملہ، شوروغل)، بے رونق: (بے لطف، افسردہ، بغیر چہل پہل ہونا)، لفنگا: (بدمعاش، اوباش، شیخی باز)، لوارث: (مسافر، نیا آنے والا، ناواقف، اجنبی)، ٹھکائی: (مار پیٹ، زدوکوب)، رخنہ: (رکاوٹ، خلل، سوراخ، دراڑ)، بحث و مباحثہ: (باہم گفت گو، تکرار، باہم بحث کا عمل)، حشر: (قیامت، روزِ حساب، بُرا انجام یا نتیجہ، دُرگت)، ہر دل عزیز: (سب کا پیارا، مقبول عام)، معروف: (پہچانا ہوا، مشہور، معلوم)، لاحق ہونا: (چمٹنا، لپٹنا، وابستہ ہونا، لگنا)، بدبخت: (بدقسمت، مصیبت زدہ، جس کی قسمت میں تکلیف اور رنج ہو)، ایجنٹ: (کسی شخص یا ادارے کا نمائندہ، گماشتہ یا وکیل، دلال)، انکشاف: (کسی بات کا اظہار، کھلنا، ظاہر ہونا، کھولنا)، حواس باختہ: (گھبرایا ہوا، ہکا بکا، حیران وپریشان، بے اوسان)، پھلانگنا: (چھلانگ مارنا، پھاندنا)

نمبر (85) دوزانو: (گھٹنوں کے بل، دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھنا)، عقب: (پیچھے، پیٹھ پیچھے)، برجستہ: (برمحل، موزوں، مناسب)، چوکس: (اپنے کام میں ہوشیار، خبردار، چوکنا)، فیفہ: (پاجامے کے گھیرے کا وہ حصہ جس میں ازار بند ڈالتے ہیں)، عرش: (چھت، تخت، آسمان)، مترنم: (خوش آواز میں گانے والا، گنگنانے والا، سریلا)، پنڈلی: (ٹانگ کا وہ حصہ جو ٹخنے کے اوپر ہوتا ہے، ٹخنے اور زانو کے بیچ کا حصہ)، ریلا: (پانی کا دھارا، بہاؤ، رَو)، چاق وچوبند: (مضبوط، تگڑا، قوی، چست، پھرتیلا)، پیشانی: (ماتھا، جبیں)، زیروزبر: (الٹ پلٹ کرنا، درہم برہم کرنا، تباہ وبرباد کرنا)

تمبیر 86 رستا: (بہنا، ٹپکنا)، **تنومند:** (موٹا تازہ، قوی، ہاتھ پاؤں کا مضبوط)، **شکستہ:** (بوسیدہ، پرانا، پریشان، تھکا ہارا)، **لنگور:** (ایک قسم کا بندر جس کا منھ کالا اور دم لمبی ہوتی ہے، یہ عام بندر سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے)، **عمل دار:** (حاکم، سردار، عامل)، **نحیف:** (کمزور، ناتواں)، **ڈھونگ:** (جھوٹ، فریب، دھوکا، دکھاوا)، **درگت بنانا:** (بری حالت کرنا، ذلیل کرنا، مارنا پیٹنا)، **حافظہ:** (یاد رکھنے کی قوت، یادداشت، یاد)، **اُدھ موا:** (نیم جان، مرنے کے قریب، تباہ حال، کمزور)

توضیحات

بنجر: ایسی زمین جس پر کوئی بھی فصل کاشت نہ کی جاسکے، بنجر زمین کہلاتی ہے۔

صلیب: صلیب یا چلیپا ایک آلہ جس پر چڑھا کر پرانے زمانے میں مجرموں کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا تھا۔ یہ آلہ لکڑی کے دو تختوں یا پھٹوں سے اس طرح بنایا جاتا تھا کہ ایک پھٹا دوسرے کو +، T یا X کی شکل میں منقطع کرتا تھا۔

کمان: تیر چلانے کا قوسی شکل کا آلہ، ایک قدیم ترین غیر آتش حربہ جو بانس کے لچک دار لمبے ٹکڑے کے دونوں گوشوں میں ڈوری یا تانت باندھ کر بنایا جاتا اور جس کے ذریعے تیر یا غلہ نشانے پر مارتے تھے۔

دھنک: دھنک یا قوسِ قزح فطرت کا ایک مظہر ہے۔ جس میں بارش کے بعد فضا میں موجود پانی کے قطرے ایک منشور کی طرح کام کرتے ہیں۔ جب ان میں سے سورج کی شعاعیں گزرتی ہیں تو سات رنگوں میں بدل جاتی ہیں اور یوں آسمان کے اوپر ایک ست رنگی کمان یا دھنک بن جاتی ہے۔ اسے قوسِ قزح بھی کہتے ہیں۔

ذوالجناح: پروں والا، حضرت امام حسینؓ کے گھوڑے کا نام جس پر جنگِ کربلا میں آپؓ سوار تھے۔

تارکول: ایک سیاہ سیّال اور لیس دار مادہ جو لکڑی اور پتھر کے کوئلے جیسی چیزوں سے نکالا جاتا ہے اور گھن اور زنگ سے بچاؤ کے لیے لکڑی اور لوہے پر لگایا جاتا ہے، سڑکوں کی تعمیر میں سڑکوں پر بچھایا جاتا ہے اور چھتوں پر بھی ڈالا جاتا ہے تاکہ چھت پانی سے محفوظ ہو جائے۔

بن مانس: انسانی صورت سے مشابہ بندر، گوریلا، جنگلی وحشی انسان۔

ابلیس: شیاطین کے سردار کا نام جو قومِ جن سے تھا اور تسبیح و تحلیل کی بنا پر صفِ ملائکہ میں شامل تھا، جب ملائکہ کو حکم ملا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو اس نے سرتابی کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردودِ بارگاہِ الٰہی ٹھہرا۔ سب سے نافرمان فرد جس نے آدم علیہ السلام کو ورغلا کر جنت سے نکلوایا۔ (مجازاً) انسانوں کو بہکانے اور راہِ راست سے ہٹانے والا، شیطان۔

ہجرت: اس کا لفظی مطلب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا ہے، اسلامی اصطلاحات میں بھی یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

تیس مار خان: وہ شخص جس نے تیس جانور یا آدمی مارے ہوں۔ مُراد ہے بہادر آدمی، کارِ نمایاں انجام دینے والا۔ طنز کے طور پر اس شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جو بہادری کے سلسلہ میں بہت زیادہ شیخی دکھائے۔

ابابیل: سیاہ پر اور سفید سینے کی چھوٹی سی چڑیا، یہ پرانے گنبدوں، مسجدوں، کھنڈروں اور تاریک عمارتوں میں گارے سے پیالے کی طرح گھونسلا بنا کر رہتی ہے اور اسے نرم نرم پروں یا روئی سے سجاتی ہے۔ یہ غول در غول نکلتی، فضا میں چکر لگاتی اور اڑتے ہوئے ہوائی کیڑے کھاتی ہے۔

منبر: جس کی جمع منابر ہے۔ لکڑی یا اینٹوں وغیرہ کی وہ سیڑھی جیسی کرسی جس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر امام یا واعظ خطبہ پڑھتا ہے یا تقریر کرتا ہے، چبوترا جس پر کھڑے ہو کر تقریر کی جائے۔ وعظ یا خطبہ کے لیے مخصوص نشست گاہ۔

شیدی: سیدی یا حبشی ایک سیاہ فام نسلی گروہ ہے جو جنوبی پاکستان کے سندھ اور بلوچستان صوبوں میں آباد ہے۔ شیدیوں کی ایک

چھوٹی سی تعداد بھارت میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر جنوب مشرقی افریقہ اور ایتھوپیا کے زنج ساحل کے بنتو لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی اکثریت عرب اور برطانوی غلاموں کی تجارت کے ذریعے برصغیر پاک و ہند میں پہنچی۔

ایاز: سلطان محمود غزنوی کا محبوب غلام اور مُشیر، پورا نام ابوالنجم ایاز۔ باوجود قرب سلطانی کے اس کی زندگی بڑی سادہ اور کفایت شعارانہ تھی۔ وہ زمانہ قرب سلطانی سے پیشتر کا مفلسانہ لباس بطور یادگار اپنے پاس صندوق میں محفوظ رکھے رہتا اور جب کبھی اس یادگار کو ملاحظہ کرتا تو "ایاز قدرِ خود بشناس" کہتا۔ یعنی ایاز تو اپنی ماضی کی حیثیت کو بھول نہ جانا۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ وزیر آباد کے قریب سوہدرہ کا قصبہ اسی ایاز نے آباد کیا تھا۔ 1036ء کے لگ بھگ لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا اور یہیں وفات پائی۔ اس کا مزار چوک رنگ محل میں ہے۔

سبق کا خلاصہ

عید نماز شروع ہونے سے پہلے ایک کالا کلوٹا ادھیڑ عمر کا طویل قامت شخص، جس کا نام شیدی تھا، نمازیوں کی آخری صف سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک بلند نگاہ عید گاہ پر ڈالی۔ شیدی کے بال خشک، آنکھیں بنجر، بدن نحیف و نزار اور کپڑوں کے نام پر چیتھڑے پہنے ہوئے تھے۔

پوری عید گاہ کراچی کے طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نمازیوں کی بے شمار قطاریں تھیں۔ عید نماز شروع ہونے میں چند لمحات باقی تھے۔ مُلّا بے حد عقیدت اور جوش و خروش سے اسلامی تاریخ کے واقعات سنا رہا تھا۔ وہ آواز کے زیر و بم کے ساتھ لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عید گاہ میں موجود نمازی دورانِ وعظ کبھی کبھار اونگھ لیتے تھے۔ کچھ کی نگاہیں اپنے جوتوں اور کچھ کی نگاہیں اپنے بچوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ واعظ لوگوں کو اللہ کے رحم و کرم کی بجائے اللہ کے قہر اور عذابِ قبر سے ڈرا رہا تھا۔

اسی دوران میں ایک کنگال دبلے پتلے شخص نے شیدی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا کہ کھڑے کیوں ہو؟ تمھاری بندریا بھاگ گئی ہے کیا؟ شیدی اس سے بازو چھڑا کر پچھلی صف سے اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں ایک شخص نے اسے کہنی مارتے ہوئے کہا کہ آدمی ہو کہ تارکول؟ شیدی نے اس کا بھی جواب نہیں دیا اور اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اگلی صف میں شیدی کی ٹانگ پر چٹکی کاٹتے ہوئے ایک سفید لباس میں ملبوس شخص نے کہا "آدمی ہو کہ ابنِ ابلیس! میرا دینی کا مصلّیٰ میلا کر دیا۔ وہ اس کو بھی جواب نہیں دیتا اور اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ نیز شیدی لوگوں کی قہر آلود نظروں اور طنزیہ باتوں اور نفرت آمیز لہجوں کی پروا کیے بغیر قدم اٹھاتا، چھلانگیں مارتا، نمازیوں کی دو چار قطاریں پھلانگ جاتا ہے۔

لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے جو اونگھ رہے تھے وہ بیدار ہو جاتے ہیں۔ جو بیدار تھے، کانوں سے وعظ سن رہے تھے اور آنکھوں سے اپنے بچوں اور جوتوں کی حفاظت کر رہے تھے، گردنیں پھیر کر شیدی کی طرف دیکھنے لگے۔ شور سنتے ہی لوگوں نے اپنے جوتے اٹھا لیے اور بچوں کو گود میں بٹھا لیا۔ کچھ پُر حشمت بہادروں نے شیدی کو پکڑ لیا۔ ملا نے وعظ بند کر دیا اور منبر کے اونچے زینے پر کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے لگا۔ سب کی توجہ کا مرکز شیدی بن گیا۔ کچھ نے کہا چور ہے۔ کچھ نے کہا جیب کترا۔ کچھ نے کہا بدمعاش اور کچھ نے کہا شہدا۔ بولیاں سب کی جدا تھیں مگر مفہوم سب کا ایک تھا۔

اتنے میں ایک شخص ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا۔ خدوخال سے مفلس معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا کہ میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چور نہیں ہے نہ ہی جیب کترا اور نہ ہی لفنگا ہے۔ یہ صرف شیدی ہے۔ لیکن وہاں موجود نیک بندوں نے اسے حقیر جانتے ہوئے اس شخص کی بات نہیں سنی اور شیدی کو مارنا شروع کر دیا۔ کچھ نے کہا اس کی اچھی طرح ٹھکائی کرو۔ کچھ نے کہا کہ اس کی تلاشی لو۔ اس کو درخت سے باندھ دو۔ اس کا منھ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دو۔ اس کا جلوس نکالا جائے۔ شیدی کی سزا کے متعلق لوگ آپس میں بحث و مباحثہ کرنے لگے۔

پہلی صف میں موجود ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت، مشہور و معروف جناب محمود صاحب موجود تھے۔ لوگوں کو

ان کی حفاظت کی فکر لاحق ہوگئی۔ ہجوم میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا کہ شیدی کسی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے اور محمود صاحب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس لیے یہ پہلی صف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پہلی صف کے عقب میں، محمود صاحب کی حفاظت کے لیے برجستہ اور طاقت ور ارکان بیٹھے ہوئے تھے۔ شیدی جب دوسری صف کو پھلانگ کر پہلی صف میں جانے لگا تو اُنھوں نے وہیں شیدی کو قابو کرلیا۔ وہ اسے لاتیں، ٹھڈے، مکے اور گھونسے مارتے عیدگاہ سے باہر لے گئے۔

لاؤڈ سپیکروں پر ملا کی آواز گونجنے لگی۔ وہ عاجزی، انکساری کے ساتھ محمود صاحب کی لمبی عمر کی دعا مانگنے لگا۔ تمام لوگ شیدی کو بھول کر محمود صاحب کی لمبی عمر کی دعا مانگنے اور وعظ سننے لگے۔

حفاظتی عملہ شیدی کو عیدگاہ سے باہر ایک علیحدہ جگہ لے جاتا ہے۔ ایک بڑے افسر نے بید کی چھڑی سے شیدی کو مارتے ہوئے پوچھا کہ بتاؤ، جواب دو، کس نیت سے پہلی صف کی طرف بڑھ رہے تھے؟ ان کے مکوں، گھونسوں اور تھپڑوں کے سبب شیدی کا پورا چہرہ خونم خون ہوگیا تھا۔ وہ اسے مارتے جاتے اور پوچھتے جاتے۔ بتاؤ کس کے ایجنٹ ہو؟ مار پیٹ اور تشدد کے باعث شیدی کی ناک سے خون کے ریلے بہنے لگے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ خون کی کلی کر کے منھ کو پھٹی قمیض کے بازو سے پونچھ کر کمزور آواز میں جواب دیتا ہے کہ میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔ اس کے جواب پر سب قہقہے لگاتے ہیں اور اسے دوبارہ بے دردی سے پیٹنے لگتے ہیں۔ شیدی فرش پر گر جاتا ہے۔ وہ اسے اُٹھا کر کھڑا کرتے ہیں اور اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہیں۔ شیدی خون آلود آنکھوں سے حفاظتی عملے کی طرف دیکھتا ہے اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

مرکزی خیال

سبق ''تاریخ کا کفن'' میں مصنف نے شیدی اور محمود، ان دو علامتی کرداروں کے ذریعے ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار کو بیان کیا ہے، جہاں شیدی جیسے غریب، مفلس اور لاچار انسان کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ شہر کی معزز شخصیات کے ساتھ پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھ سکے۔ اس سبق میں مصنف نے معاشرے میں موجود عدم مساوات، ناانصافی، طبقاتی برتری اور غریبوں کا استحصال جیسی معاشرتی برائیوں کو بیان کیا ہے جو ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق وسباق لکھ سکتے ہیں۔)

عید کی صبح، عیدگاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ وہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے لوگوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی صف میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ شہر کے معززین اور سرکاری افسران بھی موجود ہیں۔ جب وہ پہلی صف کے قریب پہنچتا ہے تو محمود صاحب کے محافظ اُسے چور اور دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر پکڑ کر عیدگاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ شیدی کو اس بے دردی سے مارتے ہیں جس سے اس کا چہرہ خونم خون ہوجاتا ہے۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ پہلی قطار کی طرف کیوں اور کس نیت سے بڑھ رہے تھے؟ لاتیں، مکے، گھونسے کھا کر وہ زمین پر گر جاتا ہے۔ ایک افسر اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ شیدی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں جواب دیتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

عبارت نمبر 1

عید نماز شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک کالا کلوٹا شیدی، جس کے بال خشک، آنکھیں بنجر، بدن نحیف ونزار اور کپڑوں کے نام پر چیتھڑے پہنے ہوئے تھے؛ وہ نمازیوں کی آخری صف سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر کا طویل قامت شخص تھا۔ اس کے کندھے صلیب کی طرح سیدھے اور سینہ چوڑا تھا۔ اس کی پشت زندگی کا بوجھ اُٹھاتے، برداشت کرتے کمان بن چکی تھی۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر ایک اڑتی نگاہ عیدگاہ پر ڈالی۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے۔ اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں سب صفوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پہلی صف میں موجود شہر کے مشہور ومعروف محمود صاحب کے محافظ اُسے چور اور دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر عید گاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ اسے نہایت بے دردی سے مارتے پیٹتے ہیں۔ شیدی زمین پر گر جاتا ہے۔ ایک افسر اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے اس سے پوچھتا ہے تم کون ہو اور محمود صاحب کے ساتھ پہلی صف میں نماز کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟ جس پر وہ اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں جواب دیتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف عیدگاہ میں موجود شیدی کا حلیہ بتا رہے ہیں۔ شیدی غربت، مفلسی اور بے بسی کا مارا ہوا ایک شخص ہے۔ اس کی زندگی محرومیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا کالا کلوٹا رنگ، خشک بال، بنجر آنکھیں، کمزور بدن اور بوسیدہ کپڑے اس کے حالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ عید کے دن بھی وہ عیدگاہ میں اسی حالت میں آیا ہوا ہے۔ عید کا دن خوشیوں اور مسرتوں کا دن ہے۔ اس دن ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے۔ ہر شخص نئے اور خوش بودار کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ مگر شیدی کی آنکھوں میں چمک ہے نہ اس کے لباس میں خوش بو۔ اس کے بدن میں تازگی بھی نہیں۔ اس کے بدن پر لباس نہیں محض چیتھڑے ہیں جو اسے عید کے دن میسر ہیں۔

ے بے زری فاقہ کشی مفلسی بے سامانی ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے (نظیر اکبرآبادی)

عید کا دن ہے اور ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے۔ ہر کسی نے نیا لباس اور نئے جوتے پہن رکھے ہیں۔ بچے نئے کپڑوں میں خوشی سے جھوم رہے ہیں۔ ہر چہرے پر خوشی اور تازگی ہے۔ لوگ خوش بو میں بسا لباس زیب تن کیے ایک دوسرے کو گلے لگا رہے ہیں۔ ایسے میں شیدی جیسے افراد کے لیے عید کا دن بھی عام دنوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ ایسے افراد کے لیے عید کا دن بھی ان کی غربت اور بے بسی کا آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ خوشیوں کے ماحول میں اپنی محرومیوں کو دیکھ کر پریشان ہوتے ہیں۔ خوشیوں اور رنگوں کے درمیان وہ اپنی زندگی کی بے رنگی پر اشک بہاتے ہیں۔ ان کی نگاہیں کسی ہمدرد اور مہربان کو تلاش کرتی ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی انھیں مسکرا کے دیکھ لے تو ان کا غم ہلکا ہوجاتا ہے۔ بقول شاعر:

ے یہ بھی اک رنگ ہے شاید مری محرومی کا کوئی ہنس دے تو محبت کا گماں ہوتا ہے (غلام محمد قاصر)

عیدگاہ نمازیوں سے بھری ہوئی ہے، شیدی نمازیوں کی آخری صف میں بیٹھا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ کھڑا ہوا اور لمبی سانس کھینچ کر عیدگاہ پر نظر ڈالی۔ شیدی کا عیدگاہ میں سب سے پچھلی صف میں کھڑا ہونا بھی ایک علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس بات کا

اظہار ہے کہ وہ سماج کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے ہمیشہ پیچھے رکھا جاتا ہے۔ جس کی زندگی مسلسل دباؤ اور مشکلات کی بھٹی میں جلتی رہتی ہے۔ بقول شاعر:

؎ یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا یہ انسان کے دشمن، سماجوں کی دنیا (ساحرلدھیانوی)

شیدی پہلی صف میں بڑے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا چاہتا ہے لیکن اس کی غربت کی دیوار اسے آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہے جس نے زندگی کے تلخ وشیریں تجربات کا ذائقہ چکھ رکھا ہے۔ اس کا قد لمبا، سینہ چوڑا اور کندھے صلیب کی طرح سیدھے ہیں۔ قدوقامت کے لحاظ سے وہ ایک باوقار شخص نظر آتا ہے لیکن زندگی کا بوجھ اٹھاتے اور برداشت کرتے اس کی کمر جھک کر کمان بن گئی ہے۔ اس کی مالی کمزوری نے اس کے جسمانی وقار کو بھی کم کر دیا ہے۔ وہ جسمانی طور پر کمزور ہے مگر اس کے دل میں شدید خواہش ہے کہ وہ بھی پہلی صف میں جا کھڑا ہو جہاں خوش حالی اور وقار کے نشان موجود ہیں۔ وہ بھی پہلی صف میں بیٹھے لوگوں کی طرح عزت اور برابری کا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے درمیان دولت مندی کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے نزدیک خدا کے بندوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ بقول الطاف حسین حالی:

؎ یہ پہلا سبق تھا کتابِ ھدیٰ کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

عیدگاہ میں پہلی صف میں بیٹھے لوگ معاشی طور پر مستحکم اور دولت مند ہیں۔ جب کہ آخری صف میں بیٹھے لوگ ان کی نظر میں بے حیثیت اور کم تر ہیں۔ شیدی بھی انھی لوگوں میں شامل ہے۔ وہ اس تقسیم کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ معاشی فرق کو ختم کرنا اس کے بس میں نہیں۔ وہ مالی حیثیت سے خود کو دوسروں کے برابر نہیں لا سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ غربت کی وجہ سے پہلی صف میں بیٹھے لوگ اسے اپنے برابر نہیں سمجھ سکتے۔ مالی حالت تبدیل کیے بغیر محض جسمانی طور پر آگے بڑھ کر پہلی صف میں کھڑے ہونے سے اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ اسے برابر کا انسان کبھی نہیں سمجھیں گے۔ حالاں کہ عیدگاہ میں لوگ اللہ کی عبادت کے لیے جمع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو دولت، مقام ومرتبے اور حسب نسب کی بنیاد پر کم تر یا برتر سمجھنے سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ مبارک ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے درمیان سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے: (الحجرات:13)

شیدی کا کردار ان تمام لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ اس نظام کے ستائے ہوئے ہیں۔ وہ چاہنے کے باوجود پہلی صف میں نہیں جا سکتے۔ وہ غربت کے مارے ہوئے ہیں۔ غربت کی وجہ سے وہ پہلی صف میں لوگوں کے برابر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ غربت کی سب سے بڑی بے رحمی یہی ہے کہ یہ نہ صرف انسان کو دنیوی خوشیوں سے محروم کرتی ہے بلکہ اس کے احساسات اور جذبات کو بھی مجروح کر دیتی ہے۔

؎ خوش فہم ہیں کہ صرف روایت پرست ہیں خوش فکر تھے کہ لے اُڑے تاریخ کا کفن (سرشار صدیقی)

عبارت نمبر 2

پوری عیدگاہ کراچی کے بھانت بھانت کے لوگوں سے اَٹی پڑی تھی۔ قطاریں شمار سے باہر، نمازی بے انداز! کچھ کے کپڑوں کے جوڑے نئے کچھ کے دھلے ہوئے، کچھ کے اُجلے رنگ اتنے سارے کہ جیسے آسمان سے رنگوں کی دھنک زمین پر اتر آئی ہو۔ عید نماز شروع ہونے میں چند لمحات باقی تھے۔ مُلّا بے حد عقیدت اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ تاریخِ اسلامی کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ وہ کبھی بانہیں اوپر اٹھا کر تو کبھی نیچے کر کے، آواز کے زیر و بم کے ساتھ، کبھی سیدھے سُبھاؤ تو کبھی سر میں بولتے ہوئے، لوگوں

کے جذبہ ایمانی کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگ مؤدب بیٹھے ہوئے تھے اور دورانِ وعظ کبھی کبھار اونگھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہیں اپنے اپنے مصلوں کے آگے رکھے جُوتوں پر تھیں۔ کچھ جُوتے نئے، کچھ پُرانے اور پھٹے ہوئے تھے۔ بُوٹوں، سلیپروں، سینڈلوں اور چپلوں کے تلوے تلوؤں سے ملے ہوئے تھے اور جائے سجدہ سے انچ بھر دور رکھے ہوئے تھے۔ جو نمازی اپنے ساتھ ذوالجناح کی طرح سے سنورے بچے لے آئے تھے، ان کی ایک آنکھ جُوتوں میں تو ایک بچوں میں گڑی ہوئی تھی۔ صحت مند ملا، صحت مند آواز میں وعظ کر رہا تھا اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قہر اور عذاب قبر کی باتیں بتا بتا کر ڈرا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ جوشِ ایمانی میں لاؤڈ سپیکر پھاڑ ڈالے گا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ عید کی صبح، مسجد کے باہر عوام کی بھیڑ بھاڑ میں نہایت لاغر اور مفلس شیدی نام کا ایک شخص نظر آتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے صفوں کو پھلانگتا ہوا آگے آتا ہے۔ لوگ اس کے حلیے کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ لوگوں کی تلخ باتوں کو سنتا اور حوصلے سے برداشت کرتا ہے۔ وہ صفیں پھلانگتا ہوا پہلی صف کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ پہلی صف میں موجود ملک کی نامی گرامی شخصیت محمود صاحب کے محافظ اسے دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر عیدگاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ شیدی کو بے رحمی سے مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ وہ شیدی سے پہلی صف میں آنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو شیدی کہتا ہے کہ وہ ایاز ہے اور پہلی صف میں محمود کے ساتھ نماز پڑھنا چاہتا ہے۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ شیدی غربت، مفلسی اور بے بسی کا مارا ہوا ایک فرد ہے۔ اس کی زندگی محرومیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا کالا کلوٹا رنگ، خشک بال، بنجر آنکھیں، کمزور بدن اور بوسیدہ کپڑے اس کے حالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ عید کے دن بھی وہ عیدگاہ میں اسی حالت میں آیا ہوا ہے۔ عید کا دن خوشیوں اور مسرتوں کا دن ہے۔ اس دن ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے۔ ہر شخص نئے اور خوش بودار کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ مگر شیدی کی آنکھوں میں چمک ہے نہ اس کے لباس میں خوش بو۔ اس کے بدن میں تازگی بھی نہیں۔ اس کے بدن پر لباس نہیں محض چیتھڑے ہیں جو اسے عید کے دن میسر ہیں۔

؎ بے زری فاقہ کشی مفلسی بے سامانی ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے
(نظیر اکبرآبادی)

تشریح طلب عبارت میں مصنف کراچی عیدگاہ کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پوری عیدگاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ بے شمار قطاروں میں نمازی اپنے اپنے انداز میں بیٹھے عید کی نماز شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور کچھ کے کپڑے پرانے مگر دھلے ہوئے تھے۔ عیدگاہ میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے سارے رنگ زمین پر اُتر آئے ہیں۔ مُلّا بے حد عقیدت اور بڑے جوش وخروش سے ولولہ انگیز لہجے میں تاریخِ اسلامی کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ لوگوں کو اسلام کا درس دے رہا تھا اور قوتِ ایمانی سے جیتی گئی مسلمانوں کی جنگوں کا احوال سنا رہا تھا۔ وہ نہایت پرجوش لہجے میں وعظ کر رہا تھا۔ اس کا کبھی بانہیں اوپر اُٹھانا، کبھی نیچے کرنا، آواز کے زیر و بم کے ساتھ، کبھی سیدھے انداز میں تو کبھی ترنم میں بولنا لوگوں کو متوجہ کر رہا تھا۔ مُلّا کی ان تمام حرکات وسکنات سے دکھاوا ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف توجہ کرنے کے لیے نئے نئے پینترے آزما رہا تھا اور اپنے بیان کو پُراثر بنانے کے لیے تاریخِ اسلامی کے واقعات سنا کر لوگوں میں

جذبۂ ایمانی کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دراصل مصنف نے ملّا پر طنز کی ہے کہ بظاہر تو وہ منبر پر بیٹھا اسلام کی تبلیغ کا کام انجام دے رہا تھا، لیکن درحقیقت وہ خود کو پرہیزگار اور متقی ثابت کرنے کے لیے اپنی حرکات اور لب و لہجے سے لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بقول علامہ اقبال:

؎ عجب واعظ کی دین داری ہے یارب عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

یا ؎ کوئی علاج غمِ زندگی بتا واعظ سنے ہوئے جو فسانے ہیں پھر سنانہ مجھے (اختر ضیائی)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ لوگ ادب سے بیٹھے ہوئے وعظ سن رہے تھے اور کبھی کبھار اونگھ بھی لیتے تھے۔ دراصل وہاں بیٹھے نمازیوں کو وعظ میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ دورانِ وعظ ان کا اونگھنا ان کی عدم دل چسپی کا ثبوت تھا۔ وہ بے قراری سے عید کی نماز کے شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کی توجہ کا مرکز مصلے کے آگے پڑے جوتے تھے۔ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اپنے جوتوں اور ساتھ لائے بچے سنورے، بچوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی ایک نگاہ جوتوں پر اور دوسری بچوں پر تھی۔ انھیں اسلامی تاریخ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ عید نماز کو محض عید کے دن کا تقاضا سمجھ کر پڑھنے آئے ہوئے تھے۔ ملّا کا وعظ ان کے لیے بوریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صحت مند ملّا، اپنی گرجتی آواز میں اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کے بجائے لوگوں کو خدا کے قہر سے ڈرا رہا تھا۔ ملّا لوگوں کو خدا کے قہر اور عذابِ قبر کی باتیں سنا کر اُن میں جذبۂ ایمانی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کہ انسانی نفسیات کے مطابق انسان ہمیشہ دوسرے کے رحم و کرم سے متاثر ہو کر اس کی طرف راغب ہوتا ہے۔ لہٰذا مصنف نے ہمارے معاشرے میں موجود نام کے ملّا کو طنز کا نشانہ بنایا ہے، جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہے۔ اس کی رحمت سے ناواقف رکھتا ہے۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر کفر کے فتوے لگاتا ہے اور انھیں جہنم کا حق دار ٹھہراتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"میری جانب سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے، واقعی وہ بڑی بخشش بڑی رحمت والا ہے۔" (سورۃ الزمر۔ آیت نمبر 53)

بقول داغ دہلوی:

؎ عاشقی سے ملے گا اے زاہد بندگی سے خدا نہیں ملتا

عبارت نمبر 3

"اَبے بیٹھ جا! کنگال قسم کے ایک دبلے پتلے شخص نے شیدی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، کھڑے کیوں ہو؟ بندر یا بھاگ گئی ہے کیا؟" شیدی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جھٹکا دے کر، بازو چھڑا کر پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

"اَبے! دور کر یہ اپنے توے ایسے پاؤں۔" شیدی کو کہنی مارتے ہوئے ایک چڑیا جتنے نوجوان نے کہا، "آدمی ہو کہ تارکول" شیدی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قطار سے نکل کر اگلی میں کھڑا ہو گیا۔

"اوہو۔۔۔۔ بڑے احمق ہو تم بھی۔" اُجلے سفید کپڑوں والے ایک شخص نے غصہ میں شیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "شرم نہیں آئی میرے کورے پاجامے کے پائنچے پر پاؤں رکھتے ہوئے۔"

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ عید کی صبح عیدگاہ میں موجود نمازیوں کی بھیڑ میں شیدی نام کا ایک لاغر اور مفلس شخص نظر آتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لیے اٹھتا ہے۔ ہر صف میں لوگ اس کے حلیے کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ سب کی باتوں کو برداشت کرتے ہوئے پہلی صف تک پہنچنے کی

کوشش کرتا ہے۔ لیکن پہلی صف میں موجود ملک کی نامی گرامی شخصیت محمود صاحب کے محافظ شیدی کو دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر عیدگاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ اسے اتنی بے رحمی سے مارتے ہیں کہ شیدی کا چہرہ لہولہان ہو جاتا ہے۔ بے حد مار کھانے کے بعد شیدی اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں انھیں جواب دیتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور محمود کے ساتھ پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

مصنف عیدگاہ کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عید کی صبح، کراچی عیدگاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسی ہجوم میں ایک کالا کلوٹا، لاغر اور مفلس شخص شیدی نظر آتا ہے۔ شیدی آخری صف میں کھڑا ہو کر ایک اُڑتی نگاہ عیدگاہ پر ڈالتا ہے۔ اتنے میں ایک کنگال قسم کا دبلا پتلا شخص شیدی کا بازو پکڑ کر کہتا ہے۔ ابے بیٹھ جا! کھڑے کیوں ہو؟ تمھاری بندر یا بھاگ گئی ہے کیا؟ شیدی اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیتا اور پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں جھٹکا دے کر اپنے بازو کو چھڑاتا ہے اور پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ شیدی جب اگلی صف میں کھڑا ہوتا ہے تو ایک نوجوان جو عمر میں تو شیدی سے بہت چھوٹا ہے، لیکن دولت کی وجہ سے معاشرے میں اس کا مرتبہ شیدی سے بہت بلند ہے، وہ شیدی کو دھتکارنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور نہایت بداخلاقی اور حقارت آمیز انداز میں شیدی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ابے! اپنے توے جیسے پاؤں مجھ سے دور کر، انسان ہو کہ تارکول۔ اس کے رنگ اور لاغر حلیے کی وجہ سے نوجوان اس سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شیدی کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ وہ اس کے ساتھ ایک صف میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرے۔ جب شیدی کا سیاہ پاؤں اس کے صاف رنگت والے پاؤں کے ساتھ ٹکراتا ہے تو اُسے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ لوگ شیدی سے نفرت کرتے ہیں۔ اسے حقیر جانتے ہیں۔ یہ بات اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے کہ شیدی ان کے برابر کھڑا ہو۔ بقول شاعر:

؎ میری پوشاک تو پہچان نہیں ہے میری دل میں بھی جھانک مری ظاہری حالت پہ نہ جا (اعتبار ساجد)

دراصل اس کے ذریعے مصنف نے ہمارے معاشرے کے دوہرے معیار اور عدم مساوات کو موضوع بنایا ہے۔ جہاں بظاہر سب مسلمان معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ اسلامی اصولوں سے بالکل بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ اسلام نے تمام انسانوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تمام انسان برابر ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم نے فرمایا:

"لوگو! سن لو، زمانہ جاہلیت کے تمام رسم و رواج آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لوگو! تمھارا رب ایک ہے، تمھارا باپ آدم ہے۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کالے پر، کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں ہے، فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔"

لیکن ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہے۔ شیدی جیسے غریب اور لاغر انسان کے ساتھ، اس کے حلیے اور غربت کی وجہ سے کوئی مسلمان بھی نماز پڑھنا پسند نہیں کرتا۔ بقول بیدم شاہ وارثی:

؎ سب نے غربت میں مجھ کو چھوڑ دیا اک مری بے کسی نہیں جاتی

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ شیدی جس صف میں جاتا ہے، اسے لوگوں کا تضحیک آمیز رویہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ شیدی پچھلی صف سے اگلی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اگلی صف میں کھڑا اُجلے کپڑوں والا شخص شیدی کو نہایت غصے سے دیکھتا ہے اور

ذلت آمیز لہجے میں شیدی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ شرم نہیں آئی میرے کورے پاجامے کے پائنچے پر پاؤں رکھتے ہوئے۔ یعنی شیدی سے زیادہ باعزت ایک خوش لباس شخص کا پائنچہ ہے۔ مصنف نے اس کے ذریعے نہایت باریکی اور دردمندی سے معاشرے میں موجود عدم مساوات کو بیان کیا ہے جہاں غریب اور لاغر انسان کو گندگی کا ڈھیر سمجھا جاتا ہے۔ کوئی بھی اسے اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ ان کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز ادا کرے۔ یہاں جذبۂ ایمانی کی کوئی وقعت نہیں۔ عید نماز ادا کرنے کے لیے ایمان سے زیادہ خوش لباسی اور نئے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے (ولی دکنی)

عبارت نمبر 4

شیدی کی اُداس آنکھوں میں پُراسرار روشنی اُبھر آئی تھی۔ اس نے اس بپھرے ہوئے شخص کے جملے کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ وہ قدم بڑھا کر اگلی قطار میں جا کھڑا ہوا۔ ''خبردار!'' فرشتوں جیسے ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ کی چٹکی کاٹتے ہوئے کہا: ''لاحَولَ وَلاَ قُوَّۃ! میرا دبئی کا مصلیٰ میلا کر دیا۔ آدمی ہو کہ ابنِ ابلیس!'' شیدی نے چٹکی کی پروا نہیں کی اور نہ ہی فرشتوں ایسے شخص کے جملے کی۔ اس کی اداس آنکھوں میں پُراسرار روشنی بڑھتی چلی گئی۔ وہ قدم بڑھا کر اگلی قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔'' اے اوبَن مانس!'' ایک نوجوان، جس نے بڑی محنت اور جفاکشی کے بعد اپنی چمکتی پیشانی پر بال سجا رکھے تھے، نے شیدی کو حقارت آمیز لہجے میں کہا: ''چڑیا گھر سے پنجرہ توڑ کر بھاگے ہو کیا؟''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں لوگوں کی بھیڑ میں لاغر اور مفلس شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ جو اپنے سیاہ رنگ اور غربت کی وجہ سے لوگوں کی نفرتوں کا نشانہ بنتا ہے۔ وہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے لوگوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لوگ اس کے حلیے کی وجہ سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ایک نوجوان اس کی رنگت کی وجہ سے اسے تارکول کہتا ہے۔ ایک آدمی اپنے سفید کپڑے شیدی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ شیدی سب کچھ برداشت کرتا ہوا پہلی صف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھتے ہوئے بے دردی سے مارتے ہیں اور اسے لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈراما نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشاندہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے تئیں شیدی کو کوستا ہے اور اپنے غصے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عیدگاہ میں موجود تمام لوگ شیدی کو اس کے حلیے کی وجہ سے اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ پہلی صف میں نماز پڑھے۔ جب اس کا سیاہ پاؤں ایک گورے شخص کے پاؤں کے ساتھ ٹکراتا ہے تو وہ اسے دھتکارتا ہے۔ نیز اس کی رنگت اور پھٹے پرانے کپڑوں کی وجہ سے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اسے حقیر جانتے ہیں وہ اپنی ذات کی تذلیل کی پروا بھی نہیں کرتا اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کی اداس آنکھوں میں پُراَسرار روشنی

ابھر آتی ہے جو اس کے داخلی جذبات کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ روشنی اسے کسی بات کی پروا کیے بغیر آگے بڑھنے پر آمادہ کرتی ہے۔ پہلی صف میں نماز پڑھنے کا شوق اس پر اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ وہ ہر قسم کے دباؤ اور نفرت کا سامنا کرتے ہوئے، خود پر چیخنے اور چلانے والے شخص کی بات کو سنی اَن سنی کر دیتا ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے شیدی زندگی کے کٹھن راستوں سے گزر کر ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں وہ زندگی کے حقائق کو عام انسان کی نسبت زیادہ گہرائی سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے زخموں، جدوجہد اور تمام آزمائشوں نے شیدی کے اندرونی دکھوں کو روشنی میں تبدیل کر دیا ہے اور وہ زمانے کو پرکھنے کے لیے نیا شعور رکھتا ہے۔ ایسا شعور جو محض تجربوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اس نے اپنے رنگ اور غربت کی وجہ سے لوگوں کی دھتکار برداشت کی۔ لیکن یہ دھتکار اور ذلت آمیز لہجے اس کے حوصلے کو پست نہیں کر سکے اور وہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے ایک قطار سے نکل کر دوسری قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ لیکن شیدی کے حلیے کی وجہ سے عیدگاہ میں موجود لوگ اسے پہلی صف میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ وہ کالے رنگ اور لاغر حلیے کی وجہ سے لوگوں کی نفرتوں کا نشانہ بنتا ہے۔ اسلام میں اس رویے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ حضور اکرم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

''لوگو تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ بھی ایک ہے، آگاہ ہو جاؤ! کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ رنگ والے کو کالے رنگ والے پر اور کسی سیاہ رنگ والے کو سرخ رنگ والے پر کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں، مگر تقویٰ کے ساتھ''

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اللہ تعالیٰ کے ہاں تم میں سے وہ شخص سب سے زیادہ معزز ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ جب شیدی پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں داخل ہوتا ہے تو فرشتے جیسے ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا کہ لاحول ولاقوۃ! میرا دبئی کا مصلیٰ میلا کر دیا۔ آدمی ہو کہ ابنِ ابلیس! دراصل مصنف نے ان جملوں کے ذریعے ان لوگوں پر طنز کی ہے جو خود کو بہت نیک، معصوم اور بے گناہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ ان کے اعمال اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ جب شیدی کا پاؤں، بظاہر نیک اور معصوم نظر آنے والے شخص کے مصلیٰ پر پڑتا ہے تو وہ نہایت غصے میں اسے کہتا ہے کہ میرا دبئی کا مصلیٰ میلا کر دیا۔ وہ شیدی کے حلیے اور سیاہ رنگ کی وجہ سے اسے اتنا حقیر سمجھتا ہے کہ یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ شیدی کا پاؤں اس کے مصلیٰ سے ٹکرائے۔ وہ اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے شیدی کی ٹانگ پر چٹکی کاٹتا ہے اور اسے ابنِ ابلیس (شیطان کا بچہ) کہتا ہے۔

دراصل مصنف نے ہمارے معاشرے میں موجود ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو بظاہر بہت نیک اور پارسا نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کی تذلیل کرنے اور اذیت پہنچانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ دولت، رنگ اور نسل کی وجہ سے خود کو دوسروں سے افضل سمجھتے ہیں۔ بقول شاعر:

ہم جو اِنسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں (ساحر لدھیانوی)

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ شیدی تمام لوگوں کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ شیدی کی آنکھوں میں چمکتی پُراَسرار روشنی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ وہاں موجود تمام لوگوں سے زیادہ باشعور ہے۔ کیوں کہ وہ اس حقیقت کو جان گیا ہے جس حقیقت سے دوسرے لوگ ناواقف ہیں کہ تمام انسان خدا کی بارگاہ میں برابر ہیں۔ اس لیے وہ عیدگاہ میں موجود لوگوں کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگلی صف میں ایک نوجوان، جس کے ماتھے پر سجے ہوئے بال اس کی خود پسندی کو ظاہر کرتے ہیں، نہایت غصے اور تضحیک بھرے لہجے میں شیدی سے کہتا ہے کہ ارے او بن مانس! چڑیا گھر سے پنجرہ توڑ کر آیا ہے کیا۔ وہ شخص شیدی کے حلیے کی وجہ

سے اس سے اِس قدر نفرت کرتا ہے کہ اسے جانور سے تشبیہ دیتا ہے اور اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ بقول شاعر:

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل　　کوئی گدھا کہے اُسے، ٹھہرا دے کوئی بیل　　(نظیر اکبر آبادی)

دراصل اِس عبارت میں مصنف نے نسلی تعصب، طبقاتی تفریق اور سماجی رویوں کو ظاہر کیا ہے۔ مصنف نے شیدی اور عیدگاہ میں موجود لوگوں کے ذریعے معاشرے کی اِس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بعض لوگ خود کو دوسروں سے برتر سمجھ کر ان کے ساتھ حقارت آمیز رویہ رکھتے ہیں اور اپنے غرور اور احساسِ برتری کی وجہ سے وہ نچلے طبقے کے لوگوں کو بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھتے ہیں۔ بقول شاعر:

زمین پر بکھری ہیں امیدوں کی لاشیں　　غربت کے ماروں کی خاموش فریادیں

عبارت نمبر 5

قریب بیٹھے کچھ ایکٹر چھاپ نوجوانوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک بھینگے نوجوان نے اداکاروں جیسے لہجے میں کہا: ''لگتا ہے کہ افریقہ سے ہجرت کر کے آیا ہے۔'' ایکٹر چھاپ نوجوانوں کی ٹولی نے قہقہہ لگایا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص، جو اونگھ رہا تھا، قہقہہ سن کر بیدار ہو گیا۔ اس نے گھٹنوں سے سر نکال کر نوجوانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اے لڑکو! تمیں مار خانی مت دکھاؤ، وعظ سننے دو۔'' ''چپ کر، ابابیل کے بچے!'' ایک نوجوان نے فی البدیہہ جواب دیا۔ وہ شخص اُترا ہوا چہرہ لے کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں شیدی وہ قطار چھوڑ کر اگلی قطار میں جا کھڑا ہوا۔ ''ارے اِدھر آگے کہاں آ رہے ہو؟'' چار پانچ آدمیوں نے اسے روک لیا۔ انھوں نے اس کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ناتواں بدن کو دیکھ کر کہا: ''یہاں شیرینی بٹ رہی ہے کیا؟'' شیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں اگلی قطار پر گڑی ہوئی تھیں۔ ''پیچھے جاؤ، اے توے کے بھائی! پیچھے جاؤ۔''

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح شیدی نام کا ایک لاغر اور کالا کلوٹا شخص عیدگاہ میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں آخری صف سے پہلی صف میں جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنے لاغر حلیے اور سیاہ رنگ کی وجہ سے لوگوں کی طنز اور تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ شیدی چھلانگیں مارتا اور صفوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہاں موجود لوگ اس کے حلیے کی وجہ سے اسے مجرم سمجھتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان کھلبلی مچ گئی۔ پہلی صف میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کے ساتھ شہر کے امیر اور کاروباری لوگ بھی موجود ہیں۔ محمود صاحب کے محافظ اسے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور میں پہلی صف میں محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف سماجی رویوں اور تعصبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں پچھلی صف سے اگلی صف کی جانب قدم بڑھاتا رہتا ہے۔ اس دوران میں عیدگاہ میں بیٹھے معزز اور نیک لوگ شیدی کے حلیے اور رنگ کی وجہ سے اُسے دھتکارتے ہیں اور حقارت آمیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہیں۔

جب شیدی لوگوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں اگلی صف میں پہنچتا ہے تو اس کا رنگ اور ناتواں بدن دیکھ کر ساتھ بیٹھے ایکٹر چھاپ نوجوان قہقہہ لگاتے ہیں۔ ایکٹر چھاپ سے مراد وہ نوجوان ہیں جو خود کسی قابل نہ ہوں لیکن خود کو معتبر اور اہم ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ شیدی کو دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہیں اور اس کے حلیے کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان میں موجود

ایک بھینگا نوجوان مبالغہ آمیز لہجے میں، شیدی کے سیاہ رنگ پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ لگتا ہے کہ افریقہ سے ہجرت کر کے آیا ہے۔ یہ جملہ نسل پرستی اور طنزیہ مذاق کی نشاندہی کرتا ہے۔ بھینگا نوجوان، بذاتِ خود ایک جسمانی خامی کا شکار ہے۔ لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر دوسرے شخص پر طنز کر رہا ہے۔ شیدی کے حلیے، لاغر اور ناتواں جسم کی وجہ سے اسے خود سے کم تر سمجھتے ہوئے وہ اس کا مذاق اُڑانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ شیدی کو اس کے سیاہ رنگ کی وجہ سے افریقی کہتا ہے۔ مصنف نے ان جملوں کے ذریعے انسانی فطرت میں موجود ایسے رویوں کو نمایاں کیا ہے جہاں انسان اپنی ذاتی خامیوں کو نظر انداز کر کے دوسرے لوگوں کے ظاہری خدوخال اور غربت پر طنز کرتے اور ہنستے ہیں۔ بقول شاعر:

غربت کا اب مذاق اڑانے لگے ہیں لوگ　　دولت کو سر کا تاج بتانے لگے ہیں لوگ
تہذیبِ شہر کتنی بدل دی ہے وقت نے　　اپنی روایتوں کو بھلانے لگے ہیں لوگ
(محمد علی ساحل)

وہاں موجود ایک بوڑھا شخص ان نوجوانوں کو شیدی کا مذاق اُڑانے سے روکتا ہے اور کہتا ہے کہ جھوٹی شیخی نہ بگھارو وعظ سننے دو۔ یعنی وہ انھیں بے کار باتوں سے روکتے ہوئے ان کی توجہ اس کام کی طرف دلاتا ہے جس کے لیے وہ سب یہاں موجود تھے۔ لیکن وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے اور ان میں سے ایک نوجوان اس بوڑھے پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے چپ کر ابابیل کے بچے۔ چوں کہ ابابیل ایک تیز رفتار پرندہ ہے اور باقی پرندوں کی نسبت ابابیل کے بچے زیادہ بے چینی سے حرکت کرتے ہیں اس لیے وہ نوجوان، بوڑھے پر طنز کرتے ہوئے اسے ابابیل کے بچے سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ بوڑھا اپنی بے عزتی سے شرمندہ ہو کر دوبارہ سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے۔

آخر ہیں کون لوگ جو بخشے ہی جائیں گے　　تاریخ کے حرام سے توبہ کیے بغیر　　(جون ایلیا)

شیدی ان لڑکوں کی باتوں کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ اگلی صف میں اسے چار پانچ آدمی روک لیتے ہیں۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے اور کمزور جسم دیکھ کر وہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور ایک جملہ کہتے ہیں ''یہاں شیرینی بٹ رہی ہے کیا؟'' جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں موجود لوگ شیدی جیسے لاغر، ناتواں اور غریب آدمی کو پہلی صفوں میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ اسے شروع کی صفوں میں دیکھ کر حیران ہوئے کہ ایسا غریب اور لاغر شخص پہلی صف میں کیسے پہنچ گیا۔ اس لیے وہ شیدی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہاں تمھارے مطلب کا کچھ نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنی باتوں اور طنزیہ رویے سے شیدی کو یہ جتاتے ہیں کہ اس کی جگہ پہلی صف میں نہیں ہے۔ بلکہ اس جیسے غریب، ناتواں اور پھٹے پرانے کپڑے پہننے والوں کو وہاں ہونا چاہیے جہاں کچھ مفت بٹ رہا ہو۔

یہ جملے معاشرتی تعصب اور نسل پرستی کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی ظاہری شان و شوکت سے ہوتا ہے۔ بقول شاعر:

بشر روزِ ازل سے شیفتہ ہے شان و شوکت کا　　عناصر کے مرقع میں بھرا ہے نقش دولت کا　　(امداد علی بحر)

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ شیدی کے اندر پہلی صف میں نماز ادا کرنے کا شوق بڑھتا چلا گیا اور وہ لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کرتا ہوا اگلی صف کی جانب بڑھا۔ جب شیدی اگلی صف میں پہنچا تو اس صف میں موجود شخص نے شیدی کے سیاہ رنگ کی وجہ سے اس سے کہا کہ پیچھے جاؤ توے کے بھائی پیچھے جاؤ۔ بقول شاعر:

میری صف سے جو آگے کی صفیں ہیں　　نمایاں فاصلہ ہے مفلسی کا　　(اعظمی ارحم)

مصنف نے تشریح طلب عبارت میں ہمارے معاشرے میں موجود معاشرتی تعصب اور نسل پرستی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شیدی جو پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں آگے آتا ہے، اپنی سیاہ رنگت، لاغر حلیے اور غربت کی وجہ سے لوگوں کی طنز اور مذاق کا نشانہ بنتا ہے۔

عبارت نمبر 6

شیدی نے انھیں جواب نہیں دیا، نہ ہی گردن موڑ کران کی طرف دیکھا۔ پراسرار روشنی واضح طور پر اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ قدم اٹھاتا، چھلانگیں مارتا، نمازیوں کی دو چار قطاریں پھلانگ گیا۔ لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جو اونگھ رہے تھے وہ بیدار ہو کر بیٹھ گئے۔ جو بیدار تھے اور کانوں سے وعظ سن رہے تھے اور آنکھوں سے اپنے جوتوں اور بچوں کی نگہداشت کر رہے تھے، وہ شتر مرغ کی طرح گردنیں پھیر کر شیدی کی طرف دیکھنے لگے۔ انھوں نے جب شور سنا تو جھپٹ کر اپنے جوتے اٹھالیے اور بچوں کو کھینچ کر گود میں بٹھالیا۔ کچھ پُرحشمت، بہادروں اور نڈروں نے شیدی کو قابو میں کرلیا۔
''پکڑنا۔'' ''مت چھوڑنا۔'' ''خوب مرمت کرنا۔'' شور وغل بڑھ گیا۔ مولوی صاحب نے وعظ بند کر دیا اور منبر کے سب سے اونچے زینے پر چڑھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ تمام مخلوق کا دھیان شیدی کی طرف ہوگیا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا لاغر شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں ساری صفوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف تک پہنچتا ہے۔ اس کے حلیے کی وجہ سے لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ لوگوں کی تلخ باتوں کو برداشت کرتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب شہر کے معززین کے ہمراہ پہلی صف میں بیٹھے ہیں۔ شیدی کو دیکھ کر لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو غیر ملکی ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اسے بے دردی سے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں محمود کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف عیدگاہ کا منظر بیان کرتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں پچھلی صف سے اگلی صف کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنے لاغر حلیے اور ناتواں جسم کی وجہ سے لوگوں کے طعنوں کا نشانہ بنتا ہے۔ لیکن وہ کسی بھی شخص کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتا اور تضحیک آمیز لہجوں اور جملوں کو برداشت کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ عیدگاہ میں موجود لوگ اسے دھتکارتے ہیں۔ لیکن وہ ان تمام لوگوں کی باتوں سے بے نیاز ہو کر پہلی صف کی طرف قدم بڑھاتا رہتا ہے اور جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پُراَسرار روشنی اُبھرتی چلی جاتی ہے۔ شیدی یہ حقیقت جان گیا ہے کہ خدا کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ لہٰذا اسے بھی پورا حق حاصل ہے کہ وہ پہلی صف میں شہر کے معززین کے ساتھ عید کی نماز ادا کر سکے۔ اسے یہ حق خدا نے دیا ہے۔ بقول شاعر:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز (علامہ اقبالؒ)

پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں شیدی قدم بڑھاتا ہوا، چھلانگیں مارتا نمازیوں کی دو چار قطاریں پار کر لیتا ہے۔ اس سے لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ جو اونگھ رہے تھے وہ بیدار ہو جاتے ہیں، جو بیدار تھے وہ کانوں سے وعظ سن رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کی تمام توجہ اپنے جوتوں اور بچوں کی حفاظت کی طرف تھی، وہ بھی گردنیں گھما کر شیدی کی طرف دیکھنے لگے۔ بظاہر عبادت میں مشغول اور وعظ سننے میں مصروف نظر آنے والے پہلی صفوں میں بیٹھے مسلمانوں نے جب اپنے اردگرد افراتفری دیکھی اور شور سنا تو تیزی سے اپنا سامان سمیٹ لیا۔ لوگوں نے اپنے جوتے اٹھالیے اور بچوں کو کھینچ کر گود میں بٹھالیا۔

اس عبارت میں مصنف نے معاشرے پر طنز کی ہے اور اس حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی توجہ عبادت کی طرف نہیں ہوتی بلکہ وہ خیالات اور دنیوی معاملات میں الجھے رہتے ہیں۔ خطبہ سن کر اونگھنے والے بظاہر تو عبادت کے لیے عیدگاہ میں موجود تھے، لیکن وہ خطبے میں محو ہونے کے بجائے نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شیدی کی وجہ سے ہلچل انھیں نیند سے بیدار کرتی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبادت سے بالکل بے خبر آرام کرنے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ موجود تھے جو بظاہر تو جاگ رہے تھے اور مولوی صاحب کا خطبہ بھی سن رہے تھے لیکن پھر بھی ان کی توجہ اپنے جوتوں اور بچوں کی طرف تھی۔ وہ وعظ میں اس لیے بھی محو نہیں ہوئے کہ کہیں ان کے جوتے اور بچے کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔ اس لیے وہ عبادت کے دوران میں بھی دنیوی معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ بقول شاعر:

خرد نے کہہ بھی دیا ''لا الٰہ'' تو کیا حاصل دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
(علامہ اقبالؒ)

شیدی کے نمازیوں کی صفیں پھلانگنے کی وجہ سے لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور شیدی کی اس حرکت کی وجہ سے کچھ رعب و دبدبے والے، بے خوف آدمیوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ شیدی کے حلیے اور سیاہ رنگ کی وجہ سے سب نے اسے مجرم سمجھ لیا۔ جب کہ اس کا کوئی جرم ثابت بھی نہیں ہوا تھا۔ چاروں طرف سے لوگوں کی صدائیں بلند ہو گئیں''۔ پکڑو، ''مت چھوڑنا''۔ خوب مرمت کرنا۔'' یہ شور سن کر مولوی صاحب نے بھی خطبہ دینا بند کر دیا اور منبر کی پہلی سیڑھی پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ یہاں مصنف نے معاشرے میں موجود اس دُہرے معیار کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جہاں ایک طرف تو مولوی صاحب قرآن و احادیث کی تعلیمات لوگوں تک پہنچا رہے ہیں، وہیں دوسری طرف جب ان کے سامنے شیدی کو بغیر کسی جرم کے پکڑا جاتا ہے تو وہ اسے چھڑانے کی بجائے بلندی پر بیٹھ کر تماشا دیکھتے ہیں۔ اس ہنگامے کے سبب تمام لوگوں کی توجہ عید کے خطبے سے ہٹ گئی اور سب لوگ شیدی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

میری پوشاک تو پہچان نہیں ہے میری دل میں بھی جھانک مری ظاہری حالت پہ نہ جا
(اعتبار ساجد)

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرفِ اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علَم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں امن و انصاف ہو، محبت عام ہو۔

ایک دنیا ہم بنائیں اِک نئے عنوان سے امن ہو انصاف ہو اور ہو محبت کی فضا
(وجاہت علی سندیلوی)

عبارت نمبر 7

ایک شخص ہجوم سے راستہ بناتا ہبلّہ بولتا، آگے بڑھ آیا۔ اس کے ہونٹ پتلے اور خشک، آنکھیں بے رونق اور بال اُجڑے ہوئے تھے۔ اس نے لوگوں سے بلند آواز میں کہا: ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چور نہیں نہ ہی جیب کترا اور نہ ہی لفنگا ہے۔ یہ صرف شیدی ہے۔'' جس نیک بندے کا ہاتھ شیدی کی گردن میں تھا، اس نے ایک نگاہ میں نو وارد کا جائزہ لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: ''اور تم کون

ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''میں ماموں خاں موچی ہوں۔'' ''بھاگ جا، موچی! تُو جا کر پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کر۔'' نیک صورت اور نیک سیرت شخص نے کہا: ''ہم خود ہی اس کی خبر لیں گے۔'' ماموں خان موچی دھکے ٹھڈے کھا کر منظر سے غائب ہو گیا۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا لاغر شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں ساری صفوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس کے حلیے کو دیکھ کر لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ سب کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پہلی صف تک پہنچ جاتا ہے۔ لوگ اسے مجرم سمجھتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی شہر کے معززین کے ہمراہ پہلی صف میں موجود ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اسے بے دردی سے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں محمود کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف معاشرتی ناہمواریوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں صفیں پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس کی اِس حرکت کی وجہ سے وہاں موجود لوگوں میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ شیدی کے لاغر حلیے، سیاہ رنگت اور ناتواں جسم کی وجہ سے لوگ اسے چور اور جیب کترا سمجھتے ہیں۔ بقول شاعر:

؎ نٹ کھٹ، اچکا چور، دغاباز، گٹھ کٹا سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی (نظیر اکبرآبادی)

وہ ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی اپنی صفائی میں کچھ کہتا ہے۔ عیدگاہ میں موجود لوگ اسے گھیر کر کھڑے ہوتے ہیں اور اس پر طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں۔ اس دوران میں ایک شخص نمودار ہوتا ہے جس کے ہونٹ پتلے اور خشک، آنکھیں بے رونق اور بال اُجڑے ہوئے تھے۔ اس کے حلیے سے اس کی غربت جھلک رہی تھی۔ وہ بلند آواز میں لوگوں سے کہتا ہے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چور نہیں، نہ ہی جیب کترا اور نہ ہی لفنگا ہے، یہ صرف شیدی ہے۔ وہ شخص شیدی کی بے گناہی ثابت کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ لیکن کوئی اس کی بات کو سنجیدہ نہیں لیتا کیوں کہ وہ شخص غریب اور بے اختیار تھا۔ اس لیے سچ بولنے اور انصاف کا مطالبہ کرنے کے باوجود اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ دراصل مصنف طبقاتی تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں طاقت ور اور کمزور کے لیے انصاف کے پیمانے مختلف ہیں۔ انصاف کے حصول کے لیے کمزور لوگوں کی آواز کو دبا دیا جاتا ہے، جب کہ طاقت ور اور دولت مند طبقہ اپنے حق میں فیصلے کراتا ہے اور لوگ بھی ان فیصلوں کو قبول کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

؎ آپ ہی کی ہے عدالت، آپ ہی منصف بھی ہیں یہ تو کہیے آپ کے عیب و ہنر دیکھے گا کون (منظر بھوپالی)

آگے چل کر مصنف معاشرے میں موجود دوہرے معیار پر طنز کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ایک شخص، جو اپنے لباس اور مہذب رویے کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک نیک سمجھا جاتا تھا، شیدی کی گردن پکڑ کر کھڑا تھا۔ جب کہ شیدی کا کوئی جُرم بھی ثابت نہیں تھا۔ صرف اس کی غربت، سیاہ رنگت اور لاغر حلیے کی وجہ سے اُسے مجرم سمجھ کر سزا کا حق دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

نیک شخص شیدی کے حق میں گواہی دینے والے شخص کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں اس سے پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟ جس پر وہ شخص جواب دیتا ہے کہ میں ماموں خاں موچی ہوں۔ جس پر وہ شخص تضحیک آمیز لہجے میں کہتا ہے کہ بھاگ جا موچی! تو جا کر پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کر۔ یعنی ہمارے معاشرے میں لوگوں کی جیب اور معاشرتی حیثیت، شان و شوکت دیکھ کر اس کی بات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ شیدی کے حلیے اور سیاہ رنگت کی وجہ سے اسے چور تسلیم کر لیا گیا اور ماموں خان موچی کی گواہی کو بھی اس کی غربت کی وجہ سے رد کر دیا گیا۔ دراصل یہ ایک علامتی اظہار ہے کہ غریب اور کمزور طبقے کی بات کو سماج میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، چاہے وہ درست ہی کیوں نہ ہو۔ نیز ماموں خاں موچی اپنی بے عزتی پر کسی کو کچھ نہیں کہتا اور چلا جاتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ یہی دستور زباں بندی ہے کہ صدیوں سے یہاں حق بات کرنا جرم ہے، سچ کہنا بغاوت ہے (حبیب جالب)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اُس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا عَلَم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں امن و انصاف ہو، محبت عام ہو۔

؎ امن ہو انصاف ہو اور ہو محبت کی فضا ایک دنیا ہم بنائیں اِک نئے عنوان سے (وجاہت علی سندیلوی)

مہارت نمبر 8

لوگ آپس میں بحث مباحثہ کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شور و غل بڑھ گیا۔ لوگ شیدی کے حشر کے متعلق کسی ایک فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ پہلی قطار میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت، ہر دل عزیز، مشہور و معروف جناب محمود صاحب موجود تھے۔ لوگوں کو محمود صاحب کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ محمود صاحب کے لیے پریشان ہونے لگے۔ ہجوم میں سے کسی نے بلند آواز، چیختے ہوئے کہا، ''کالا شیدی پہلی قطار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بد بخت ضرور کسی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے اور محمود صاحب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔'' اس نئے انکشاف پر لوگ حواس باختہ ہو گئے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں طرح طرح کے لوگوں کی بھیڑ میں ایک لاغر اور مفلس شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی اپنے کالے رنگ اور لاغر حلیے کی وجہ سے لوگوں کی نفرتوں کا نشانہ بنتا ہے۔ وہ پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لیے لوگوں کو پھلانگتا ہوا آخری صف سے پہلی صف تک جاتا ہے۔ پہلی صف میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی شہر کے معززین کے ہمراہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کو محمود صاحب کی حفاظت کی فکر ہوتی ہے۔ لوگ شیدی کو مجرم سمجھتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو بے دردی سے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں طرح طرح کے لوگوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا لاغر، شیدی نامی شخص ظاہر ہوتا ہے۔ جو پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں اپنے حلیے اور رنگ کی وجہ سے لوگوں کی نفرت اور حقارت برداشت کرتا ہوا پہلی صف تک پہنچتا ہے۔ لوگ اسے چور، جیب کترا اور دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر مارنے پیٹنے لگتے ہیں۔

عیدگاہ میں موجود نمازی شیدی کو اس کے جرم کی سزا دینے کے لیے سوچ بچار کر رہے تھے۔ شیدی کو اپنے جرم کی بھی خبر نہ تھی اور وہ عیدگاہ میں موجود خوش پوش مسلمانوں کے قہر اور مار پیٹ کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ شاید غربت و افلاس اس کا جرم تھا، جس کی وجہ سے وہ الزامات میں گھرا ہوا تھا۔ بقول شاعر:

صبر کرتی ہی رہی بے چارگی ظلم ہوتا ہی رہا مظلوم پر (اکبر حیدری کشمیری)

مصنف بتاتے ہیں کہ شیدی کو سزا دینے کے لیے لوگوں میں بحث مباحثہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کے کالے منہ پر چونے کی سفیدی پھیر دو۔ نیز اس معاملے کو تمام خوش پوش نمازی اس قدر سنجیدہ لے لیتے ہیں کہ جیسے شیدی کو سزا دینا ان کے صاحب ایمان ہونے کی دلیل ہے۔ وہ اس معاملے کو اس قدر سنجیدہ لیتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کا شور وغل بڑھ جاتا ہے۔ لیکن وہ اس کو سزا دینے کے لیے کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔

دراصل اس عبارت میں مصنف نے معاشرے میں موجود ناانصافی کو بیان کیا ہے۔ شیدی کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس کا جرم ثابت ہوا ہے۔ لیکن اس کے حلیے اور مفلسی کی وجہ سے سب اسے مجرم ٹھہراتے ہیں۔ نہ اُسے بولنے کا موقع دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے لگائے ہوئے الزامات کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ وہی خوش پوش، خوش لباس مسلمان ہیں جو اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے نئے کپڑے پہن کر عید کی نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے تھے اور کب سے دوزانو بیٹھے ملّا کا وعظ سن کر اپنے ایمان کو پختہ کر رہے تھے۔ بقول شاعر:

آشنائی خُدا سے کیسے ہو آج ہر شخص خود سے غافل ہے (مختار تلہری)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ پہلی صف میں موجود ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت، ہر دل عزیز، مشہور و معروف جناب محمود صاحب موجود تھے۔ سب کو محمود صاحب کی حفاظت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ انھیں یہ لگتا ہے کہ شیدی محمود صاحب کو قتل کرنے کے ارادے سے پہلی صف کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ضرور یہ کسی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے۔ اس لیے محمود صاحب جیسی نیک، خدا ترس اور ہر دل عزیز شخصیت کو قتل کرنے آیا تھا۔ اس نئے انکشاف پر لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں۔ محمود صاحب کی جان کی حفاظت کرنا ان کا اولین فرض تھا۔

دراصل مصنف نے معاشرے میں موجود تضاد کو پیش کیا ہے۔ ایک طرف شیدی جس کا کوئی جرم ثابت نہیں، اُسے بے بنیاد الزامات کی بنا پر بے دردی سے مارا پیٹا جا رہا ہے اور دوسری طرف مشہور و معروف شخصیت محمود صاحب ہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے ہر خاص و عام فکر مند ہے۔ یعنی اس معاشرے میں انسان کی کوئی عزت نہیں ہے۔ اس کی عزت و وقار کا معیار شہرت، دولت اور قیمتی لباس ہے۔ کسی دانا کا قول ہے کہ:

"محض لباس سے مردم شناسی نہیں ہو سکتی کیوں کہ آدمی کو بنانے والا خدا ہے اور لباس کا درزی"

اور بقول شاعر:

اندر کے میلے پن کا ملے کس طرح سُراغ اندازہ لوگ کرتے ہیں اُجلے لباس سے

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے، جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں امن و انصاف ہو، محبت عام ہو۔

امن ہو انصاف ہو اور ہو محبت کی فضا ایک دنیا ہم بنائیں اِک نئے عنوان سے (وجاہت علی سندیلوی)

عبارت نمبر 9

اچانک شیدی نے چھلانگ لگائی۔ وہ چیتے کی طرح چھال مارتا، بڑے بڑے ڈگ بھرتا، لوگوں، مصلوں، جُوتوں اور چپلوں کی کئی قطاریں پھلانگ گیا۔ پہلی صف میں محمود صاحب کے ساتھ شہر کے لائق افسران، صنعت کار، تاجر اور بینکر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گردنیں جھکائے اور دوزانو بیٹھے ہوئے تھے اور اخباری فوٹو گرافروں سے تصاویر کھنچوا رہے تھے۔ پہلی صف کے عین عقب میں، محمود صاحب کی حفاظت کے لیے سادہ کپڑوں میں حفاظتی عملہ کے برجستہ اور طاقت ور ارکان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہ ظاہر عید پڑھنے اور اللہ کی عظمت کے سامنے سربہ سجود ہونے آئے تھے، لیکن دراصل وہ محمود صاحب کی حفاظت کے لیے وہاں موجود تھے اور نئی صورتِ حال کے باعث چوکس ہو رہے تھے۔ ان کے نیفوں میں خطرناک اسلحہ چھپا ہوا تھا، اس لیے وہ بیٹھنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا لاغر شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں ساری صفوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف تک پہنچتا ہے۔ لوگ اس کے حلیے کی وجہ سے اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ لوگوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب شہر کے معززین کے ساتھ پہلی صف میں بیٹھے ہیں۔ شیدی کو دیکھ کر لوگ پریشان ہو جاتے ہیں اور انھیں محمود صاحب کی سلامتی کی فکر ہوتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اسے بے دردی سے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ابا زہوں۔ میں محمود کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں لوگوں کو پھلانگتا ہوا مصلوں، جوتوں اور چپلوں کی کئی قطاریں پھلانگ جاتا ہے۔ پہلی صف میں محمود صاحب کے ساتھ شہر کے لائق افسران، صنعت کار، تاجر اور بینکر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گردنیں جھکائے دوزانو بیٹھے اخباری فوٹو گرافروں سے تصاویر کھنچوا رہے تھے۔ عیدگاہ میں پہلی صف نامی گرامی شخصیات کے لیے مخصوص تھی۔ ان کے سوا کوئی عام انسان پہلی صف میں نماز ادا نہیں کر سکتا تھا اور شیدی جیسا کالا کلوٹا تو بالکل بھی نہیں۔ وہ تمام نامی گرامی شخصیات نہایت عاجزی کے ساتھ تصویریں کھنچوانے میں مصروف تھیں۔ ان تصویروں نے چند اخبار کی سرخیوں کی زینت بننا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی سے نہیں بیٹھا

تھا، نہ ہی وعظ سننے میں مصروف تھا۔ وہ تو فقط اسے عید کے دن کا تقاضا سمجھ کر پورا کر رہے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"بے شک منافق اللہ تعالیٰ سے دھوکا کر رہے ہیں اور وہ انھیں اس دھوکے کا بدلہ دینے والا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں اور یادِ الٰہی تو یوں ہی برائے نام کرتے ہیں۔"
(سورۃ النساء:142)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ پہلی صف کے بالکل پیچھے، محمود صاحب کے محافظ تھے جو عید گاہ میں نماز ادا کرنے کے بجائے ان کی حفاظت کے لیے وہاں موجود تھے۔ ان کا بنیادی فریضہ محمود صاحب کی حفاظت کرنا تھا نہ کہ پروردگار برتر کے آگے سجدہ ریز ہونا۔ ان کی توجہ کا مرکز محمود صاحب تھے۔ انھیں وعظ اور نمازِ عید میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کے لیے وہاں بیٹھنا بھی دشوار ہو رہا تھا کیوں کہ انھوں نے اپنے سادہ لباس کے نیفوں میں خطرناک اسلحہ چھپایا ہوا تھا۔ اس لیے ادھر بیٹھنا ان کے لیے محال تھا۔ نیز عید گاہ میں ہر جگہ دکھاوا ہی دکھاوا نظر آرہا تھا اور پہلی صف میں بیٹھے بظاہر جذبۂ ایمانی سے سرشار مسلمانوں کے دلوں میں ایمان جیسی کوئی شے موجود نہ تھی۔ ان کے ظاہر و باطن میں تضاد تھا۔ منافقت اور ریاکاری کے باوجود ان کی جگہ پہلی صف میں تھی۔ کیوں کہ وہ ملک کی مقبول و معروف شخصیات تھیں۔ بقول شاعر:

بہت سے کام دکھاوے کے کر رہا تھا میں — خدا کا شکر عبادت نہیں ہوئی مجھ سے — (جانزیب ساحر)

یا

توبہ یہ زمانہ کیسا ہے ہر بات پہ نازاں پیسہ ہے — محفوظ رہے ایماں اپنا ماحول زمانہ بدلا ہے — (نازاں شولاپوری)

مصنف بتاتے ہیں کہ شیدی کسی بات کی پروا نہیں کرتا اور پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں دوسری صف کو پھلانگ کر پہلی صف کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ تب اسے محمود صاحب کا حفاظتی عملہ جھپٹ کر قابو کر لیتا ہے۔ کیوں کہ ان کی موجودگی کا اصل مقصد ہی محمود صاحب کی جان کی حفاظت کرنا تھا۔ لہٰذا وہ شیدی کو گرفتار کرنے کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے اسے قابو کر لیتے ہیں۔ اس کا کوئی جرم ثابت ہوئے بغیر ہی اسے لاتیں، ٹھڈے، مکے اور گھونسے مارتے ہوئے وہ اسے عید گاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عید نماز پڑھنے سے زیادہ ضروری محمود صاحب کی جان کی حفاظت کرنا تھا۔ بقول شاعر:

مجھ سے رستے میں ٹھہرنے کی اذیت پوچھو — ٹھوکریں مار کے رستے سے ہٹایا گیا میں — (اسماعیل راز)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں امن و انصاف ہو، محبت عام ہو۔

امن ہو انصاف ہو اور ہو محبت کی فضا — ایک دنیا ہم بنائیں اِک نئے عنوان سے — (وجاہت علی سندیلوی)

عبارت نمبر 10

شیدی جب اچھلتا، چھلانگیں مارتا، دوسری صف پھلانگ کر پہلی صف کی طرف بڑھنے لگا، تب اسے حفاظتی عملہ کے عقابوں نے جھپٹ کر قابو کر لیا۔ وہ پلک جھپکنے میں ہی اسے لاتیں، ٹھڈے، مکے اور گھونسے مارتے عید گاہ سے باہر لے گئے جیسے کچھ ہوا ہی

نہیں تھا۔ لاؤڈ سپیکروں سے مولوی صاحب کی آواز گونجنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھ عرش کی طرف اٹھا کر، عاجزی، انکساری کے ساتھ اور مترنم انداز میں اللہ تعالیٰ سے محمود صاحب کی درازیِ عمر کی دعا مانگنے لگے۔ لوگوں کا خیال بدل گیا۔ وہ شیدی کو بھول کر پہلے محمود صاحب کی طویل عمری کی دعائیں اور پھر وعظ سننے لگے۔ انھوں نے اپنے نئے پرانے بوٹ اور چپل سجدہ گاہ سے انچ بھر کی دوری پر رکھے تھے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ عید کی صبح، عید گاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا لاغر شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں ساری صفوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس کے حلیے کی وجہ سے لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور اس پر آوازے کستے ہیں۔ وہ سب کی باتوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ لوگ وعظ سننے میں مصروف ہیں۔ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی شہر کے معززین کے ساتھ پہلی صف میں موجود ہیں۔ شیدی کو پہلی صف کے قریب دیکھ کر لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اسے بے دردی سے مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ شیدی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں محمود کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈراما نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں عید کی نماز ادا کرنے کے شوق میں صفیں پھلانگتا ہوا پچھلی صفوں سے اگلی صفوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنے حلیے اور سیاہ رنگت کی وجہ سے لوگوں کی نفرت کا نشانہ بھی بنتا ہے۔ اس کے لاغر حلیے کی وجہ سے لوگ اسے چور، جیب کترا سمجھتے ہیں اور اسے مارتے ہیں۔ وہ ان لوگوں سے اپنی جان چھڑا کر بالآخر پہلی صف میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہاں محمود صاحب کے ساتھ شہر کے تمام لائق افسر، تاجر اور بینکر موجود ہیں۔ اُسے دیکھ کر وہاں موجود تمام لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ محمود صاحب کو نقصان پہنچانے کے لیے پہلی صف میں داخل ہوا ہے۔ جب وہ پہلی صف کی طرف بڑھنے لگا تو محمود صاحب کے حفاظتی عملے نے اسے تیزی سے جھپٹ لیا اور اس پر قابو پا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب اُسے مارنے لگے۔ وہاں موجود لوگوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ شیدی کو کیوں مار رہے ہیں اور نہ ہی شیدی کو یہ خبر تھی کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ اسلام میں بھی کسی کو بلاوجہ تکلیف دینے کی مذمت کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر کچھ کیے ستاتے ہیں، تو انھوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اُٹھایا۔"
(سورۃ الاحزاب)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ شیدی کو لوگ مارتے ہوئے عید گاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ اس کے باہر جاتے ہی لوگ اسے بھول جاتے ہیں اور سب محمود صاحب کی درازیِ عمر کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ مولوی صاحب عاجزی، انکساری اور ترنم میں محمود صاحب کی لمبی زندگی کی دعا مانگتے ہیں۔ دراصل اس کے ذریعے مصنف نے معاشرتی ناہمواری، مذہبی پیشواؤں کے دوغلے پن اور معاشرے میں قائم ناانصافی کو اجاگر کیا ہے۔ مولوی صاحب کا آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر، محمود صاحب کے حق میں دعا کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ طبقہ جن کا معاشرے میں حق و باطل میں فرق کرنا فرض ہے، وہ بھی اپنے فرائض کو نظر انداز کرتے ہوئے طاقت ور کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ جنھیں حق کی صدا بلند کرنی چاہیے وہ بھی انصاف کی بجائے مفاد اور تعصبات کی

بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں۔ بقول شاعر:

قصرِ شہی میں جُبّہ و دستار بک گئے نیلام گھر میں قافلۂ سالار بک گئے (سرفراز سید)

اسلام میں بھی اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کے ترازو رکھ دیں گے، پس کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا، اور اگر کوئی رائی کے دانے کے برابر بھی (نیکی یا بدی) ہو تو ہم اسے لے آئیں گے، اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔''

(سورۃ الانبیاء 21:47)

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف کہتے ہیں کہ جو لوگ شیدی کو مجرم سمجھ کر اسے مار رہے تھے، وہ مولوی صاحب کے ساتھ محمود صاحب کی طویل عمر کی دعائیں مانگنے لگے اور ان کے ذہن سے شیدی بالکل غائب ہو گیا۔ وہ سب شیدی کو بھول گئے اور پھر سے وعظ سننے لگے۔ نماز کے تقدس میں ان لوگوں نے اپنے نئے اور پرانے جوتے سجدہ گاہ سے تھوڑے سے فاصلے پر رکھے تھے۔ دراصل ادھر مصنف نے انسان میں موجود تضاد کو پیش کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں لوگوں کے اندر حقیقی تقدس سے زیادہ رسمی تقدس پایا جاتا ہے۔ یعنی جوتے تو سجدہ گاہ سے دور رکھتے ہیں لیکن عیدگاہ میں کسی بے گناہ کو سزا دینے سے گریز نہیں کرتے۔ بقول جون ایلیا:

آخر ہیں کون لوگ جو بخشے ہی جائیں گے تاریخ کے حرام سے توبہ کیے بغیر (جون ایلیا)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علم بلند کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پہلی صف میں نماز ادا کر کے وہ اپنی مفلسی کا فاصلہ ختم کر سکتا ہے۔ بقول شاعر:

میری صف سے جو آگے کی صفیں ہیں نمایاں فاصلہ ہے مفلسی کا (اعظمی ارحم)

شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں امن و انصاف ہو، محبت عام ہو۔

امن ہو انصاف ہو اور ہو محبت کی فضا ایک دنیا ہم بنائیں اِک نئے عنوان سے
(وجاہت علی سندیلوی)

عبارت نمبر (11)

عیدگاہ سے باہر ایک علیحدہ جگہ میں حفاظتی عملہ کے ایک بڑے افسر نے بید کی چھڑی کے پے در پے وار کرتے ہوئے شیدی سے پوچھا، ''بتاؤ، جواب دو۔ تم کس نیت سے پہلی صف کی طرف بڑھ رہے تھے؟'' مکّوں، گھونسوں اور تھپڑوں کے سبب شیدی کا پورا چہرہ خونم خون ہو گیا تھا۔ اس کا منھ خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ ''جواب دو۔'' پھر لاتیں اور مکّے، چہرے پر گھونسے اور پنڈلیوں پر لانگ بُوٹوں کی ٹھوکریں لگیں جواب دو کس کے ایجنٹ ہو؟ کس نیت سے آگے بڑھ رہے تھے؟'' شیدی کی ناک سے خون کے ریلے بہنے لگے۔ پیٹ اور کوکھ اور پسلیوں پر لاتیں پڑنے کے باعث اس کا جوڑ جوڑا کھڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ''پہلی قطار کی طرف کیوں اور کس نیت سے بڑھ رہے تھے؟'' عمل دار نے اسے پیٹ پر لات اور گردن پر مکا مارتے ہوئے پوچھا: ''جواب دو، کس ارادے سے پہلی صف کی طرف بڑھ رہے تھے؟'' شیدی نے خون کی کلی کر کے، منھ کو پھٹی قمیص کے بازو سے پونچھ لیا۔ اس کے کٹے پھٹے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے کمزور آواز میں کہا: ''میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں نمازیوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا، لاغر شیدی نامی شخص نظر آتا ہے۔ شیدی کو پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز ادا کرنے کا شوق ہے۔ وہ آخری صف میں کھڑا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔ اس کے حلیے اور غربت کی وجہ سے لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ پہلی صف تک پہنچتا ہے تو لوگوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی شہر کے معززین کے ہمراہ پہلی صف میں بیٹھے ہیں۔ ان کے محافظوں نے شیدی کو دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر پکڑ لیا اور مار مار کر اسے لہولہان کر دیا۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ شیدی اپنی خون آلود آنکھوں اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں محافظ کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز ادا کروں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لیے صفوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف میں داخل ہوتا ہے۔ اس دوران میں وہ اپنے لاغر حلیے اور سیاہ رنگت کے باعث لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنتا ہے۔ اس کے حلیے کی وجہ سے لوگ اسے چور، جیب کترا سمجھتے ہیں اور ہر کوئی اسے اپنے تئیں سزا بھی دیتا ہے۔ لیکن وہ کسی بات کی پروا نہیں کرتا اور اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ جب شیدی پہلی صف میں داخل ہوتا ہے تو لوگ اسے پہلی صف میں موجود شہر کی سب سے معتبر شخصیت محمود صاحب کو قتل کرنے کے ارادے سے آنے والا مشتبہ شخص سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے محافظ پکڑ کر اسے عیدگاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے حفاظتی عملے میں سے ایک افسر لگاتار بید کی چھڑی سے شیدی کو مارتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ سچ سچ جواب دو تم کس نیت سے پہلی صف میں داخل ہوئے تھے؟ یہاں مصنف نے طبقاتی فرق کو ظاہر کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں پہلی صف میں نماز پڑھنے کی اجازت صرف امیر لوگوں کو ہے۔ اگر شیدی جیسے لاغر حلیے اور سیاہ رنگت والے لوگ اپنے دل میں پہلی صف میں نماز ادا کرنے کی خواہش لیے آگے بڑھیں گے تو نکال دیے جائیں گے۔ کیوں کہ پہلی صف میں نماز ادا کرنے کی اجازت صرف امیروں کو ہے اور غریبوں کو اس سے محروم رکھا جاتا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خدا کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک، اللہ کے نزدیک سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا، باخبر ہے۔''

(سورۃ الحجرات 49:13)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو اتنی بے دردی سے مارتے ہیں کہ اس کا منھ خون سے بھر جاتا ہے۔ وہ شیدی کو مارتے جاتے ہیں اور اس سے پوچھتے جاتے ہیں کہ تم کس نیت سے پہلی صف میں داخل ہوئے تھے۔ مار کھانے کی وجہ سے شیدی کا منھ خون سے بھر جاتا ہے اور وہ اسے جواب نہیں دے پاتا۔ ادھر مصنف نے ہمارے معاشرے میں موجود ظلم اور بربریت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شیدی کی غربت نے اسے اس قدر کمزور کر دیا کہ صرف الزام لگنے کی صورت میں اسے بے دردی سے مارا جاتا ہے۔ بقول شاعر:

کہیں پر ظلم کے شعلے کہیں پر خود پرستی ہے چمن کی آبرو خطرے میں ہے یہ بات سچی ہے
(علی خاں جوہر)

تشریح طلب عبارت میں مصنف مزید کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو اس قدر مارتے ہیں کہ اس کی ناک سے خون بہنے لگتا ہے۔ لاتیں اور ڈنڈے کھانے کی وجہ سے شیدی کے جوڑ تک ہل جاتے ہیں۔ تکلیف کی شدت اور کمزوری کے باعث اس

کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی محافظ اسے مارنا بند نہیں کرتے اور مسلسل مارتے رہتے ہیں۔ دراصل وہ شیدی سے اس کے جرم کا اقرار کروانا چاہتے تھے جو اس نے نہ کیا تھا اور نہ ہی کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یعنی وہ محمود صاحب کو قتل کرنے کے ارادے سے پہلی صف میں داخل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے لیے پر جوش انداز میں داخل ہوا تھا لیکن لوگوں نے اس کی ساری محنت کو ضائع کر دیا اور اس پر محمود صاحب کے قتل کی سازش کا الزام لگا کر اسے عیدگاہ سے باہر نکال دیا۔ بقول شاعر:

جبر سہتا ہوں مگر کب تک سہوں اِنسان ہوں　　صبر کرتا ہوں مگر دل صبر کے قابل نہیں　　(اکبر حیدری کشمیری)

محمود صاحب کا حفاظتی عملہ نہایت بے دردی سے شیدی کو مارتا ہے اور اس سے پہلی صف میں داخل ہونے کی وجہ پوچھتا ہے، جس پر شیدی خون کی کلی کر کے، اپنے منہ کو پھٹی ہوئی قمیص کے بازو کے ساتھ صاف کرتا ہے اور اپنے کانپتے اور کٹے پھٹے ہونٹوں کو ہلا کر کہتا ہے کہ میں پہلی صف میں نماز پڑھوں گا۔ اس کے کانپتے ہونٹ اس کی بے بسی کو ظاہر کر رہے تھے۔

اتنا کہا تھا فرش تری رہ کے ہم ہوں کاش　　سو تو نے مار مار کے آ کر بچھا دیا　　(میر تقی میر)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیز گاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ بقول شاعر:

آج کے دور میں جسے دیکھو　　مقصدِ زندگی سے غافل ہے　　(ابراہیم نوری)

عبارت نمبر 12

حفاظتی عملے کے چاق و چوبند جوان شیدی کا جواب سن کر کچھ کچھ پریشان ہو گئے۔ پھر، اس کے خراب حال اور سادہ شکل وصورت دیکھ کر ''کڑکڑ'' قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے کہا: ''ارے! تم پہلی قطار میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو گے؟'' ان میں سے ایک نے زوردار مکا شیدی کی پیشانی پر ناک کے قریب جمایا اور کہا: ''تم جھوٹ بولتے ہو۔''

پورا ماحول شیدی کی نگاہوں کے سامنے زیروزبر ہونے لگا۔ اس کی سانس سینہ میں دھڑکنے کی بجائے تڑپنے لگی۔ سانس بند ہونے لگی۔ ناک، مُنھ اور کانوں سے خون رستا، بہتا رہا۔ اس نے شکستہ لہجہ میں کہا، ''میں پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔'' حفاظتی عملے کے ایک تنومند نوجوان نے شیدی کے سینے پر گھونسے کا بھرپور وار کیا اور پھر اسے گالی دیتے ہوئے کہا: ''ڈرامہ کرتے ہو، سُوَر کے بچے! ہم تمھیں پہچان گئے ہیں۔ تم غیر ملکی ایجنٹ ہو۔''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ایک کالا کلوٹا شیدی عیدگاہ میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنا چاہتا ہے۔ وہ آخری صف سے اٹھ کر آہستہ آہستہ پہلی صف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی صف میں ملک کی مشہور سیاسی شخصیت محمود صاحب موجود ہیں۔ محمود صاحب کے حفاظتی عملے نے شیدی کو حراست میں لے لیا اور اسے مارتے پیٹتے عیدگاہ سے باہر لے گئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ محمود صاحب کے حفاظتی عملے نے شیدی کو غیر ملکی ایجنٹ سمجھ کر خوب مارا۔ تفتیش کے دوران میں شیدی اپنی خون آلود ناک اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں محمود صاحب کے محافظوں کے سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ وہ پہلی صف میں آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور پہلی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز ادا کروں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں بتایا گیا ہے کہ محمود صاحب کے محافظوں نے شیدی کو اپنی میں تحویل میں لے لیا ہے اور اسے غیر ملکی ایجنٹ سمجھ کر اس پر تشدد کر رہے ہیں۔ شیدی ایک غریب اور مفلوک الحال شخص ہے۔ عید کے دن وہ عیدگاہ میں پہلی صف میں جا کر نماز پڑھنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے حضور سب سے آگے کھڑا ہو کر عبادت کرے۔ پہلی صف میں صاحب حیثیت اور امیر لوگ بیٹھے ہیں۔ انھی میں ملک کی مشہور و معروف شخصیت محمود صاحب بھی شامل ہیں۔ شیدی ان کے برابر کھڑا ہو کر نماز ادا کرنا چاہتا ہے مگر اس کی نیت کو سمجھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ چناں چہ جیسے ہی وہ پہلی صف کی طرف بڑھا، حفاظتی عملے کے چاق و چوبند جوان اس کے پیچھے لپکے۔ اس کے حلیے کو دیکھ کر پہلے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے اور پھر اس پر تشدد کرنے لگے۔

شیدی نے جب انھیں بتایا کہ وہ پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنا چاہتا تھا تو محافظ اس پر قہقہے لگانے لگے۔ محافظ یہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ کوئی معمولی انسان، جس کے جسم پر بوسیدہ کپڑے ہوں، وہ امیر طبقے کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ شیدی کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں۔ اس کا معاشرے کے معززین میں شمار نہیں ہوتا۔ اس کا حلیہ غربت کی وجہ سے بگڑا ہوا ہے۔ شیدی یہ جرأت کیسے کر سکتا ہے کہ محمود جیسے نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت کے برابر جا کھڑا ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیدی جھوٹ بول رہا ہے اور اس کی نیت کچھ اور ہے۔ ان میں سے ایک محافظ نے ایک زوردار مکا شیدی کے منھ پر دے مارا۔ مکا اس کی پیشانی پر اس شدت سے پڑتا ہے کہ شیدی کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ دھندلا جاتا ہے۔ اس کی سانس بند ہونے لگتی ہے۔ اس کی ناک، منھ اور کانوں سے خون بہنے لگتا ہے۔ اس کی حالت اس قدر خراب ہو جاتی ہے کہ اس کے لیے کھڑا رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ سخت تکلیف میں، کانپتے ہونٹوں کے ساتھ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ میں پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔

ہوش و حواس، قلب و نظر، سجدہ و قیام　　اے عشق تیرے سارے ہی غم خوار بک گئے　　(سرفراز سید)

محافظوں کو یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص محض عبادت کی نیت سے اس قدر مار برداشت کر سکتا ہے۔ شیدی انھیں یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس پر شک کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیدی ڈرامہ کر رہا ہے۔ وہ اسے کہتے ہیں کہ تم غیر ملکی ایجنٹ ہو، تم محمود صاحب کو نقصان پہنچانے آئے ہو۔

حفاظتی عملے کے ایک طاقت ور نوجوان نے شیدی کے سینے پر ایک گھونسا مارا اور گالیاں دیں۔ اس نے اس پر غیر ملکی ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا۔ اس کا یہ الزام صرف ایک دفاع ہے۔ دراصل محافظ اپنے ضمیر کو تسلی دینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے جو ظلم کیا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ کسی غریب شخص کے مقصد اور جذبے میں بھی کوئی خلوص ہو سکتا ہے۔ بقول شاعر:

میں اسی شہر میں آنسو لیے پھرتا ہوں جہاں　　پیڑ چڑیوں کی مُناجات پر شک کرتے ہیں　　(جبار واصف)

یہاں شیدی ایک ایسا کردار ہے جو ہمارے معاشرے کی اس تلخ حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کسی غریب، نادار اور معمولی لباس میں ملبوس شخص کو ہر کوئی نظر انداز کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اسے بے رحمی سے کچلا جاتا ہے۔ کوئی غریب شخص اگر صرف عبادت کی نیت سے دل میں سچے ایمان کے جذبے کے ساتھ پہلی صف میں نماز پڑھنے کا خواہش مند ہو تو اس پر شک کیا جاتا ہے اور اسے ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ایک اور تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ مذہب اور عبادت کے اصل مفہوم کو ہم نے کس طرح مسخ کر دیا ہے۔ پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے مگر ہم نے اس حق کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ہم اللہ کے گھر میں بھی انسانوں کو ان کی دولت، ان کے لباس اور ان کے عہدوں کے مطابق عزت دیتے ہیں۔ شیدی کو سزا اس کے کسی جرم پر نہیں دی گئی۔

اسے یہ سزا اس کی نیت، اس کے ایمان اور اس کی سچائی پر دی گئی ہے۔ شیدی اس مظلوم طبقے کی علامت ہے جو صدیوں سے اپنے حق کے لیے مار کھا رہا ہے مگر پھر بھی خاموش نہیں ہوتا۔

شیدی جانتا ہے کہ اسلام مساوات کا درس دیتا ہے۔ اسلام کی نظر میں امیر غریب، سب برابر ہیں۔ نماز میں بادشاہ اور غلام، امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ سب ایک ہی رب کی عبادت کرتے ہیں، ایک ہی رب کے سامنے جھکتے ہیں، اس لیے سب ایک اللہ کے بندے ہیں۔ محمود و ایاز کا فرق دُنیا میں شاید قائم رہے لیکن مرنے کے بعد محمود نے بھی اور ایاز نے بھی قبر میں جانا ہے۔ بقول دلاور فگار:

؎ ایک ہی تربت میں سو جائیں گے محمود و ایاز — دُور ہو جائے گا فرق بندہ و بندہ نواز

مصنف نے نہایت سادگی مگر گہرائی سے یہ سچ بیان کیا ہے کہ طاقت ور ہمیشہ سچ سے ڈرتا ہے اور سچ کہنے والا ہمیشہ تنہا ہوتا ہے، شیدی بھی تنہا ہے مگر وہ جھوٹوں کی بھیڑ میں ایک سچا ہے، سچ ہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایسا شخص ہی تاریخ کے اوراق پر زندہ رہتا ہے: بقول شاعر:

؎ جو سیکھے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا — وہی اوراق پر تاریخ کے بیدار ہے ساقی

(وجاہت علی سندیلوی)

عبارت نمبر 13

شیدی مُکا کھا کر پیچھے ہٹ گیا، جا کر دیوار سے لگا۔ ''بتاؤ!'' پھر لاٹھیاں برسنے لگیں: ''بتاؤ، کس کے ایجنٹ ہو؟'' ''میں ایجنٹ نہیں ہوں۔'' شیدی ہُنجھنے لگا، اس نے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے کہا: ''میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔'' ''اَبے لنگور!'' ایک موٹے تگڑے اہلکار نے اسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا: ''زندگی بھر کبھی آئینہ دیکھا ہے! چلا ہے پُتر پہلی قطار میں نماز پڑھنے!'' شیدی کی سانسوں کا سلسلہ اس کی ناک سے بہتے خون کے سبب ٹوٹنے لگا۔ اس نے کہا: ''میں پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔'' ''اَبے اونٹ کے بچے!'' موٹے تگڑے عمل دار نے کہا: ''شہر کے معزز لوگ محمود صاحب کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے پہلی صف میں موجود ہیں۔ تم پہلی صف میں کیسے نماز پڑھو گے؟''

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ ایک کالا کلوٹا شیدی عیدگاہ میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنا چاہتا ہے۔ وہ آخری صف سے اٹھ کر آہستہ آہستہ پہلی صف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی صف میں ملک کی مشہور سیاسی شخصیت محمود صاحب موجود ہیں۔ محمود صاحب کے حفاظتی عملے نے شیدی کو حراست میں لے لیا اور اسے مارتے پیٹتے عیدگاہ سے باہر لے گئے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ محمود صاحب کے حفاظتی عملے نے شیدی کو غیر ملکی ایجنٹ سمجھ کر خوب مارا۔ تفتیش کے دوران میں شیدی اپنی خون آلود ناک اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں محمود صاحب کے محافظوں کے سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ وہ پہلی صف میں آنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایاز ہوں اور پہلی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈراما نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشاندہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں شیدی ایک ایسا کردار ہے جو مکمل طور پر مظلومیت، سچائی اور طبقاتی تفریق کی علامت ہے۔'' معاشرے کے اس طبقے کا ایک فرد ہے جسے ہم اکثر نظر انداز کرتے یا اس کی موجودگی کو کمتر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ شیدی پر جو ظلم ہوتا ہے'' محض جسمانی اذیت نہیں بلکہ روحانی اور انسانی سطح پر بھی ایک المیہ ہے۔ شیدی پہلی صف میں نماز پڑھنے کی معصوم خواہش لیے آگے

بڑھتا ہے مگر اس پر ایسے ستم ڈھائے جاتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا مجرم ہو۔ شیدی کی خواہش ہے کہ وہ پہلی صف میں نماز پڑھ کر محمود و ایاز کا فرق مٹا دے۔ بقول شاعر:

؎ میری صف سے جو آگے کی صفیں ہیں — نمایاں فاصلہ ہے مُفلسی کا (اعظمی ارحم)

شیدی پہلی صف میں نماز ادا کرنے کے شوق میں نمازیوں کو پھلانگتا ہوا پہلی صف میں داخل ہوتا ہے۔ لوگ اسے چور اچکا اور جیب کترا سمجھ لیتے ہیں۔ پہلی صف میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ ان کے محافظ شیدی کو ان کا دشمن سمجھتے ہیں اور اسے پکڑ کر عیدگاہ سے باہر لے جاتے ہیں۔ وہ اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ پہلی صف میں کیوں جانا چاہتا تھا۔ شیدی انھیں اپنا مقصد بتاتا ہے لیکن وہ شیدی کو غیر ملکی ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ شیدی سے سچ اگلوانے کے لیے وہ اس پر تشدد کرتے ہیں۔ ایک جوان محافظ نے شیدی کے منھ پر ایک مکا مارا۔ مکا کھا کر شیدی پیچھے ہٹ گیا اور دیوار سے جا لگا۔ وہ ایک کمزور اور لاغر شخص ہے مگر اس کے دل میں عزم و یقین کی طاقت ہے۔ محافظوں کا حوصلہ جواب دینے لگتا ہے۔ وہ لاٹھیاں برساتے ہیں، چیختے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کس ملک کے ایجنٹ ہو؟ شیدی انھیں بتاتا ہے کہ وہ کسی کا ایجنٹ نہیں۔ وہ صرف پہلی صف میں نماز پڑھنا چاہتا ہے۔

ایک موٹے تگڑے اہل کار نے اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسے تھپڑ رسید کیے اور کہا'' اَبے لنگور'' کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ یعنی تمھاری شکل سے وہ امارت اور رعب ظاہر نہیں ہوتا کہ تم پہلی صف میں امیروں کے ساتھ نماز پڑھ سکو۔ اہل کار کے طعنوں میں جو تذلیل چھپی تھی وہ شیدی کے پورے وجود کو زخمی کر دیتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسے اس لیے مارا جا رہا ہے کہ وہ خوب صورت نہیں، امیر نہیں، طاقت ور نہیں، کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ صرف ایک عام انسان ہے۔ عیدگاہ میں پہلی صف میں نماز ادا کرنے کا حق صرف امیروں کا نہیں۔ ہر مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ امیروں کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر اللہ کی عبادت کرے۔ اللہ کے نزدیک سب برابر ہیں۔ اس کی بارگاہ میں حسب نسب اور مقام و مرتبے کی کوئی اہمیت نہیں، اس کے نزدیک قابلِ عزت صرف متقی اور پرہیزگار ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے۔

''بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

اسلام کی تمام عبادات مساوات اور برابری کا درس دیتی ہیں۔ اس لیے لوگوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق اور امتیاز برتنا غلط ہے۔ بقول شاعر:

؎ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز (علامہ اقبالؒ)

مار کھا کر شیدی کے منھ سے خون بہنے لگتا ہے۔ اس کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ پہلی صف میں نماز پڑھے گا۔ اس کے لیے نماز محض ایک عبادت نہیں بلکہ اپنی عزت، اپنا وقار اور اپنے رب کے ساتھ ایک سچا تعلق ہے۔ لوگ اس کی نیت کو جھٹلا سکتے ہیں مگر اللہ اس کے دل کے حال کو خوب جانتا ہے۔

ایک اور اہل کار جوش میں آ کر اسے اونٹ کا بچہ کہتا ہے، پھر وہ شیدی سے کہتا ہے کہ شہر کے معزز لوگ محمود صاحب کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے پہلی صف میں موجود ہیں۔ تم جیسے غریب لوگ ایسے بڑے لوگوں کے ساتھ کیسے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عبادت بھی طبقاتی نظام سے بندھی ہوئی ہے۔ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے لیے صرف مسلمان ہونا کافی نہیں، وہاں تک پہنچنے کے لیے دولت، عہدہ اور مرتبہ ضروری ہے۔ ایک عام، غریب اور کمزور انسان کے لیے وہاں پہنچنا گناہ بن جاتا ہے۔

آنحضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم نے ذات پات، رنگ و نسل اور اونچ نیچ کی تفریق کو ختم کیا ہے۔ آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے:

''کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی برتری نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔''

اور بقول شاعر:

یہ اُسیؑ نے پردہ اُٹھادیا، یہ اُسیؑ نے سب کو بتادیا　　نہیں فرق ذرہ و مہر میں، نہیں فرق شاہ و ایاز میں　　(بہزاد لکھنوی)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علَم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ بقول شاعر:

نہ ہو گا تُو آگاہ عرفانِ حق سے　　گر اپنی حقیقت سے غافل رہے گا　　(میر محمدی بیداری)

عبارت نمبر 14

شیدی نے نحیف آواز میں کہا: "میں بھی پہلی صف میں محمود صاحب کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔" حفاظتی عملے کے تنخواہ داروں نے خوب قہقہے لگائے۔ ایک نے کہا: "اس کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔" "بہروپیا ہے۔" بڑے افسر نے اپنے عملے کو حکم دیتے ہوئے کہا: "اس سے پوچھو کہ یہ کون ہے اور محمود صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا ڈھونگ کیوں کر رہا ہے؟" پھر جو درگت بنانا ان کے حافظے میں محفوظ تھا، وہ درگت انھوں نے شیدی کی بنائی۔ لاتیں، مکے اور گھونسے مار مار کر اسے اَدھ موا کر دیا۔ شیدی فرش گزیں ہو گیا۔ انھوں نے اسے پھر اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے منھ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لے آئے۔ شیدی نے خون آلود آنکھیں کھول کر حفاظتی عملے کی طرف دیکھا۔ چاق و چوبند افسر نے اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے کہا: "بتاؤ، تم کون ہو؟ محمود صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟" شیدی بجھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں پُراسرار روشنی لوٹ آئی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا: "میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔"

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ عید کی صبح، عیدگاہ میں لوگوں کی بھیڑ میں ایک کالا کلوٹا شیدی نامی شخص نظر آتا ہے وہ پہلی صف میں نماز پڑھنے کے شوق میں صفوں کو پھلانگتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کے حلیے اور غربت کی وجہ سے اسے طعنے دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کے طعنوں کی پروا کیے بغیر آہستہ آہستہ پہلی صف تک پہنچ جاتا ہے۔ ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب بھی شہر کے معززین کے ہمراہ پہلی صف میں موجود ہیں۔ شیدی کو دیکھ کر لوگ پریشان ہو جاتے ہیں۔ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو دشمن ملک کا ایجنٹ سمجھ کر قابو کر لیتے ہیں اور اسے بے رحمی سے مارتے ہیں۔ وہ اسے اتنا مارتے ہیں کہ اس کا چہرہ لہولہان ہو جاتا ہے اور اس کے منھ، ناک اور کان سے خون بہنے لگتا ہے۔ وہ مارتے اور گالیاں دیتے ہوئے اس سے پہلی صف میں آنے کی وجہ پوچھتے ہیں۔

تشریح طلب عبارت سبق کی آخری عبارت ہے، اس لیے اس کا سباق نہیں ہے۔

تشریح

امر جلیل اردو اور سندھی زبان کے معروف ادیب، ڈرامہ نگار اور کالم نویس ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی خامیوں کی نشان دہی اور اصلاح کی ذمہ داری سرانجام دی ہے۔

مصنف کہتے ہیں کہ شیدی غربت، مفلسی اور بے بسی کا مارا ہوا ایک فرد ہے۔ اس کی زندگی محرومیوں سے بھری ہوئی ہے۔

اس کا کالا کلوٹا رنگ، خشک بال، بنجر آنکھیں، کمزور بدن اور پُرانے کپڑے اس کے حالات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ عید کے دن بھی وہ عیدگاہ میں اسی حالت میں آیا ہوا ہے۔ عید کا دن خوشیوں اور مسرتوں کا دن ہے۔ اس دن ہر طرف خوشیوں کا سماں ہے۔ ہر شخص نئے اور خوش بودار کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے۔ مگر شیدی کی آنکھوں میں چمک ہے نہ اس کے لباس میں خوش بو۔ اس کے بدن میں تازگی بھی نہیں۔ اس کے بدن پر لباس نہیں محض چیتھڑے ہیں جو اسے عید کے دن میسر ہیں۔

بے زری　فاقہ کشی　مفلسی　بے سامانی　　ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

(نظیر اکبرآبادی)

تشریح طلب عبارت میں مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو نہایت بے رحمی سے مارتے ہیں۔ وہ اسے اتنا مارتے ہیں کہ اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ وہ شیدی کو مار مار کر اس کی حالت بگاڑ دیتے ہیں۔ لاتیں، مکے اور گھونسے مار کر اسے تباہ حال کر دیتے ہیں۔ شیدی کی حالت مرنے کے قریب ہوتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ مارنے والوں پر اس کا کوئی جرم ثابت نہیں۔ وہ صرف بے بُنیاد الزامات اور قیاس آرائیوں کی بنا پر شیدی کو مار پیٹ رہے تھے اور اس جرم کا اقرار کرانا چاہتے تھے جو جرم نہ تو اس نے کیا تھا اور نہ ہی اس کے وہم و گماں میں تھا۔ عید نماز پڑھنے آئے مسلمانوں نے شیدی کو نہایت بے دردی سے مارا اور یوں مارا جیسے اسے مارنا ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ جب کہ اسلام میں کسی کو بے جا سزا دینے کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ حدیثِ قدسی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں::

"میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے اور اسے تمھارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔"
(صحیح مسلم:6572)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ شیدی ان کے ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے فرش پر گر جاتا ہے۔ وہ شیدی کو زمین سے اٹھا کر کھڑا کرتے ہیں۔ اس کے منھ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لاتے ہیں۔ وہ شیدی سے اس جرم کا اقرار کرانا چاہتے ہیں جو اس نے کیا ہی نہیں۔ وہ اپنی خون آلود آنکھیں کھول کر حفاظتی عملے کی طرف دیکھتا ہے۔ جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کی آنکھوں میں اتر آیا ہے۔ وہی آنکھیں جن سے اس نے پہلی صف میں نماز پڑھنے کا خواب دیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس خواب کی تعبیر اتنی الم ناک ہو گی۔ بقول شاعر:

جو ہیں مظلوم ان کو تو تڑپتا چھوڑ دیتے ہیں　　یہ کیسا شہر ہے ظالم کو زندہ چھوڑ دیتے ہیں　　(عباس دانا)

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ چاق و چوبند افسر شیدی کے بالوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر کہتا ہے کہ بتاؤ تم کون ہو؟ اور محمود صاحب کے ساتھ پہلی صف میں نماز کیوں پڑھنا چاہتے ہو۔ بے تحاشا مار کھانے کی وجہ سے شیدی بجھنے لگتا ہے۔ اپنے خون آلود چہرے اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں جواب دیتا ہے کہ میں ایاز ہوں۔ میں محمود کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔ دراصل مصنف نے انسانی برابری کو پیش کیا ہے جو بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں موجود نہیں۔ شیدی اور محمود کے ذریعے مصنف نے معاشرے میں موجود دو طبقوں کو بیان کیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ اس کے نزدیک کوئی تفریق نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو، بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا خبردار ہے۔"
(سورۃ الحجرات: آیت نمبر ۱۳)

اسلام نے انسان کو مساوی حقوق دیے ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شیدی اور دوسرا محمود۔ خدا کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ لیکن پھر بھی شیدی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ محمود کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز ادا کر سکے۔ اسلام کی نظر میں محمود و ایاز برابر ہیں اور اسلام انھیں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت بھی دیتا ہے اور تلقین بھی کرتا ہے۔

ے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ بندہ نواز (علامہ اقبالؒ)

ہمارے سماج میں پستی کا یہ عالم ہے کہ عزت صرف ظاہری حلیے اور مال و دولت کے ساتھ جڑی ہے۔ لوگ کسی کے کردار اور اس کی پرہیزگاری کی وجہ سے اسے قابلِ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اس کی دولت، لباس اور عہدے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے ہیں۔

شیدی کے لیے پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا صرف ایک عبادت نہیں بلکہ ایک جدوجہد ہے۔ یہ جدوجہد ان تمام قوتوں اور نظریات کے خلاف ہے جنھوں نے لوگوں کو طبقوں میں بانٹ کر غریبوں کا استحصال کیا ہے۔ شیدی اگرچہ ایک عام مسلمان ہے لیکن اسے یقین ہے کہ انسان کی عزت صرف اس کا چہرہ، لباس، مقام اور دولت دیکھ کر نہیں کی جاتی۔ وہ معاشرتی درجہ بندی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی محرومیوں کے باوجود حق کا علم بلند کرتا ہے۔ شیدی کا کردار ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہمارے نظام میں خرابی کہاں ہے؟ ہم کس طرح انسانیت سے دور ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے مذہب کی خوب صورت تعلیمات سے کیوں غافل ہو گئے ہیں اور ہم کس طرح ایک بہتر معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ بہتر معاشرہ بہتر افراد سے بنتا ہے۔ بہتر افراد بہترین کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ بقول شاعر:

ے تیرا سرمایہ، تری دولت، یہی اک چیز ہے ایک پل کردار کی تعمیر سے غافل نہ ہو (انیس دہلوی)

مشقی سوالات

سوال نمبر:۱۔ مختصر جواب دیں۔

۱۔ **افسانہ نگار نے شیدی کا تعارف کن الفاظ میں بیان کیا ہے؟**

جواب۔ شیدی ادھیڑ عمر کا طویل قامت شخص تھا۔ اس کا رنگ کالا، بال خشک، آنکھیں بنجر، بدن نحیف و نزار اور کپڑے پھٹے پرانے تھے۔

۲۔ **عید گاہ کا منظر بیان کریں۔**

جواب۔ مصنف کراچی عید گاہ کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پوری عید گاہ طرح طرح کے لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ بے شمار قطاروں میں نمازی اپنے اپنے انداز میں بیٹھے عید کی نماز شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور کچھ کے کپڑے پرانے مگر دھلے ہوئے تھے۔ عید گاہ میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے سارے رنگ زمین پر اُتر آئے ہیں۔

۳۔ **شیدی کی حمایت کس نے کی اور اس پر لوگوں کا ردعمل کیا تھا؟**

جواب۔ شیدی کی حمایت ماموں خاں موچی نے کی تھی۔ لوگوں نے اُسے طنز کا نشانہ بنایا اور کہا کہ بھاگ جا موچی! تو جا کر پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کر ہم خود اس کی خبر لیں گے۔

سوال نمبر:۴۔ پہلی صف میں کون لوگ تشریف فرما تھے؟

جواب۔ پہلی صف میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت محمود صاحب اور ان کے ساتھ شہر کے لائق افسران، صنعت کار، تاجر اور بینکر بیٹھے ہوئے تھے۔

۵۔ **حفاظتی عملے نے شیدی کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟**

جواب۔ مصنف کہتے ہیں کہ محمود صاحب کے محافظ شیدی کو نہایت بے رحمی سے مارتے ہیں۔ وہ اسے اتنا مارتے ہیں کہ اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ وہ شیدی کو مار مار کر اس کی حالت بگاڑ دیتے ہیں۔ لاتیں، مکے اور گھونسے مار کر اسے تباہ حال کر دیتے ہیں۔

۶۔ **''میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔'' یہ جملہ علامہ اقبالؒ کے کس شعر کی طرف نشان دہی کرتا ہے؟**

جواب۔۶۔ ''میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔'' یہ جملہ علامہ اقبالؒ کے مشہور زمانہ شعر

ے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سوال نمبر:۲۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں۔

۱۔ شیدی کی اداس آنکھوں میں پراسرار............ ابھر آئی تھی۔

۲۔ فرشتوں جیسے ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ کی چٹکی کاٹتے ہوئے کہا لاحول ولا قوۃ! ''میرا............ کا مصلیٰ میلا کر دیا۔

۳۔ ماموں خاں موچی دھکے ٹھڈے کھا کر............ سے غائب ہو گیا۔

۴۔ بدبخت ضرور کسی دشمن ملک کا............ ہے اور محمود صاحب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۵۔ پورا ماحول شیدی کی نگاہوں کے سامنے............ ہونے لگا۔

جوابات

۱	روشنی	۲	دبئی	۳	منظر	۴	ایجنٹ	۵	زیروزبر

سوال نمبر:۳۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

عہدِ حاضر کا انسان انٹرنیٹ، سمارٹ فونز، کمپیوٹر، ٹیبلٹ اور لیپ ٹاپ کے ذریعے سے پوری دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا بھر کی معلومات تک اس کی رسائی ممکن ہو چکی ہے۔ وہ پرنٹ میڈیا (Print Media) سے ہاٹ میڈیا (Hot Media) کی طرف رغبت اختیار کر چکا ہے۔ سچ اور جھوٹ سے آلودہ معلومات سوشل میڈیا پر جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ اس صورت حال میں معلومات کی حقیقت کو جانچنے کے لیے میڈیا انفارمیشن لٹریسی (MIL) وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کی مدد سے تنقیدی سوچ کی مہارت کو فروغ دے کر معلومات کی جانچ پڑتال اور اس کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کی تنقیدی سوچ اور بامقصد زندگی کو فروغ دینے کی خواہش رکھتے ہیں تو ان میں غلط خبروں کے بارے میں شعور بیدار کرنا، جعلی خبروں کو بغیر تصدیق کے پھیلانے سے روکنا ہوگا۔ غلط اطلاعات و معلومات معاشرے کے لیے مضر نتائج کا باعث اور رائے عامہ پر منفی اثر ڈال سکتی ہیں۔ میڈیا انفارمیشن لٹریسی درحقیقت میڈیا اور معلومات تک مؤثر طریقے سے رسائی کا نام ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے میں متنوع نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی، ثقافتی تفہیم اور احترام کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں میڈیا انفارمیشن لٹریسی کو باقاعدہ تعلیمی نصاب میں شامل کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ بچوں میں میڈیا پیغامات کو ڈی کوڈ کرنے اور ڈیجیٹل میڈیا کو ابتدائی اور موثر طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت پیدا کی جا چکی ہے۔ ان ممالک میں سکول، کالج اور یونی ورسٹی سطح کے نصابات میں اسے بطور مضمون شامل کرنے کے علاوہ میڈیا انفارمیشن لٹریسی کے متعدد منصوبوں کے ذریعے عام شہریوں کو بہتر انداز میں ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا کو استعمال کرنے کے بارے میں آگاہی دی جا رہی ہے۔

سوالات:

۱۔ **عہدِ حاضر کا انسان کن نئی ایجادات سے جڑا ہوا ہے؟**

جواب۔ عہدِ حاضر کا انسان انٹرنیٹ، سمارٹ فون، کمپیوٹر، ٹیبلٹ اور لیپ ٹاپ کے ذریعے سے پوری دنیا سے جڑا ہوا ہے۔

۲۔ **میڈیا انفارمیشن لٹریسی کے بغیر سوشل میڈیا کے منفی پہلو کون کون سے ہیں؟**

جواب۔ میڈیا انفارمیشن لٹریسی کے بغیر سوشل میڈیا پر جھوٹی اور جعلی خبریں پھیلتی ہیں جو رائے عامہ پر منفی اثر ڈالتی ہیں۔

۳۔ **''MIL'' کن انگریزی الفاظ کا مخفف ہے؟**

جواب۔ ''MIL'' میڈیا انفارمیشن لٹریسی کا مخفف ہے۔

۴۔ **جعلی خبروں کو پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟**

جواب۔ جعلی خبروں کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ضروری ہے کہ خبر کی تصدیق کر لی جائے اور تنقیدی سوچ استعمال کی جائے۔

۵۔ **ترقی یافتہ ممالک میں میڈیا انفارمیشن لٹریسی کی کیا صورت حال ہے؟**

جواب۔ ترقی یافتہ ممالک میں میڈیا انفارمیشن لٹریسی سکول، کالج اور یونی ورسٹی کے نصاب میں بطور مضمون شامل ہے۔ وہ لوگ ڈیجیٹل میڈیا کو مؤثر طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت حاصل کر چکے ہیں۔

٦۔ اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

جواب۔ MIL کی ضرورت واہمیت

زبان شناسی

سوال نمبر:۴۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

چودہ طبق روشن ہونا، کندھا دینا، وارے نیارے ہونا، ہاتھ پسارنا، مزہ دو بالا ہونا، بے دم ہو جانا، لبوں پر مسکراہٹ کھیلنا

جوابات:

محاورت	جملے
چودہ طبق روشن ہونا	پولیس کی مار سے چور کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔
کندھا دینا	غریب آدمی کو کوئی کندھا نہیں دیتا۔
وارے نیارے ہونا	مہنگائی کی وجہ سے ذخیرہ اندوزوں کے وارے نیارے ہو گئے۔
ہاتھ پسارنا	قناعت کرنے والے کو کسی کے آگے ہاتھ پسارنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔
مزہ دو بالا ہونا	بادل آنے سے پیچ کا مزہ دو بالا ہو گیا۔
بے دم ہو جانا	لوگوں کی مار سے مجرم بے دم ہو گیا۔
لبوں پر مسکراہٹ کھیلنا	بیٹے کی کامیابی کی خبر سن کر ماں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

سوال نمبر:۵۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں۔

صلیب، مصلّی، قہقہہ، نشست، چمک، ارتکاب، ورگت، نیت، چہرہ

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
صلیب	صَلِیْبْ	مصلّی	مُصَلّٰی	قہقہہ	قَہْقَہَہ	نشست	نِشَسْت
ارتکاب	اِرْتِکَابْ						

سوال نمبر:٦۔ سبق "تاریخ کا کفن" کا خلاصہ تحریر کریں۔ جواب۔ دیکھیے سبق کا خلاصہ

تلخیص نگاری:

کسی عبارت کو کم از کم الفاظ میں اس طرح لکھنا کہ اس عبارت کا تاثر برقرار رہے اور کوئی بات محل نظر نہ ہو، تلخیص نگاری کہلاتی ہے۔ تلخیص اصل عبارت کی عموماً ایک تہائی ہوتی ہے مگر عبارت کے اصل نکات ضرور درج کیے جاتے ہیں۔ تلخیص جامع پیراگراف کی صورت میں لکھتے ہیں۔ غیر ضروری تراکیب، مترادفات، تشبیہات سے گریز کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر:۷۔ درج ذیل عبارت کی تلخیص لکھیں جو متن کا ایک تہائی ہو، موزوں عنوان بھی تجویز کریں۔

درختوں کی بہتات ہوا میں موجود آبی بخارات میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور بارش کے ذریعے سے فضائی آلودگی کو کم کرنے میں اہم کردار انجام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ درختوں کی وجہ سے زمینی اور صوتی آلودگی بھی کم ہوتی ہے۔ وہ علاقے جہاں سیم اور تھور زیادہ ہو، وہاں درخت زمین سے پانی جذب کر کے زیرِ زمین کھاری پانی کی مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔ اس طرح پانی کی سطح نیچے چلی جاتی ہے اور زمین قابلِ کاشت بن جاتی ہے۔ پھل دار درخت اور پھول دار پودے مناظرِ فطرت کو پرکشش بناتے ہیں۔ سبزہ مال مویشیوں کی خوراک بنتا ہے۔ درختوں کی وجہ سے فرنیچر، ریشم اور گتہ سازی جیسی صنعتیں فروغ پاتی ہیں۔ درخت نہ صرف ہمارے بہترین دوست ہیں بلکہ ان پر بے شمار پرندے گھونسلے بناتے، پرورش پاتے اور چہچہاتے ہیں، اس لیے انھیں بلاوجہ ایندھن کی نذر نہیں کرنا چاہیے۔

جواب۔

تلخیص: درخت بارش کا سبب بنتے ہیں۔ ان سے فضائی، زمینی اور صوتی آلودگی کم ہوتی ہے۔ یہ سیم و تھور کو ختم کرتے ہیں۔ ان سے ماحول پرکشش ہوتا ہے۔ ان سے خوراک اور فرنیچر جیسی صنعتیں چلتی ہیں۔ یہ پرندوں کے مسکن ہیں۔ انھیں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

عنوان: درختوں کی اہمیت

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ امر جلیل کب پیدا ہوئے؟
(الف) 1930ء میں (ب) 1933ء میں (ج) 1936ء میں (د) 1939ء میں (ج)

2۔ امر جلیل کا اصل نام ہے:
(الف) قاضی جلیل حسین (ب) قاضی محمد جلیل (ج) قاضی جلیل احمد (د) قاضی عبدالجلیل (د)

3۔ امر جلیل کس شہر میں پیدا ہوئے؟
(الف) حیدرآباد (ب) روہڑی (ج) کراچی (د) خیر پور (ب)

4۔ امر جلیل نے ابتدائی تعلیم کس شہر سے حاصل کی؟
(الف) کراچی سے (ب) حیدرآباد سے (ج) روہڑی سے (د) خیر پور (الف)

5۔ امر جلیل نے اقتصادیات اور تاریخ کے مضامین میں ایم۔اے کیا:
(الف) پنجاب یونی ورسٹی سے (ب) سندھ یونی ورسٹی سے
(ج) جامعہ کراچی سے (د) علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے (ج)

6۔ امر جلیل نے کن زبانوں میں تحریریں لکھیں؟
(الف) اُردو اور سرائیکی (ب) اُردو اور سندھی (ج) اُردو اور پنجابی (د) اُردو اور پشتو (ب)

7۔ امر جلیل نے کس یونی ورسٹی میں خدمات انجام دیں؟
(الف) جامعہ کراچی میں (ب) پنجاب یونی ورسٹی میں
(ج) سرگودھا یونی ورسٹی میں (د) علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں (د)

8۔ امر جلیل کو ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں کون سے اعزاز سے نوازا گیا؟
(الف) ہلالِ امتیاز سے (ب) ستارۂ امتیاز سے
(ج) آدم جی ایوارڈ سے (د) تمغائے حسنِ کارکردگی سے (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ عید نماز شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے اُٹھ کھڑا ہوا:
(الف) رحیمی (ب) شیدی (ج) سعیدی (د) عظیمی (ب)

2۔ شیدی کے بال تھے:
(الف) سیاہ (ب) سفید (ج) خشک (د) تر (ج)

3۔ شیدی کا بدن تھا:
(الف) صحت مند (ب) کمزور (ج) موٹا تازہ (د) نحیف و نزار (د)

4۔ وہ نمازیوں کی صف سے اُٹھ کھڑا ہوا:
(الف) پہلی صف سے (ب) دوسری صف سے (ج) تیسری صف سے (د) آخری صف سے (د)

5۔ وہ ادھیڑ عمر کا شخص تھا:
(الف) پست قامت (ب) طویل قامت (ج) درمیانہ قامت (د) مناسب قامت (ب)

6۔ شیدی کے کندھے ______ کی طرح سیدھے تھے:
(الف) تختہ (ب) چھڑی (ج) صلیب (د) پلیٹ (ج)

7۔ شیدی کی پشت زندگی کا بوجھ اُٹھاتے، برداشت کرتے بن چکی تھی:
(الف) کمان (ب) تیر (ج) نیام (د) تلوار (الف)

8- پوری عیدگاہ بھانت بھانت کے لوگوں سے اَٹی پڑی تھی:
(الف) لاہور کے (ب) ملتان کے (ج) اسلام آباد کے (د) کراچی کے (د)

9- عیدنماز شروع ہونے میں باقی تھے:
(الف) بیس منٹ (ب) پچیس منٹ (ج) تیس منٹ (د) چند لمحات (د)

10- مُلّا تاریخِ اسلامی کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ بے حد عقیدت اور ________:
(الف) محبت وخلوص سے (ب) جوش وخروش سے (ج) جوش وجذبے سے (د) متفق ودلائل سے (ب)

11- مُلّا لوگوں کے ________ کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہا تھا:
(الف) جذبۂ حب الوطنی (ب) جذبۂ جہاد (ج) جذبۂ سچائی (د) جذبۂ ایمانی (د)

12- عیدگاہ میں لوگوں کی نگاہیں اپنے اپنے مصلوں کے آگے رکھے ________ تھیں:
(الف) جوتوں پر (ب) موبائل پر (ج) رومال پر (د) پانی پر (الف)

13- عیدگاہ میں لوگوں کی ایک آنکھ جوتوں میں تو ایک گڑی ہوئی تھی:
(الف) بچوں میں (ب) دوستوں میں (ج) نمازیوں میں (د) مصلوں میں (الف)

14- صحت مند مُلّا، صحت مند آواز سے کر رہا تھا:
(الف) نصیحت (ب) تقریر (ج) خطاب (د) وعظ (د)

15- شیدی کو کہنی مارتے ہوئے ایک چڑیا جتنے نوجوان نے کہا" آدمی ہو کہ ________:
(الف) بندر (ب) جن (ج) تارکول (د) بھوت (ج)

16- ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ کی چٹکی کاٹتے ہوئے کہا:"میرا مُصلّی میلا کر دیا:
(الف) مصر کا (ب) دبئی کا (ج) سعودی عرب کا (د) شام کا (ب)

17- شیدی کو"ارے او بن مانس" کس نے کہا؟
(الف) ایک بچے نے (ب) ایک لڑکے نے (ج) ایک بوڑھے نے (د) ایک نوجوان نے (د)

18- ایک بھیگے نوجوان نے اداکاروں ایسے لہجے میں کہا" لگتا ہے ہجرت کر کے آیا ہے:
(الف) انڈیا سے (ب) امریکہ سے (ج) افریقہ سے (د) ویسٹ انڈیز سے (ج)

19- ایک ادھیڑ عمر شخص جو اونگھ رہا تھا، قہقہہ سن کر:
(الف) بیدار ہو گیا (ب) خوش ہو گیا (ج) ناراض ہو گیا (د) ہنس پڑا (الف)

20- اے لڑکو تمیں مار خانی مت دکھاؤ، وعظ سننے دو، کس نے کہا؟
(الف) ایک نوجوان نے (ب) ایک لڑکے نے (ج) ایک بوڑھے شخص نے (د) ایک ادھیڑ عمر شخص نے (د)

21- ایک نوجوان نے ادھیڑ عمر شخص کو فی البدیہہ کیا قرار دیا؟
(الف) چڑیا کے بچے (ب) ابابیل کے بچے (ج) عقاب کے بچے (د) چیل کے بچے (ب)

22- شیدی کو کتنے آدمیوں نے آگے آنے سے روک لیا؟
(الف) دو تین (ب) تین چار (ج) چار پانچ (د) پانچ چھے (ج)

23- پُراسرار روشنی واضح طور پر کس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی؟
(الف) زیدی کی (ب) شیدی کی (ج) سعیدی کی (د) فریدی کی (ب)

24- شیدی قدم اٹھاتا، چھلانگیں مارتا، نمازیوں کی کتنی قطاریں پھلانگ گیا:
(الف) دو چار (ب) تین چار (ج) چار پانچ (د) چھے سات (الف)

25- جو لوگ اپنے جوتوں اور بچوں کی حفاظت کر رہے تھے، وہ کس چیز کی طرح گردنیں پھیر کر شیدی کو دیکھنے لگے؟
(الف) کبوتر (ب) عقاب (ج) شتر مرغ (د) چیل (ج)

26- نمازیوں نے جب شور سنا تو جھپٹ کر اپنے اپنے جوتے اٹھا لیے اور گود میں بٹھا لیا:
(الف) دوستوں کے بچوں کو (ب) اپنے بچوں کو (ج) ہمسایوں کے بچوں کو (د) رشتہ داروں کے بچوں کو (ب)

27- شیدی کو قابو میں کر لیا، پُرحشمت، بہادروں اور ________:
(الف) پہلوانوں نے (ب) سورماؤں نے (ج) دلیروں نے (د) نڈروں نے (د)

28- مُلّا نے وعظ بند کر دیا اور منبر کے سب سے اونچے زینہ پر چڑھ کر دیکھنے لگا:
(الف) کھیل (ب) تماشا (ج) لڑائی (د) فساد (ب)

29- تمام مخلوق کا شیدی کی طرف ہو گیا:
(الف) دھیان (ب) خیال (ج) رُخ (د) چہرہ (الف)

30- ایک شخص نے بلند آواز میں کہا:"میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، یہ چور نہیں، نہ ہی جیب کترا اور نہ ہی:
(الف) ڈاکو ہے (ب) آوارہ ہے (ج) بدمعاش ہے (د) لفنگا ہے (د)

31- شیدی کی بے گناہی کی گواہی کس نے دی؟
(الف) ماموں خاں موچی نے (ب) ماموں خاں درزی نے (ج) ماموں خاں حلوائی نے (د) ماموں خاں حجام نے (الف)

32- ماموں خاں موچی دھکے، ٹھڈے کھا کر غائب ہو گیا:
(الف) عیدگاہ سے (ب) منظر سے (ج) سامنے سے (د) عقب سے (ب)

33- کسی نے مشورہ دیا کہ شیدی کو باندھ دو؟
(الف) چارپائی سے (ب) منبر سے (ج) بانس سے (د) درخت سے (د)

34- لوگوں نے شیدی کا منھ کالا کر کے کس جانور پر بٹھا کر جلوس نکالنے کا مشورہ دیا؟
(الف) گھوڑے (ب) گدھے (ج) خچر (د) اونٹ (ب)

35- ایک شخص نے بتایا کہ چور کا منھ ہمیشہ ہوتا ہے:
(الف) سیاہ (ب) نیلا (ج) کالا (د) سفید (ج)

36- پہلی قطار میں ملک کی کون سی مشہور و معروف شخصیت تھی؟
(الف) اختر صاحب (ب) محمود صاحب (ج) ایاز صاحب (د) اظہر صاحب (ب)

37- لوگوں کو کس کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی؟
(الف) جاوید صاحب (ب) نوید صاحب (ج) فیصل صاحب (د) محمود صاحب (د)

38- لوگوں نے شیدی کو کس ملک کا ایجنٹ قرار دیا؟
(الف) دشمن ملک کا (ب) دوست ملک کا (ج) ہمسایہ ملک کا (د) حریف ملک کا (الف)

39- جب یہ انکشاف ہوا کہ شیدی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے تو وہ ہو گئے:
(الف) ہوشیار (ب) خبردار (ج) حواس باختہ (د) پریشان (ج)

40- ایک شخص نے کہا کہ شیدی دشمن ملک کا ایجنٹ اور قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے:
(الف) محمود صاحب کو (ب) اسد صاحب کو (ج) جنید صاحب کو (د) وقاص صاحب کو (الف)

41- لوگ شیدی کو بھول کر کس کی طویل عمری کی دعائیں مانگنے لگے؟
(الف) عمیر صاحب کی (ب) محمود صاحب کی (ج) عاصم صاحب کی (د) شعیب صاحب کی (ب)

42- عیدگاہ سے باہر ایک علیحدہ جگہ پر کس نے بید کی چھڑی کے پے در پے وار کرتے ہوئے شیدی سے تفتیش کی؟
(الف) سپاہی نے (ب) گارڈ نے (ج) بڑے افسر نے (د) جونیئر افسر نے (ج)

43- مکوں، گھونسوں اور تھپڑوں کے سبب شیدی کا پورا چہرہ ہو گیا تھا:
(الف) زخمی (ب) خونم خون (ج) خون آلود (د) عرق آلود (ب)

44۔ اس کا منہ بھرا ہوا تھا:
(الف) خون سے (ب) پانی سے (ج) پان سے (د) تھوک سے (الف)

45۔ پیٹ اور کوکھ اور پسلیوں پر لاتیں پڑنے کے باعث اس کا جوڑ جوڑ:
(الف) ہل گیا تھا (ب) ٹوٹ گیا تھا (ج) اکھڑ گیا تھا (د) مشکل ہو گیا تھا (ج)

46۔ ''پہلی قطار کی طرف کیوں اور کس نیت سے بڑھ رہے تھے'' یہ کس نے پوچھا تھا؟
(الف) سپاہی نے (ب) گارڈ نے (ج) اہل کار نے (د) عمل دار نے (د)

47۔ شیدی نے خون کی کلی کر کے، منہ کو پھٹی قمیص کے بازو سے پونچھ لیا، اس کے کٹے پھٹے کا پنے لگے:
(الف) ہونٹ (ب) ہاتھ (ج) پاؤں (د) بازو (الف)

48۔ ایک اہل کار نے ایک زوردار مکا شیدی کی پیشانی پر ناک کے قریب جمایا اور کہا:
(الف) تم سچ کہتے ہو (ب) تم جھوٹ بولتے ہو (ج) تم غلط کہتے ہو (د) تم ٹھیک کہتے ہو (ب)

49۔ حفاظتی عملے کے ایک تنومند نوجوان نے شیدی کے سینے پر گھونسے کا بھرپور وار کیا اور پھر اسے گالی دیتے ہوئے کہا:
(الف) جھوٹ بولتے ہو (ب) فن کاری دکھاتے ہو (ج) ڈرامہ کرتے ہو (د) بدتمیزی کرتے ہو (ج)

50۔ شیدی ہچکنے لگا، اس نے ٹونٹے بکھرتے ہوئے کہا ''میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر۔۔۔۔
(الف) شور مچاؤں گا (ب) نماز پڑھوں گا (ج) اعلان کروں گا (د) خطاب کروں گا (ب)

51۔ ایک موٹے تگڑے اہل کار نے شیدی کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا ''زندگی بھر کبھی دیکھا ہے:
(الف) آئینہ (ب) بہروپیا (ج) ڈرامہ (د) اسٹیج (الف)

52۔ شیدی نے نحیف آواز میں کہا: ''میں بھی پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا:
(الف) احمد صاحب کے ساتھ (ب) زاہد صاحب کے ساتھ (ج) محمود صاحب کے ساتھ (د) عمیر صاحب کے ساتھ (ج)

53۔ حفاظتی عملے کے تنخواہ داروں نے خوب قہقہے لگائے۔ ایک نے کہا ''اس کا دماغ نہیں ہے:
(الف) درست (ب) ٹھکانے (ج) ٹھیک (د) اپنی جگہ پر (ب)

54۔ یہ محمود صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا کیوں _____ کر رہا ہے:
(الف) ڈرامہ (ب) جھگڑا (ج) ڈھونگ (د) شور (ج)

55۔ شیدی کی درگت بنانا ان کے _____ محفوظ تھا:
(الف) ذہن میں (ب) دل میں (ج) گمان میں (د) حافظہ میں (د)

56۔ اہل کاروں نے شیدی کی بنائی:
(الف) درگت (ب) بُری حالت (ج) تصویر (د) حجامت (الف)

57۔ اہل کاروں نے لاتیں اور گھونسے مار مار کر شیدی کو کر دیا:
(الف) بے ہوش (ب) زخمی (ج) سیدھا (د) ادھ موا (د)

58۔ شیدی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر لے آئے:
(الف) ہوش میں (ب) کمرے میں (ج) تھانے میں (د) جیل میں (الف)

59۔ شیدی کی آنکھوں میں _____ روشنی لوٹ آئی:
(الف) سُرخ (ب) نیلی (ج) پیلی (د) پُراسرار (د)

60۔ شیدی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا:
(الف) میں محمود ہوں (ب) میں شیدی ہوں (ج) مین ایاز ہوں (د) میں فیکا ہوں (ج)

سبق:۱۲ پاکستانی زبانیں اور ان کا باہمی رشتہ

مُصنف
ڈاکٹر ممتاز منگلوری
(1937-2011)

مصنف کا تعارف

ڈاکٹر ممتاز منگلوری تحصیل و ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔ شیروان ہائی سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے بی۔اے کیا۔ پشاور یونی ورسٹی سے آنرز اور پنجاب یونی ورسٹی سے ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی، لاہور میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ اسی دوران میں مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی میں ریسرچ آفیسر کے طور پر بھی کام کیا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران میں پی ایچ ڈی کی اور ایم۔اے تاریخ کا امتحان بھی پاس کیا۔ ۱۹۹۸ء میں مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ میں سبجیکٹ اسپیشلسٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں NWFP ٹیکسٹ بک بورڈ میں تعینات ہو گئی۔ ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے تو عالمی بنک کے ناردرن ایجوکیشن پراجیکٹ آزاد جموں و کشمیر میں کنسلٹنٹ کے طور پر فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو کے معروف مصنف، معلم اور پرنسپل پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہم وطن ہونے کے ناتے ان کے بہت قریب تھے اور انھی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو کی ترویج و اشاعت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی کاوش سے منگلور میں ایک لائبریری قائم کی اور وصیت کی کہ ہزارہ یونی ورسٹی میں جب بھی اُردو کا شعبہ قائم ہو تو میری لائبریری کی تمام کتابیں شعبۂ اُردو کو دے دی جائیں کیوں کہ اس ذخیرۂ کتب میں صرف اردو زبان و ادب کی کتابیں ہی جمع کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے عبدالحلیم شرر کے ناول ''ملک العزیز ورجینا'' کا متن مرتب کیا اور حواشی کے علاوہ ایک تنقیدی مقدمہ بھی تحریر کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''فردوسِ بریں'' اور ''اِندر سبھا'' وغیرہ جیسے ناولوں اور ڈراموں کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ ان کے مبسوط مقدمے بھی لکھے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی تصانیف میں ''طیفِ نثر'' اور ''طیفِ غزل'' کے علاوہ ''پاکستان میں اُردو کے سرکاری قاعدے''، ''ڈاکٹر سید عبداللہ کی اُردو خدمات''، ''شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، ''متاعِ لوح و قلم''، ''متاعِ نقد و نظر'' اور مختصر تاریخ زبان و ادب ہند کو وغیرہ شامل ہیں۔

اس سبق کی تدریس کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:
- ☆ طلبہ کو اُردو زبان کی مختصر تاریخ سے رُوشناس کرانا۔
- ☆ اُردو زبان کے لسانیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- ☆ طلبہ کو اُردو زبان کی وسعت اور مختلف زبانوں، بولیوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت کی مثالیں دینا۔
- ☆ طلبہ کو یہ حقیقت ذہن نشین کرانا کہ اُردو نہ صرف بین الصوبائی رابطے کی زبان ہے بلکہ وطنِ عزیز پاکستان کی اساس بھی ہے۔

مشکل الفاظ کے معانی

سبق (91) امنگ: (جوش، ولولہ، خواہش)، احساسات: (محسوسات، محسوس کی ہوئی باتیں)، تمدن: (شہری بود و باش، مل جل کر رہنا، سماجی زندگی)، معاشرت: (مل جل کر زندگی بسر کرنا، اجتماعی زندگی گزارنے کا ڈھنگ)، آئینہ دار: (ترجمان، عکاس)، مٹی بھا: (قیمتی، عمدہ، زیادہ قدر و قیمت کا)، خدوخال: (چہرہ مہرہ، شکل و صورت کی ساخت، حُلیہ)، مرہونِ منت: (احسان مند، شکر

گزار، احسان تلے دبے ہونا)، **تشخص**: (شخصیت، مجسم ہونے کی حالت و کیفیت، امتیاز، تمیز)، **صوفیا**: (غیر اللہ سے دل کو پاک رکھنے والے، متقی و پرہیز گار لوگ)، **فیوض**: (بخشش، برکات، فائدہ، نفع)، **برکات**: (برکت کی جمع، نعمتوں کی فراوانی)، **اخوت**: (بھائی چارہ، دوستی)، **مساوات**: (برابری، برابر ہونا یا کرنا، ہم سری)، **غیرت**: (شرم، حیا، احساسِ عزت، عزتِ نفس کا لحاظ و خیال)، **حمیت**: (خودداری، عزتِ نفس، غیرت، شرم)، **مہر و محبت**: (محبت اور شفقت، مہربانی)، **گونج**: (وہ آواز جو گنبد یا بند مکان میں دیر تک سنائی دیتی ہے، آواز، بازگشت)، **جھنکار**: (تلوار یا خنجر وغیرہ کے چلنے، گرنے یا ٹکرانے کی آواز)، **تخلیق**: (پیدائش، وجود میں آنا، مخلوق، ایجاد)، **قابلِ قدر**: (قدر کے قابل، تعظیم کے لائق)، **وقیع**: (باوقار، بُلند مرتبے والا، معزز)، **شاہ عبداللطیف بھٹائی**: (برصغیر کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچایا)، **سچل سرمست**: (سندھ سے تعلق رکھنے والے مشہور صوفی بزرگ، شاعر، فلسفی اور مفکر تھے۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کا سات زبانوں میں شاعری کرنا ہے، جس کے باعث آپ کو ''شاعرِ ہفت زباں'' بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ کے ادبی حلقوں میں آپ کی شہرت آج تک قائم ہے۔ جب کہ سندھی معاشرے میں سچ کی پہچان کے لیے آپ کا نام ''سچل'' بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کا کلام آج بھی سندھ کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے متعلق وافر مقدار میں معاشرتی، سماجی اور فکری افکار سے آشکار کرتا ہے۔ سچل سرمست اُردو اور فارسی کے نامور شعرا کے معاصر بھی تھے۔ جن میں غالب، راسخ عظیم آبادی، میر تقی میر، میر درد شامل ہیں۔)

سلطان باہو: (سلطان العارفین سخی سلطان باہو، یکم جمادی الثانی 1039ھ (17 جنوری 1630ء) بروز جمعرات وقتِ فجر شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں قصبہ شورکوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ آپ پنجابی زبان کے عظیم شاعر مانے جاتے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی پنجابی کافیاں آج بھی پڑھنے والوں کا دل موہ لیتی ہیں۔)، **وارث شاہ**: (پنجابی کی ہیر وارث شاہ مشہور زمانہ تصنیف ''ہیر'' کے خالق اور پنجابی زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ وارث شاہ شیخوپورہ سے 14 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع پنجاب کے ایک تاریخی قصبہ جنڈیالہ شیر خاں میں 5 ربیع الثانی 1130 ہجری بمطابق 1718ء میں پیدا ہوئے۔ وارث شاہ کا دور مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک کا دور ہے۔)، **بلھے شاہ**: (بلھے شاہ کا اصل نام سید عبداللہ شاہ تھا۔ آپ 1680ء میں پنجاب کے شہر اُچ گیلانیاں میں سخی درویش کے گھر پیدا ہوئے۔ قصور میں مشہور خطیب مولوی حافظ غلام مرتضیٰ سے ہندی، فارسی اور عربی، دین اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ عنایت اللہ قادریؒ کے مرید ہو کر فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی منزل پائی۔ پیری مریدی کے اس تعلق پر رشتہ داروں نے طعنے دیے۔ گھر بار چھوڑ کر مرشد کی خدمت کی اور ان کی وفات کے بعد خلیفہ بن گئے۔ آپؒ 1757ء میں قصور میں فوت ہوئے۔ **خوش حال خاں خٹک**: (پشتون جنگجو ہیرو، شاعر اور فلسفی، خوش حال خاں خٹک، نورالدین اکبر کے زمانے میں سرائے اکوڑ کے علاقے میں شہباز خاں کے گھر 1022ء میں پیدا ہوئے۔ باپ شہباز قبیلہ خٹک کے سردار اور مغلوں کی جانب سے علاقے کے جاگیردار (خان) تھے اور یہ خانی ان کو باپ دادا سے میراث میں ملی تھی۔)، **رحمان بابا**: (پشتو کے عظیم صوفی شاعر عبدالرحمٰن (1632ء-1711ء) مہمند قبیلے کی ایک شاخ غوریہ خیل سے تعلق رکھتے تھے۔ پشاور کے قریب بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے معتبر علما سے فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ پشتون شاعری کے حافظ شیرازی کہلاتے ہیں۔ مجموعہ کلام دیوان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پانچ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ آپ کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خوانی کے مقام پر ہے۔)، **جام دُرَک**: (اٹھارھویں صدی کے بلوچ صوفی شاعر تھے۔ وہ ڈومکی قبیلہ کے سردار کرم خاں کے صاحب زادے تھے۔ آپ ناصر کے زمانے میں قلات آ گئے اور ان کی سرپرستی میں مختلف علوم سے فیض حاصل کیا۔ شاہی خانوادے کے علاوہ عام لوگ بھی ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ جام دُرَک کی شاعری عوام الناس کے لیے شعری عطیہ کے علاوہ صوفیانہ قوتوں کی حامل بھی نظر آتی ہے۔ جام دُرَک کا 1784ء میں انتقال ہوا۔)، **مست توکلی**: (ولادت 1825ء-وفات 1892ء): (آپ کا اصل نام مست توکلی تھا۔ لیکن

پاکستانی مصنفین نے طوق مست یا طوق علی مست مشہور کر دیا ہے۔ اگرچہ بلوچستان کے عوام میں آپ اب تک مست توکلی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی صوفیانہ شاعری کے ذریعے انسانیت اور وطن سے محبت کا درس دیا ہے۔)

سبق (92) اصطلاح: وہ لفظ جس کے کوئی خاص معنی، کسی علم یا فن وغیرہ کے ماہرین نے یا کسی جماعت نے مقرر کر لیے ہوں۔

مرورِ ایام: (دنوں کا گزرنا، زمانے کا بیت جانا، وقت کا گزرنا)، **تغیرات**: (تبدیلی، بدلنا، ایک حالت سے دوسری حالت میں جانا، انقلاب)، **ہیئت**: (ظاہری بناوٹ، صورت، شکل، وضع قطع)، **ظہور میں آنا**: (کسی امر کا ظاہر ہونا، نمایاں ہونا، کوئی بات وقوع میں آنا)، **پیوست**: (ملا ہوا، جُڑا ہوا، چپکا ہوا)، **فوقیت**: (ترجیح، برتری، سبقت)، **واجب**: (لازم، ضروری)، **کوشاں**: (کوشش کرنے والا، دوڑ دھوپ کرنے والا)، **مقدور بھر**: (حتی الوسع، جہاں تک ممکن ہو، جہاں تک بس چلے)، **ہمہ گیری**: (سب پر چھائے ہونے کی کیفیت یا حالت، وسعت، پھیلاؤ)، **تحقیق**: (تلاش یا جستجو، حالات و واقعات کا معلوم کرنا اور بیان کرنا، چھان بین)، **استفادہ**: (فائدہ اٹھانا، نفع پانا)، **آمیزش**: (ملاوٹ، شمولیت، میل ملاپ، میل جول)، **لب و لہجہ**: (تلفظ، گفت گو کا طرز، انداز گفت گو، آواز کا اتار چڑھاؤ)، **تخلیق**: (پیدائش، پیدا کرنا، وجود میں آنا، ایجاد)، **ضامن**: (ضمانت دینے والا، ذمہ دار)

توضیحات

لوک ادب: عوامی ادب، وہ نظمیں، افسانے، اخلاقیاتی محاورے اور گیت وغیرہ جو سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اور جن کا تعلق عوام الناس سے ہوتا ہے۔

جنوبی ایشیا: براعظم ایشیا کے جنوبی علاقوں کو کہا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند اور ان سے ملحقہ علاقے۔ جنوبی ایشیا ان ممالک پر مشتمل ہے: بنگلہ دیش، بھارت، بھوٹان، نیپال، مالدیپ، سری لنکا، افغانستان، پاکستان۔

رسم الخط: کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت کا نام ہے۔ وہ زبانیں جو دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہیں، ان کو سامی خاندان کی زبانوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چناں چہ فارسی اور عربی زبان کو سامی زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُردو رسم الخط بھی فارسی و عربی سے ماخوذ ہے۔

روزمرہ: دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ جو اہلِ زبان کی بول چال کے مطابق حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہو، روزمرہ کہلاتا ہے۔ مثلاً: وہ آئے دن سکول سے غیر حاضر رہتا ہے۔ اس جملے میں ''آئے دن'' درست روزمرہ ہے جو اہلِ زبان کی بول چال کے مطابق ہے۔

محاورہ: قواعد کی رو سے محاورہ اسے کہتے ہیں جو کلمہ یا کلام حقیقی کی بجائے مجازی معانی میں آئے۔ یعنی لفظ کے لغوی معانی نہ لیے جائیں بلکہ وہ مخصوص مفہوم سمجھا جائے جو اہلِ زبان کی گفت گو میں رائج ہو۔

تلمیح: عربی زبان کے لفظ لمح سے نکلا ہے۔ تلمیح کے لغوی معنی ہیں اشارہ کرنا۔ شاعری کی اصطلاح میں تلمیح سے مُراد ایک لفظ یا مجموعۂ الفاظ کے ذریعے کسی تاریخی، سیاسی، اخلاقی یا مذہبی واقعے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے شعر کے معنوں میں وسعت اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ مطالعۂ شعر کے بعد پورا واقعہ پڑھنے والے کے ذہن میں واضح ہو جاتا ہے۔

ضرب المثل: کوئی فقرہ، جملہ، شعر یا مصرع جو زندگی کے بارے میں کسی خاص اصول، حقیقت یا رویے کو جامع اور بلیغ طور پر بیان کرے اور عوام و خواص اسے ترجمانی کے لیے استعمال کرنے لگیں، کہاوت کہلاتا ہے۔ اسی کو عربی میں ضرب المثل کہا جاتا ہے۔

روایات: کسی دوسرے کی بات نقل کرنا۔ اصطلاحِ محدثین میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کو یا آنحضرت ﷺ کے زمانے کے کسی واقعہ کو بیان کرنا، خواہ وہ راوی نے خود سنا یا دیکھا ہو یا کسی دوسرے راوی سے نقل کیا ہو۔ راوی کا قول، سرگزشت، حکایت، قصہ، کہانی یا بیان۔

حکایت: حکایت سے مُراد نظم یا نثر میں کوئی مختصر قصہ یا بیانیہ ہے جس میں کسی اخلاقی نکتہ کو نمایاں کیا گیا ہو۔ اکثر حکایات میں جانوروں یا پرندوں کو انسانوں کی طرح بولتے اور انسانوں جیسی حرکتیں کرتے دکھایا جاتا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اصل میں حکایتیں بہت پرانی ہیں۔

اقدار: اخلاقیات میں اقدار سے مُراد کسی شے یا کسی عمل کی اہمیت ہے، جس کا مقصد یہ متعین کرنا ہے کہ کیا کیا کام کرنا سب سے افضل ہے یا کیا طریقہ ہے جس سے معمول کی اخلاقیات اپنائی جاسکتی ہیں یا یہ واضح کرنا کہ مختلف کاموں کی کیا اہمیت ہے۔

نور: اُجالا۔ سورج، چاند یا کسی منبع سے پیدا ہونے والی روشنی، جو زمین اور اس میں موجود اشیا پر پڑتی ہے اور ہمیں اشیا نظر آتی ہیں۔

ادب: ادب زندگی کے اظہار کا نام ہے۔ ادب چوں کہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتی ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعے جذبے، احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔

میراث: وہ جائیداد جو کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو ملے، مردے کا مال جو وارثوں کو دیا جائے، ترکہ، ورثہ، جاگیر۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی: برصغیر کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچایا۔

سچل سرمست: سندھ سے تعلق رکھنے والے مشہور صوفی بزرگ، شاعر، فلسفی اور مفکر تھے۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کا سات زبانوں میں شاعری کرنا ہے، جس کے باعث آپ کو ''شاعرِ ہفت زباں'' بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ کے ادبی حلقوں میں آپ کی شہرت آج تک قائم ہے۔ جب کہ سندھی معاشرے میں سچ کی پہچان کے لیے آپ کا نام ''سچل'' بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کا کلام آج بھی سندھ کی اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے متعلق وافر مقدار میں معاشرتی، سماجی اور فکری افکار سے آشکار کرتا ہے۔ سچل سرمست اُردو اور فارسی کے نامور شعرا کے معاصر بھی تھے۔ جن میں غالب، راسخ عظیم آبادی، میر تقی میر، میر درد شامل ہیں۔

سلطان باہو: سلطان العارفین سخی سلطان باہو، یکم جمادی الثانی 1039ھ (17 جنوری 1630ء) بروز جمعرات بوقت فجر شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں قصبہ شورکوٹ ضلع جھنگ میں پیدا ہوئے۔ آپ پنجابی زبان کے عظیم شاعر مانے جاتے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی پنجابی کافیاں آج بھی پڑھنے والوں کا دل موہ لیتی ہیں۔

وارث شاہ: پنجابی کی ہیر وارث شاہ مشہور زمانہ تصنیف ''ہیر'' کے خالق اور پنجابی زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ وارث شاہ شیخوپورہ سے 14 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع پنجاب کے ایک تاریخی قصبہ جنڈیالہ شیر خاں میں 5 ربیع الثانی 1130 ہجری بمطابق 1718ء میں پیدا ہوئے۔ وارث شاہ کا دور مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا سے لے کر احمد شاہ ابدالی تک کا دور ہے۔

بلھے شاہ: بلھے شاہ کا اصل نام سید عبداللہ شاہ تھا۔ آپ 1680ء میں پنجاب کے شہر اُچ گیلانیاں میں سخی درویش کے گھر پیدا ہوئے۔ قصور میں مشہور خطیب مولوی حافظ غلام مرتضیٰ سے ہندی، فارسی اور عربی، دین اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد شاہ عنایت اللہ قادریؒ کے مرید ہو کر فنا فی اللہ اور بقا باللہ کی منزل پائی۔ پیری مریدی کے اس تعلق پر رشتہ داروں نے طعنے دیے۔ گھر بار چھوڑ کر مرشد کی خدمت کی اور ان کی وفات کے بعد خلیفہ بن گئے۔ آپ 1757ء میں قصور میں فوت ہوئے۔

خوش حال خاں خٹک: پشتون جنگجو ہیرو، شاعر اور فلسفی، خوش حال خاں خٹک، نور الدین اکبر کے زمانے میں سرائے اکوڑ کے علاقے میں شہباز خاں کے گھر 1022ء میں پیدا ہوئے۔ باپ شہباز قبیلہ خٹک کے سردار اور مغلوں کی جانب سے علاقے کے جاگیردار (خان) تھے اور یہ خانی ان کو باپ دادا سے میراث میں ملی تھی۔

رحمان بابا: پشتو کے عظیم صوفی شاعر عبدالرحمٰن (1632ء-1711ء) مہمند قبیلے کی ایک شاخ غوریہ خیل سے تعلق رکھتے تھے۔ پشاور کے قریب بہادر کلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے زمانے کے معتبر علما سے فقہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ پشتون شاعری

کے حافظ شیرازی کہلاتے ہیں۔ مجموعہ کلام دیوان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں پانچ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ آپ کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خوانی کے مقام پر ہے۔

جام دُرک: اٹھارھویں صدی کے بلوچ صوفی شاعر تھے۔ وہ دُومکی قبیلہ کے سردار کرم خاں کے صاحب زادے تھے۔ آپ ناصر کے زمانے میں قلات آ گئے اور ان کی سرپرستی میں مختلف علوم سے فیض حاصل کیا۔ شاہی خانوادے کے علاوہ عام لوگ بھی ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔ جام درک کی شاعری عوام الناس کے لیے شعری عطیہ کے علاوہ صوفیانہ قوتوں کی حامل بھی نظر آتی ہے۔ جام درک کا 1784ء میں انتقال ہوا۔

مست توکلی: (ولادت 1825ء-وفات 1892ء): آپ کا اصل نام مست توکلی تھا۔ لیکن پاکستانی مصنفین نے طوق مست یا طوق علی مست مشہور کر دیا ہے۔ اگرچہ بلوچستان کے عوام میں آپ اب تک مست توکلی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی صوفیانہ شاعری کے ذریعے انسانیت اور وطن سے محبت کا درس دیا ہے۔

اصطلاح: وہ لفظ جس کے کوئی خاص معنی، کسی علم یا فن وغیرہ کے ماہرین نے یا کسی جماعت نے مقرر کر لیے ہوں۔

سبق کا خلاصہ

پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو کے علاوہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں بولی جانے والی زبانیں بھی شامل ہیں۔ یہ زبانیں اپنے اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں، آرزوؤں، جذبات، احساسات اور طریقِ تمدن و معاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے، جو اس زبان کی تہذیب و ثقافت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسے ہم ''پاکستانی تہذیب و ثقافت'' کہتے ہیں۔

یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف سہی لیکن ان کے مابین بڑے گہرے تاریخی، تمدنی اور روحانی رشتے ہیں۔ ان کی نشو و نما جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی مرہونِ منت ہے۔ ان زبانوں کے شعرا و ادب نے صوفیائے کرام کے سائے میں پرورش پائی۔ اس کے علاوہ ان زبانوں میں مسلمان مجاہدوں کے نعروں کی گونج اور تلواروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔

پاکستان میں بولی جانے والی علاقائی زبانوں میں قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش ادبی سرمایہ موجود ہے۔ سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست، پنجاب کے سلطان باہو، وارث شاہ اور بُلھے شاہ، سرحد (خیبر پختونخوا) کے خوش حال خان خٹک اور رحمان بابا، بلوچستان کے جام دُرک اور مست توکلی، پاکستانی ادب کی وہ عظیم شخصیات ہیں جن کے شاعرانہ کارناموں پر ہر پاکستانی کو بجا طور پر فخر ہے۔ پاکستان میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ ان کی اصل ایک ہی ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں آتی گئیں اور یہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی چلی گئیں۔

علاقائی طور پر سرحدی ہوں یا پنجابی، سندھی ہوں یا بلوچی، ہم سب پاکستانی ہیں۔ یہ رشتہ ہمارے تمام نسلی، علاقائی اور لسانی رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہم پر واجب ہے کہ ہم تمام زبانوں کا احترام کریں۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ کوشش زبان ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں اور ہماری قومی زبان اردو ہے۔

اردو کسی خاص علاقے یا صوبے کی زبان نہیں ہے۔ یہ تمام پاکستانیوں کی زبان ہے اور وطنِ عزیز کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ اردو، پاکستان کی ہر دل عزیز زبان ہے۔ اس بات کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کا دعویٰ ہے کہ اردو ہمارے ہاں پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جیسے پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو وغیرہ۔

اردو ادب نے دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ان زبانوں کی جدید نثر اور نظم نے اردو ادب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی علاقائی اور مقامی زبانوں کی آمیزش سے خوش گوار

اضافہ ہوا ہے۔ اس آمیزش سے اردو میں اب وہ لب ولہجہ پیدا ہو رہا ہے جسے ہم خالصتاً پاکستانی لب ولہجہ کہہ سکتے ہیں۔

آئین کی رو سے اردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ یہ زبان تخلیقِ پاکستان اور مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا اہم ذریعہ ہے۔ یوں یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن بھی قرار پاتی ہے۔

مرکزی خیال

پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں اور ان زبانوں میں ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ لیکن اردو بحیثیت قومی زبان ہمارے ملک میں یکساں مقبول ہے اور ہر خطے میں یکساں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔ یہ مختلف علاقوں کے مابین رابطہ کا اہم ذریعہ بھی ہے۔ اردو تخلیقِ پاکستان کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن ہے۔

اہم عبارات کی تشریح

نوٹ: (جو طلبہ ہر عبارت کا الگ الگ سیاق وسباق نہیں لکھ سکتے، وہ اس سبق کی کسی بھی عبارت کی تشریح سے قبل درج ذیل اجمالی سیاق وسباق لکھ سکتے ہیں۔)

سیاق وسباق

مصنف بتاتے ہیں کہ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں کے علاوہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر کی زبانیں بھی شامل ہیں۔ یہ زبانیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف سہی مگر ان کے درمیان گہرے تاریخی، تمدنی اور روحانی رشتے قائم ہیں۔ ان زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی نشوونما جنوبی اشیا میں ہوئی۔ پاکستان کی تمام زبانیں ایک دوسری سے منسلک ہیں لہٰذا ان میں تخلیق ہونے والا ادب بھی پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔ یہاں بولی جانے والی تمام زبانوں کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ اگرچہ پاکستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو ہماری قومی زبان ہے اور ملک کے ہر خطے میں سمجھی جاتی ہے۔ اردو ایک زرخیز زبان ہے۔ اس نے دوسری زبانوں کے ادب پر بھی گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ ادبی اہمیت کے علاوہ اردو زبان کو آئینی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی اہمیت حاصل ہے۔

عبارت نمبر 1

پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں وطنِ عزیز کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں کے علاوہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر کی زبانیں بھی شامل ہیں۔ یہ زبانیں اپنے اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں، آرزوؤں، جذبات، احساسات اور طریقِ تمدن ومعاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو مجموعی طور پر اس تہذیب وثقافت کے خدوخال کو نمایاں کرتا ہے جسے ہم ''پاکستانی تہذیب وثقافت'' کہتے ہیں۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سبق کی پہلی عبارت ہے۔ اس لیے اس کا سیاق نہیں ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ یہ زبانیں ایک دوسری سے مختلف سہی لیکن ان کے مابین بڑے گہرے تاریخی، تمدنی اور روحانی رشتے ہیں۔ ان زبانوں کے شعروادب نے صوفیا کرام کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ پاکستان میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ ان علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو زبان پاکستان کے ہر خطے میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اردو ادب نے ان دیگر زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کا لب ولہجہ بھی خالصتاً پاکستانی بن گیا ہے۔ اردو زبان پاکستان کے لوگوں کے درمیان یکجہتی کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان وادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے، ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

زبان کسی بھی قوم کی پہچان، تہذیب وتمدن کی عکاس اور قومی یک جہتی کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ اظہارِ خیال کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتی ہے۔ زبان ایک ایسا وسیلہ ہے جو کسی بھی معاشرے کے لوگوں کو آپس میں جوڑتا ہے، ان کے جذبات واحساسات کو شکل دیتا ہے اور ان کی تاریخ، ثقافت اور طرزِ زندگی کو محفوظ رکھتا ہے۔ زبان کے بغیر کسی قوم کی شناخت مکمل نہیں ہوتی۔ زبان ہی قوموں کے خیالات، نظریات، تجربات اور روایات کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے کا سب سے اہم وسیلہ ہے۔

مری شناخت اگر ہو تو ترے نام سے ہو — اے ارضِ شوق تری چشمِ معتبر میں رہوں (شبنم شکیل)

پاکستان ایک لسانی اور ثقافتی تنوع کا حامل ملک ہے، جہاں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ زبانیں نہ صرف بول چال کا ذریعہ ہیں بلکہ ان کے ذریعے لوگوں کے جذبات واحساسات اور معاشرتی تمدن کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی جیسی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جب کہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں بولی جانے والی زبانیں بھی اپنی الگ پہچان رکھتی ہیں۔ یہ زبانیں نہ صرف روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں بلکہ ان کے ذریعے لوک ادب، موسیقی اور تمدن ومعاشرت بھی پروان چڑھتا ہے۔ پاکستانی تہذیب وثقافت کے خدوخال کو نمایاں کرنے میں ان زبانوں کا بہت اہم کردار ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''اُردو، بلوچی، سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی، سب ایک ہی قسم کی تہذیبی زندگی، ایک ہی قسم کی معاشرت اور ایک ہی قسم کی آب وہوا کی پروردہ ہیں۔'' (قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں)

پاکستانی تہذیب وثقافت کی تشکیل میں علاقائی زبانوں کا بہت نمایاں حصہ ہے۔ پنجابی زبان وادب پنجاب کے لوگوں کی تاریخ، رومانویت اور معاشرتی اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ سندھی زبان سندھ کی قدیم تہذیب اور صوفیانہ روایات کی ترجمان ہے۔ پشتو زبان وادب خیبر پختونخوا کے لوگوں کی بہادری، غیرت اور قبائلی اقدار کو اجاگر کرتا ہے۔ بلوچی زبان وادب، بلوچوں کی جفاکشی، جدوجہد اور قدرتی ماحول سے وابستہ کہانیوں کو بیان کرتا ہے۔ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں بولی جانے والی زبانیں، جیسے: شینا، بلتی اور کشمیری، ان علاقوں کی قدرتی خوب صورتی اور ثقافتی تنوع کی عکاسی کرتی ہیں۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں لوک ادب اپنی ثقافتی اقدار اور صوفیانہ رنگ کی وجہ سے مشہور ہے۔ پنجاب کے عظیم صوفی شاعر سلطان باہو اور بلھے شاہ کی شاعری میں اخوت، مساوات، روحانیت اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ اسی طرح پنجاب کے مشہور صوفی شاعر وارث شاہ نے اپنی مثنوی ''ہیر رانجھا'' کے ذریعے پنجاب کی ثقافت، معاشرتی اقدار اور محبت کی داستان کو بیان کیا ہے۔ وارث شاہ کی شاعری پنجاب کے لوک ادب کا ایک اہم حصہ ہے جو آج بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتی ہے۔ پنجابی شاعروں کے کلام میں پنجاب کی قدیم تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بقول محمود شام:

''پنجاب میں بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ فرید، وارث شاہ، میاں محمد بخش کی بولی سرائیکی جینے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔''
(پاکستانی زبانوں کے شعری ونثری خزانے)

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں سندھی زبان کا ادب اپنی شان دار روایات اور صوفیانہ رنگ کے لیے مشہور ہے۔ سندھ کے عظیم صوفی شاعر سچل سرمست اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے اپنی شاعری کے ذریعے محبت، اخوت اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا۔ سندھی زبان کا ادبی سرمایہ پورے پاکستان کے لیے ایک مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے۔ اسی طرح پشتو زبان کے عظیم شاعر خوشحال

خاں خٹک نے اپنی پشتو شاعری کے ذریعے لوگوں میں غیرت، حمیت اور جذبۂ جہاد کو ابھارا۔ بلوچستان کے مشہور صوفی شاعر مست توکلی کی شاعری کا صوفیانہ رنگ بھی پاکستان کی مشترکہ ثقافت کا ایک اہم حصہ ہے۔ بقول محمود شام:

''سندھ کے ریگزاروں، کچھ علاقوں میں شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست کا کلام اپنے حقوق کے حصول کے لیے ولولۂ تازہ پیدا کرتا ہے۔'' (پاکستانی زبانوں کے شعری ونثری خزانے)

پاکستان کی علاقائی زبانوں کا ادب نہ صرف اپنے علاقے کے لوگوں کے لیے قیمتی اور اہم ہے بلکہ یہ پورے پاکستان کا مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے۔ تمام علاقائی زبانوں کا ادب مجموعی طور پر پاکستان کی تہذیب وثقافت کا عکاس ہے۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب میں اخوت، مساوات، حمیت اور باہمی مہر ومحبت کی اعلیٰ اقدار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ اقدار نہ صرف اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں بلکہ یہ پاکستانی معاشرے کی بھی بنیادی اقدار ہیں۔ اس لیے پاکستان کی علاقائی زبانوں کا تحریری ادب ''پاکستانی تہذیب وثقافت'' کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی ان زبانوں کی اہمیت صرف ان کے ادب تک محدود نہیں بلکہ یہ زبانیں پاکستانی معاشرے کی شناخت اور ثقافتی ورثے کا اہم حصہ ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کو زندہ رکھا گیا ہے۔ یہ زبانیں پاکستانی عوام کے جذبات واحساسات اور تمناؤں کی ترجمان ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی اقدار، روایات اور تہذیب کو نئی نسل تک منتقل کیا جاتا ہے۔

علاقائی زبانوں کی خوب صورتی اور اہمیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ زبانیں پاکستانی تہذیب وثقافت کی عکاس ہی نہیں بلکہ پاکستانی معاشرے کی ہم آہنگی اور یکجہتی کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی عوام اپنی شناخت اور ثقافتی ورثے کو برقرار رکھتے ہیں۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی تمام زبانوں کی حفاظت کریں اور ان کو فروغ دیں۔ انھی زبانوں کی ترقی سے پاکستانی تہذیب وثقافت کا قیمتی ورثہ زندہ رہ سکے گا اور اگلی نسل تک منتقل ہو سکے گا۔

عبارت نمبر 2

یہ زبانیں مخصوص علاقوں کے تعلق سے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف سہی، لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو ان میں بڑے گہرے تاریخی، تمدنی اور روحانی رشتے قائم ہیں۔ ان زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی نشو ونما جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ، رسم الخط، روزمرہ ومحاورات، تلمیحات وضرب الامثال اور روایات وحکایات سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ یہ زبانیں اسلامی تشخص رکھتی ہیں۔ ان زبانوں کے شعروادب نے صوفیائے کرام کے فیوض وبرکات کے سائے میں پرورش پائی اور یوں ان زبانوں نے اخوت ومساوات، غیرت وحمیت اور باہمی مہر ومحبت کی اعلیٰ انسانی اقدار کی پاس داری کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے ساتھ ساتھ اس میں اُن مسلمان مجاہدوں کے نعروں کی گونج اور تلواروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے جن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں ہند میں اسلام کا نور پھیلا۔ پاکستانی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف بتاتے ہیں کہ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ لوک اور تحریری ادب پاکستانی تہذیب وثقافت کو پیش کرتا ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف بتاتے ہیں کہ پاکستان میں بولی جانے والی بیشتر زبانوں کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ اردو پاکستان کے ہر خطے میں یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اردو ادب نے دیگر علاقائی زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کا لب ولہجہ بھی خالصتاً پاکستانی لب ولہجہ بن گیا ہے۔ یہ زبان پاکستان کی وحدت کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان وادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے، ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں مصنف پاکستان کی علاقائی زبانوں کے باہمی تعلق کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ تمام علاقائی زبانیں اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں اور جذبات واحساسات کی آئینہ دار ہیں۔ پاکستان کی ان علاقائی زبانوں کا تعلق صرف بول چال یا روزمرہ زندگی تک محدود نہیں بلکہ یہ زبانیں اپنے اندر گہرے تمدنی، تاریخی اور روحانی رشتے سموئے ہوئے ہیں۔ یہ زبانیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں لیکن اگر ان کی تاریخ، ثقافت اور ادب کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے درمیان ایک مضبوط اور ناقابلِ فراموش تعلق موجود ہے۔ یہ تعلق صرف لسانی نہیں بلکہ تہذیبی، تمدنی اور روحانی بھی ہے۔ پاکستانی زبانوں کی نشو ونما کا مسلمانوں کے دورِ اقتدار کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان علاقائی زبانوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کے زیرِ اثر پرورش پائی ہے۔ اس لیے ان کے ذخیرۂ الفاظ، رسم الخط، روزمرہ، محاورات، تلمیحات، ضرب الامثال، روایات اور حکایات میں اسلامی تشخص نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''یہ زبانیں ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں، ان سب کی روحوں پر اسلامی تہذیب وتمدن اور صوفیائے کرام کے احساس کا سایہ ہے۔ ان کے سرمایۂ ادب اور مزاج واسلوب میں بھی ایسی قدریں مشترک ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔'' (قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں)

پاکستان کی علاقائی زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی ترقی اور فروغ میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا اہم کردار رہا ہے۔ جب مسلمان حکمرانوں نے جنوبی ایشیا میں قدم رکھا تو انھوں نے نہ صرف سیاسی اور معاشرتی نظام کو تبدیل کیا بلکہ یہاں کی ثقافت اور زبانوں پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ مسلمانوں نے مقامی زبانوں کو اپنایا اور انھیں اسلامی تہذیب وثقافت کے رنگ میں ڈھالا۔ اس کے نتیجے میں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور دیگر علاقائی زبانوں میں اسلامی تہذیب کے عناصر شامل ہو گئے۔ ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہو گئے۔ ان زبانوں کے رسم الخط میں بھی اسلامی اثرات نمایاں ہیں جیسے: پنجابی اور سندھی زبانوں کو عربی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

علاقائی زبانوں کے روزمرہ، محاورات، تلمیحات اور ضرب الامثال میں اسلامی تشخص واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً: پنجابی اور سندھی زبانوں میں حضرت علیؓ، حضرت حسینؓ اور دیگر اسلامی شخصیات کے حوالے سے تلمیحات اور ضرب الامثال عام ہیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کا ادب بھی اسلامی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ ان زبانوں کے شعروادب نے صوفیائے کرام کے فیوض وبرکات کے سائے میں پرورش پائی ہے، صوفیائے کرام نے اسلام کی تبلیغ کے لیے مقامی زبانوں کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ پنجابی زبان کے مشہور صوفی شاعروں بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت سلطان باہوؒ اور شاہ حسینؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے اخوت، مساوات، محبت اور انسان دوستی کے پیغام کو عام کیا۔ سندھی زبان کے صوفی شاعروں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ نے اپنی شاعری میں اسلامی تعلیمات اور صوفیانہ روایات کو بیان کیا ہے۔ پشتو زبان کے شاعر رحمان باباؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے غیرت، حمیت اور جہاد کے جذبے کو ابھارا۔ بلوچی زبان کے لوک گیت اور کہانیاں بھی اسلامی اقدار وروایات کی عکاسی کرتی ہیں۔

علاقائی زبانوں کے ادب میں اخوت، مساوات، غیرت، حمیت اور باہمی مہر ومحبت کی اعلیٰ انسانی اقدار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ اقدار نہ صرف اسلامی تعلیمات کا حصہ ہیں بلکہ پاکستانی معاشرے کی بنیادی اقدار ہیں۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب میں مسلمان مجاہدوں کے نعروں کی گونج اور تلواروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے۔ علاقائی زبانوں نے ان مجاہدوں کی جدوجہد

اور قربانیوں کو اپنے ادب میں زندہ رکھا۔ پنجابی زبان کے لوک گیتوں میں غازیوں اور شہیدوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ سندھی زبان میں مسلمان مجاہدین اور اسلامی حکمرانوں کی فتوحات کا ذکر ملتا ہے۔ پشتو زبان کے لوک گیتوں میں جہاد اور شہادت کے جذبات کو ابھارا گیا ہے۔ بلوچی زبان کے لوک گیتوں میں مسلمان مجاہدین کی بہادری اور قربانیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔ یہ ادب نہ صرف اپنے علاقے کے لوگوں کا قیمتی سرمایہ ہے بلکہ یہ پورے پاکستان کے لوگوں کا ایک مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے۔ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور دیگر علاقائی زبانوں کے ادب نے پاکستانی تہذیب وثقافت کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ ادب پاکستانی معاشرے کی رنگارنگی، تنوع اور ہم آہنگی کی عکاسی کرتا ہے۔

پاکستان کی علاقائی زبانوں کی اہمیت صرف ان کے ادب تک محدود نہیں بلکہ یہ زبانیں پاکستانی معاشرے کی شناخت اور ثقافتی ورثے کا اہم حصہ ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو زندہ رکھا گیا ہے۔ یہ زبانیں پاکستانی عوام کے جذبات واحساسات اور تمناؤں کی ترجمان ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی اقدار، روایات اور تہذیب کو نئی نسل تک منتقل کیا جاسکتا ہے۔

ہم سے تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا جاتا دشتِ وحشت میں بھی آداب لیے پھرتے ہیں (فراغ روہوی)

بطور پاکستانی، ہمیں اپنی علاقائی زبانوں کی خوب صورتی اور اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ پاکستان کی علاقائی زبانیں، پاکستان کے استحکام اور ترقی کا ذریعہ ہیں۔ کیوں کہ یہ زبانیں نہ صرف پاکستانی تہذیب وثقافت کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کی ہم آہنگی اور یکجہتی کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ ان زبانوں کے ذریعے پاکستانی عوام اپنی شناخت اور ثقافتی ورثے کو برقرار رکھتے ہیں۔ علاقائی زبانوں کی حفاظت، ترقی اور فروغ ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ ان زبانوں کی وساطت سے ہی پاکستانی تہذیب وثقافت کا قیمتی ورثہ آنے والی نسلوں تک منتقل ہوسکتا ہے۔

اس عبارت میں مختصراً یہ بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں بولی جانے والی تمام علاقائی زبانیں اپنا خاص ثقافتی پس منظر اور ثقافتی ورثہ رکھتی ہیں۔ ان کی اپنی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ اس لیے ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اعتراف کرنا چاہیے۔ یہ زبانیں ایک ایسی بنیاد فراہم کرتی ہیں جس پر پاکستانی قوم کی شناخت قائم ہے۔ ہمیں اپنی تہذیب، تمدن، ثقافت اور شناخت پر فخر ہونا چاہیے اور علاقائی یا لسانی بنیاد پر کسی قسم کا کوئی تعصب پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ بقول اقبال:

ہتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی

عبارت نمبر 3

یوں تو پاکستان میں بولی جانے والی ہر زبان اہمیت کی حامل ہے، لیکن اپنے دائرۂ اثر کے اعتبار سے پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہندکو، سرائیکی اور کشمیری زبانیں یہاں کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ شمالی علاقوں اور چترال کی زبانیں بھی قابل قدر ادبی سرمایہ رکھتی ہیں۔ پاکستانی زبانوں میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی نہ صرف یہ کہ پاکستانی آبادی کے وسیع حصے کی زبانیں ہیں بلکہ ان کا قدیم وجدید ادب بھی معیار ومقدار کے لحاظ سے خاصا وقیع ہے۔ سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ، پنجاب کے سلطان باہوؒ، وارث شاہؒ اور بُلھے شاہؒ، سرحد (خیبر پختونخوا) کے خوشحال خان خٹکؒ اور رحمان باباؒ، بلوچستان کے جام درکؒ اور مست توکلیؒ، ماکستانی ادب کی وہ عظیم شخصیات ہیں جن کے شاعرانہ کارناموں پر ہر پاکستانی کو بجا طور پر فخر ہے۔

سیاق وسباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں

لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف سہی لیکن ان کے مابین بڑے گہرے تاریخی، تہذیبی اور روحانی رشتے ہیں۔ ان زبانوں کے شعروادب نے صوفیائے کرام کے سائے میں پرورش پائی۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو پاکستان کے ہر خطے میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اردو ادب نے دیگر علاقائی زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کا لہجہ خالص پاکستانی لب ولہجہ بن گیا ہے۔ یہ زبان پاکستان کی وحدت کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان وادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہر لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے، ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

زبان کسی بھی قوم کی پہچان، تہذیب وتمدن کی عکاس اور قومی یکجہتی کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ انسانی خیالات واحساسات اور جذبات کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی ہے۔ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ علاقائی زبانوں کا ادب پاکستانی تہذیب وثقافت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

پاکستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی اپنی اہمیت اور تاریخ ہے۔ لیکن اگر دائرۂ اثر اور بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہندکو، سرائیکی اور کشمیری کو بڑی زبانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ شمالی علاقوں اور چترال میں بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جو اپنے ثقافتی اور ادبی ورثے کی وجہ سے نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ پاکستانی زبانوں میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی کو اس لحاظ سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ بڑی تعداد میں لوگوں کی مادری زبانیں ہیں۔ ان زبانوں میں ادب کا ایک وسیع اور قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ ان زبانوں میں نہ صرف قدیم ادب کا سرمایہ موجود ہے بلکہ جدید دور میں بھی ان میں تخلیقی کام ہو رہا ہے۔ بقول محمود شام:

''اپنی اپنی مادری زبان میں سب پاکستانی بہت ہی بلند پایہ ادب تخلیق کر رہے ہیں۔''

(پاکستانی زبانوں کے شعری ونثری خزانے)

سندھی زبان کے مشہور شاعروں میں شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ شامل ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام میں صوفیانہ خیالات، محبت، انسانی ہمدردی اور سندھی ثقافت کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ ان کی شاعری سندھ کی روحانی وفکری شناخت کا اہم حصہ ہے۔ سچل سرمستؒ نے بھی اپنی شاعری میں وحدت الوجود اور تصوف کی گہرائیوں کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح پنجابی زبان میں سلطان باہوؒ، وارث شاہؒ اور بلھے شاہؒ کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ سلطان باہوؒ کی شاعری میں صوفیانہ رنگ نمایاں ہے اور ان کا کلام عشقِ حقیقی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وارث شاہؒ نے اپنی مشہور تخلیق ''ہیر رانجھا'' کے ذریعے پنجابی زبان وادب کو لازوال حیثیت عطا کی ہے۔ بلھے شاہؒ نے اپنے پنجابی کلام میں سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور انسان دوستی کا پیغام عام کیا۔ بقول محمود شام:

''جس سرزمین کی فضاؤں میں بلھے شاہؒ، سلطان باہوؒ، خواجہ فریدؒ، شاہ حسینؒ، شاہ عبداللطیفؒ، سچل سرمستؒ، رحمان باباؒ کی کافیاں، بولیاں، سُر گونج رہے ہوں۔ اس سے زیادہ طاقت ور تہذیب کس کی ہوسکتی ہے۔ ہمارا دفاع مضبوط ہے، ایٹمی طاقت بھی ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑی توانائی ان صوفیائے کرام کا کلام ہے جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔''

(پاکستانی زبانوں کے شعری ونثری خزانے)

پشتو زبان کے ادب میں خوشحال خان خٹکؒ اور رحمان باباؒ کے نام نمایاں ہیں۔ خوشحال خان خٹکؒ ایک بہادر، جنگجو، مدبر اور عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں آزادی، بہادری اور خودداری جیسے جذبات کو اجاگر کیا ہے۔ رحمان باباؒ پشتو کے ایک

بلند پایہ صوفی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں روحانی پاکیزگی اور انسانی محبت کا جذبہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح بلوچی زبان میں جام درکؒ اور مست توکلیؒ جیسے عظیم شاعر گزرے ہیں۔ جام درک کو بلوچی کلاسیکی شاعری کا بانی کہا جاتا ہے۔ مست توکلی کی شاعری محبت، درد، تصوف اور فطری حسن سے لگاؤ جیسے جذبات سے لبریز ہے۔

یہ تمام شعرا نہ صرف اپنی علاقائی زبانوں کے نمائندہ شاعر تھے بلکہ ان کی شاعری آج بھی پاکستان کے ادبی ورثے کا اہم حصہ سمجھی جاتی ہے۔ ان شعرا کی ادبی تخلیقات میں محبت، تصوف، بہادری، انسانی ہمدردی اور فطرت سے لگاؤ کے گہرے جذبات پائے جاتے ہیں، ان کی شاعری کی یہ خوبیاں ہر دور کے لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ بقول محمود شام:

''صوفیائے کرام کا کلام ہمیں زندہ رہنے کے قرینے سکھاتا ہے، اپنے خالق سے مخلوق کا رشتہ جوڑتا ہے، مذہب کا استحصال کرنے والوں سے خبردار کرتا ہے۔'' (پاکستانی زبانوں کے شعری و نثری خزانے)

پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی شاعری کا سرمایہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پاکستانی زبانوں میں کس قدر وسعت اور گہرائی ہے۔ ان زبانوں کے ادبی سرمائے میں فکری پختگی بھی پائی جاتی ہے۔ علاقائی زبانوں کے ان شعرا نے نہ صرف اپنے علاقوں میں بلکہ پورے برصغیر میں ادبی، فکری اور روحانی اثرات مرتب کیے ہیں۔ پنجابی شاعری میں سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت اور حقیقت کی تلاش کا رنگ نمایاں ہے۔ سندھی شاعری میں صوفیانہ وحدت الوجود اور محبت کا پیغام ملتا ہے۔ بلوچی شاعری میں فطرت سے محبت، بہادری اور جذبۂ عشق کی صداقت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، پشتو لوک ادب میں جرأت و بہادری اور انسان دوستی کا سبق دیا گیا ہے۔ ان تمام زبانوں کے عظیم شعرا کے کلام میں آج بھی تازگی اور اثر پزیری کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کی شاعری پاکستان کی ثقافتی اور روحانی پہچان کا ایک اہم حصہ ہے، جس پر ہر پاکستانی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانیں اہم ہیں۔

پاکستانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں علاقائی زبانوں کا کردار بہت نمایاں ہے۔ ہر زبان کا ادب پاکستان کا ایک مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے۔ اس لیے ان زبانوں کے فروغ اور ترقی کے لیے کوشاں رہنا چاہیے تاکہ پاکستانی تہذیب و ثقافت کو استحکام اور عروج حاصل ہو۔

ے ہماری آنکھ میں جو خواب ہیں وہ سب وطن کے ہیں یہاں جو گوہرِ نایاب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
(صبیحہ صبا)

عبارت نمبر 4

پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں بیشتر ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان کا تعلق زبانوں کے اس وسیع سلسلے سے ہے جو اصطلاح میں "ہند آریائی زبانیں" کہلاتی ہیں۔ جغرافیائی صورتِ حال اور مرورِ زمانہ کے باعث ان میں تغیرات پیدا ہوتے گئے اور ظاہری ہیئت میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی چلی گئیں۔ مسلمانوں کے دور میں ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں بے حد اضافہ ہوا اور اسلامی اثرات کے تحت ان کے بنیادی مزاج میں نمایاں تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ پاکستان کی یہ زبانیں باہم گہرے تاریخی رشتوں میں پیوست ہیں۔ ان کے ماضی کی طرح ان کا حال بھی انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے ہے۔ ہم علاقائی طور پر سرحدی ہوں یا پنجابی، سندھی ہوں یا بلوچ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ یہ رشتہ ہمارے تمام نسلی، علاقائی اور لسانی رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس رشتے سے ہم پر واجب ہے کہ ہم پاکستان کی سبھی زبانوں کا احترام کریں، انھیں اپنی زبانیں سمجھیں اور انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے میں کوشاں ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ کوشش زبان ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں اور وہ ہماری قومی زبان اُردو ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ زبانیں ایک دوسرے سے مختلف سہی لیکن ان کے مابین بڑے گہرے تاریخی،

تمدنی اور روحانی رشتے ہیں۔ ان زبانوں کے شعر و ادب نے صوفیا کرام کے سائے میں پرورش پائی۔ یوں تو پاکستان میں بولی جانے والی ہر زبان اہمیت کی حامل ہے، لیکن اپنے دائرۂ اثر کے اعتبار سے پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہندکو، سرائیکی اور کشمیری زبانیں یہاں کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف کہتے ہیں کہ علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو پاکستان کے ہر خطے میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ اردو نے دیگر زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے اردو زبان کا لہجہ خالص پاکستانی لب و لہجہ بن گیا ہے۔ نیز یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان و ادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہر لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقائی زبان اپنے مخصوص علاقے کی ثقافت، روایات اور طرزِ زندگی کی ترجمان ہے۔ ان زبانوں کا اپنا ادب اور ذخیرۂ الفاظ ہے۔ یہ تمام زبانیں ملک کی لسانی و ثقافتی خوب صورتی کو نمایاں کرتی ہیں۔ اگرچہ پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، ہندکو، کشمیری اور دیگر زبانیں مختلف خطوں میں بولی جاتی ہیں لیکن یہ سب ایک اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ ہر زبان کی اپنی الگ پہچان اور تاریخ ہے لیکن ان سب کا تعلق زبانوں کے ایک ہی خاندان سے ہے۔ ان زبانوں نے ایک دوسرے سے الفاظ اور لہجے لیے، جس سے ان کے درمیان ایک قدرتی رشتہ پیدا ہو گیا ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

''اُردو، بلوچی، سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی، سب ایک ہی قسم کی تہذیبی زندگی، ایک ہی قسم کی معاشرت اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا کی پروردہ ہیں۔'' (قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں)

پاکستان میں بولی جانے والی زیادہ تر زبانوں کا تعلق ''ہند آریائی'' زبانوں سے ہے۔ ہند آریائی زبانوں کی جڑیں قدیم ''ہند ایرانی'' زبان میں پیوست ہیں۔ آریہ قوم جب برصغیر میں داخل ہوئی تو اُس کی بنیادی زبان ''ہند ایرانی'' تھی۔ ہند ایرانی زبان میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی گئیں اور لسانی ارتقا کے مراحل سے گزر کر یہ ''ہند آریائی'' زبان بن گئی۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی اکثر زبانوں کا تعلق زبانوں کے اسی ''ہند آریائی'' خاندان سے ہے۔ یہ زبانیں نہ صرف تاریخی طور پر ایک دوسری سے منسلک ہیں بلکہ ایک دوسری پر اثر انداز بھی ہوتی ہیں۔ ان زبانوں کی ساخت اور لہجے مختلف ہیں لیکن ان کی بنیاد اور جڑ یک ہی ہے۔ جب مسلمانوں نے برصغیر پر حکومت قائم کی تو یہاں کی مقامی زبانوں میں عربی، فارسی اور ترکی زبان کے الفاظ بھی شامل ہونے لگے۔ جس سے ان زبانوں میں اسلامی ثقافت اور تہذیب کی جھلک بھی نمایاں ہونے لگی۔ اسلامی اثرات کے تحت ان زبانوں کے بنیادی مزاج میں بھی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہی اردو زبان کی تشکیل ہوئی۔ اردو مختلف زبانوں کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔ اردو زبان نے برصغیر کے مختلف خطوں میں رابطے کی زبان کے طور پر اپنا مقام بنا لیا۔ رفتہ رفتہ یہ زبان لوگوں میں مقبول ہوتی گئی۔ مختلف علاقوں، قوموں اور ثقافتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اردو زبان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ بقول روش صدیقی:

ے اُردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا چشمہ ہے وہ شخص مہذب ہے جس کو یہ زباں آئی

پاکستان کے مختلف خطوں میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پاکستان میں قومی یکجہتی اور اتحاد کو مضبوط بنانے کے لیے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ایک مشترکہ زبان جو پاکستان میں بسنے والی تمام قومیتوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتی۔ اس مشترکہ زبان کی ضرورت کو اردو نے پورا کیا، کیوں کہ یہ ملک کے تمام حصوں میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر خطے کی

علاقائی زبان اپنی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے لیکن قومی سطح پر رابطے کی ایک مشترکہ زبان ضروری تھی۔ اردو ہی وہ زبان ہے جو مختلف قومیتوں اور ثقافتوں کو ایک لڑی میں پرونے کا ذریعہ ہے۔ اردو زبان نے پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے یہ زبان ملک کی یکجہتی اور اتحاد کی علامت بن گئی ہے۔ بقول ریمزے میور:

''قومی زبان سے اہم کوئی چیز نہیں جو افراد کے درمیان یکجہتی پیدا کرے۔''

تشریح طلب عبارت کے آخر میں مصنف قومی یکجہتی کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم علاقائی طور پر پٹھان ہوں یا پنجابی، سندھی ہوں یا بلوچ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ پاکستانی عوام کو لسانی یا علاقائی بنیادوں پر تقسیم ہونے کی بجائے ایک قوم کی حیثیت سے متحد رہنا چاہیے۔ ان کی نصیحت ہے کہ ہمیں صرف پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی علاقائی یا نسلی شناخت سے بالاتر ہو کر ایک قوم کے طور پر آگے بڑھنا چاہیے۔ ہماری اصل طاقت اسی میں ہے کہ ہم متحد رہیں، ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور بھائی چارے کا مظاہرہ کریں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو اپنا سمجھیں۔ قائداعظم نے 15 جون 1948ء میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''ہم سب پاکستانی ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی سندھی، بلوچی، بنگالی، پٹھان یا پنجابی نہیں۔ ہمیں صرف اور صرف پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔''

ہر قسم کے لسانی اور نسلی تفاخر سے بالاتر ہو کر ہمیں صرف اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔

ؔ **دلوں میں حبِ وطن ہے اگر تو ایک رہو — نکھارنا یہ چمن ہے اگر تو ایک رہو** (جعفر ملیح آبادی)

ہمیں پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کا احترام کرنا چاہیے۔ پاکستان میں بولی جانے والی ہر زبان ہماری مجموعی شناخت کا ایک حصہ ہے۔ زبانوں کے اختلاف کو نفرت یا دوری کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے کیوں کہ یہ زبانیں ہماری ثقافتی خوب صورتی کا ایک لازمی جز ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں بولی جانے والی ہر زبان کو اپنی زبان سمجھ کر احترام دیں تو اس سے قومی یکجہتی مزید مستحکم ہوگی۔ ہماری تمام علاقائی زبانیں ہمیں جوڑنے کے لیے ہیں نہ کہ تقسیم کرنے کے لیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسی فضا پیدا کریں جہاں ہر پاکستانی کو برابری اور عزت کے ساتھ اپنی زبان اور ثقافت کے اظہار کا موقع ملے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ قومی اتحاد اور باہمی رابطے کے لیے ایک مشترکہ زبان کا ہونا ضروری ہے۔ پاکستان میں ہمارے اتحاد و یگانگت کی علامت ہماری قومی زبان اردو ہے۔ اردو نہ صرف رابطے کی ایک زبان ہے بلکہ پاکستان کے تمام علاقوں اور قومیتوں کے درمیان ایک پُل کا کام کرتی ہے۔ اردو زبان کو فروغ دے کر ہم اپنے باہمی تعلقات کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ اردو زبان ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم ایک دوسرے کے خیالات، جذبات اور نظریات کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنی قومی شناخت یعنی اردو زبان کی ترقی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

عبارت نمبر 5

اردو ہی پاکستان کی وہ واحد زبان ہے جو ہمارے کسی ایک علاقے کی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی سبھی کی زبان ہے۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی، بولی، پڑھی، اور لکھی جاتی ہے۔ اس کے علمی و ادبی سرمائے میں پاکستان کے ہر علاقے کے باشندوں نے مقدور بھر اضافہ کیا ہے۔ کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں اردو کے شاعر اور ادیب موجود نہ ہوں۔ اس زبان کی ہمہ گیری و ہر دل عزیزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کو دعویٰ ہے کہ اردو اس کے ہاں پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں ہمارے محققین نے بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ پنجاب میں اردو، سندھ میں اردو، سرحد (خیبر پختون خوا) میں اردو اور بلوچستان میں اردو کے عنوانات کے تحت متعدد کتابیں اور طویل مضامین تحریر ہوئے جن سے اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح مقامی زبانوں اور اردو کے لسانی روابط پر بھی خاصی تحقیق ہو چکی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف لکھتے ہیں کہ پاکستان میں کئی چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، ہندکو اور سرائیکی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر میں بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ ان زبانوں کے شعر و ادب نے صوفیا کرامؒ کے سائے میں پرورش پائی۔ ان زبانوں میں لکھا گیا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ ان زبانوں کے علاوہ اردو پاکستان کے ہر خطے میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے۔ یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان و ادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہرِ لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے، ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں بتایا گیا ہے کہ اردو پاکستان کی واحد زبان ہے جو پاکستان کے ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی ایک علاقے یا خطے کی زبان نہیں لیکن پورے ملک میں یکساں طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ پاکستان کے تمام صوبوں، شہروں اور دیہاتوں میں مقبول ہے۔ ہر خطے کے لوگ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی اپناتے ہیں۔ اگرچہ پاکستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو وہ زبان ہے جو سب کو آپس میں جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ یہ ہماری قومی پہچان ہے۔ پاکستانیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اردو کا کردار بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ بقول ریمزے میور:

''قومی زبان سے اہم کوئی چیز نہیں جو افراد کے درمیان یکجہتی پیدا کرے۔''

پاکستان کے ہر فرد کو اپنی مادری زبان سے محبت ہے۔ مادری زبان انسان کے جذبات، احساسات اور ثقافتی ورثے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، سرائیکی، براہوی اور دیگر زبانیں پاکستانی ثقافت کا حصہ ہیں۔ اس کے علاوہ اردو زبان سے بھی پورے ملک کے عوام کو یکساں محبت ہے۔ ہر پاکستانی اردو کو اپنا سمجھتا ہے اور روزمرہ زندگی میں اس کا استعمال کرتا ہے۔ اردو کو کسی ایک مخصوص قوم یا علاقے سے نہیں جوڑا جا سکتا کیوں کہ یہ سبھی کی زبان ہے اور سبھی نے اسے اپنایا ہے۔ یہ زبان پوری قوم کے اتحاد کا ذریعہ ہے اس لیے یہ ہماری قومی زبان ہے۔ قائداعظمؒ کا فرمان ہے:

''ایک مشترکہ سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہو سکتی اور نہ ہی کوئی کام کر سکتی ہے، جہاں تک پاکستان کی سرکاری زبان کا تعلق ہے تو وہ صرف اُردو ہے۔''

اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہ نہ صرف ایک عام بول چال کی زبان ہے بلکہ علم و ادب، صحافت، تعلیم، سرکاری امور اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں بھی اپنی جگہ بنا چکی ہے۔ اردو کے پاس ایک شان دار ادبی سرمایہ بھی موجود ہے جس میں مشرق و مغرب کی تمام اصنافِ ادب شامل ہیں۔ یہ ایک مکمل اور زرخیز زبان ہے۔ پاکستان کے ہر علاقے کے ادیبوں اور شاعروں نے اس زبان میں ادب لکھا ہے، پورے پاکستان کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے اردو میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا، بلوچستان، گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے اہلِ قلم نے اردو کے فروغ اور ترقی میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اردو کی ترقی میں نہ صرف بڑے شہروں بلکہ چھوٹے علاقوں اور دیہاتوں کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی صلاحیتیں پیش کی

ہیں۔ پاکستان کے ہر علاقے میں اردو سے محبت کرنے والے شاعر، ادیب اور محقق موجود ہیں جو اس زبان کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بقول عطا عابدی:

آج بھی پریم کے اور کرشن کے افسانے ہیں　　آج بھی وقت کی جمہوری زباں ہے اُردو

اردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کا ہر صوبہ اسے اپنی زبان ماننے کا دعویٰ کرتا ہے۔ پنجاب کے لوگ کہتے ہیں کہ اردو یہاں سے پروان چڑھی۔ سندھ کے لوگ اسے اپنی زبان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کے لوگ بھی اردو سے محبت کرنے والے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی جڑیں کسی ایک خطے تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے پاکستان کی زبان ہے۔ اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر بڑے پیمانے پر تحقیق کی گئی ہے۔ ہر علاقے کے محققین نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اردو کس علاقائی زبان کے زیادہ قریب ہے اور اس کے قواعد و ضوابط کن زبانوں سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اردو زبان کے قواعد، تذکیر و تانیث، جملوں کی ساخت اور الفاظ کی ترتیب پر گہرا تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے بہت سی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں، جیسے: حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں یہ دعویٰ کیا کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہوا اور پنجابی زبان سے اس کی مشابہت بھی ثابت کی ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم نے اپنی کتاب ''سندھ میں اردو'' میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا تعلق سندھ سے ثابت کیا ہے۔ اسی طرح خیبر پختونخوا اور بلوچستان کے محققین نے اردو کے آغاز کا تعلق اپنے اپنے علاقوں سے جوڑا ہے۔ یہ تمام تحقیقی کام ثابت کرتے ہیں کہ اردو پورے پاکستان کی پسندیدہ، مقبول اور نمائندہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

سب زبانوں کی جان ہے اردو　　کتنی پیاری زبان ہے اردو

اردو پاکستان میں نہ صرف رابطے کی زبان ہے بلکہ قومی شناخت کا ایک اہم حصہ بھی ہے۔ پاکستان کے ہر علاقے میں اردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ مل جاتے ہیں۔ اس زبان کے بغیر ملک کے مختلف صوبوں، شہروں اور دیہاتوں کے درمیان مؤثر رابطہ ممکن نہیں۔ پاکستان میں مختلف زبانیں بولنے والے جب آپس میں بات چیت کرتے ہیں تو ان کے لیے اردو ہی وہ واحد زبان ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں۔

ہاں مجھے اردو ہے پنجابی سے بھی بڑھ کر عزیز　　شکر ہے انور مری سوچیں علاقائی نہیں　(انور مسعود)

اردو زبان کی یہ وسعت اور مقبولیت ثابت کرتی ہے کہ پاکستان کی قومی زبان کے طور پر یہ واقعی ایک ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ اپنی علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی کے لیے بھی کام کریں۔ ہمیں اپنی قومی زبان سے محبت کرنی چاہیے کیوں کہ یہ واحد ذریعہ ہے جو ہمیں ایک قوم کی حیثیت سے جوڑتا ہے۔ اردو زبان ہماری شناخت، ہماری پہچان ہے، ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیے۔ اردو کو ترقی اور فروغ دے کر ہم ایک مضبوط، متحد اور ترقی یافتہ قوم بن سکتے ہیں۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے　(مرزا خاں داغؔ دہلوی)

عبارت نمبر 6

اردو ادب نے دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔ ان زبانوں کی جدید نثر اور نظم میں اردو ادب سے خاصا استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان زبانوں کا ادب، اردو ادب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان زبانوں کے ادب کا ایک بڑا حصہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے بلکہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ان زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے خوش گوار اضافہ بھی ہوا ہے۔ اردو میں اب وہ لب و لہجہ پیدا ہو رہا ہے جسے ہم خالصتاً پاکستانی لب و لہجہ کہہ سکتے ہیں۔

آئین کی رو سے اُردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ اس زبان نے جہاں تخلیقِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ہے وہاں یہ وطنِ عزیز کے مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ یوں یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن بھی قرار پائی ہے۔

سیاق و سباق

تشریح طلب عبارت سے پہلے مصنف کہتے ہیں کہ پاکستان میں کئی چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو، ہندکو اور سرائیکی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ شمالی علاقوں اور کشمیر میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ اردو زبان پورے پاکستان میں یکساں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ پاکستان کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں اردو کے شاعر و ادیب موجود نہ ہوں۔ اردو زبان کی تاریخ اور مقامی زبانوں کے ساتھ اردو کے لسانی روابط پر بھی خاصی تحقیق ہو چکی ہے۔

مصنف مزید بتاتے ہیں کہ آئین کی رو سے اردو پاکستان کی قومی و سرکاری زبان ہے اور یہ زبان وحدت پاکستان کی ضامن ہے۔

تشریح

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو زبان و ادب کے ایک ممتاز محقق، نقاد اور ماہر لسانیات تھے۔ ان کی تحریروں میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے، ان کی زبان شستہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ وہ علمی، تاریخی اور لسانی پہلوؤں کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تجزیے کی گہرائی اور علمی دیانت داری نمایاں نظر آتی ہے۔

تشریح طلب عبارت میں بتایا گیا ہے کہ اردو ادب نے پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ ان علاقائی زبانوں نے بھی اردو ادب کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب مختلف زبانیں ایک خطے میں پروان چڑھتی ہیں تو ان کے درمیان لسانی اور ادبی روابط قائم ہوتے ہیں۔ پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں جیسے پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، براہوی اور دیگر زبانیں اردو ادب سے متاثر ہوئی ہیں۔ ان زبانوں کے جدید ادب میں اردو زبان و ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔ اسی طرح اردو نے بھی ان زبانوں کے الفاظ، لب و لہجے اور طرز بیان کو اپنایا ہے جس کی بدولت اردو کا دامن مزید وسیع اور خوب صورت ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا لسانی میل جول ہے جس نے اردو کو خالصتاً پاکستانی زبان بنا دیا ہے۔ یہی میل جول ہماری قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ بقول ریمزے میور:

''قومی زبان سے اہم کوئی چیز نہیں جو افراد کے درمیان یکجہتی پیدا کرے۔''

اردو ادب نے پاکستانی علاقائی زبانوں پر جو اثرات ڈالے ہیں وہ کسی ایک پہلو تک محدود نہیں بلکہ ان اثرات کی کئی جہتیں ہیں۔ مقامی زبانوں کے شاعروں اور نثر نگاروں نے اردو ادب کے رجحانات اور تکنیکوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے مقامی زبانوں کے ادب میں نئے تخلیقی اسالیب وجود میں آئے ہیں۔ اردو کی ادبی روایت میں داستان، ناول، افسانہ، نظم، غزل اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر اصناف کو پاکستانی علاقائی زبانوں میں بھی اپنایا گیا ہے۔ اس طرح ان زبانوں کے ادب کو بھی وسعت ملی ہے اور وہ جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔ اردو کے کلاسیکی اور جدید شاعری کے اسلوب نے بھی مقامی زبانوں کے شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان زبانوں میں بھی ترقی پسند اور جدید ادب تخلیق ہو رہا ہے۔

اردو زبان میں بھی مقامی زبانوں کے اثر و نفوذ کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اردو زبان نے پاکستان کی علاقائی زبانوں سے الفاظ، محاورات، تشبیہات اور استعارے اپنائے، جنھوں نے اردو زبان کو مزید زرخیز بنا دیا۔ مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ کو اردو میں شامل کرنے سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ اس عمل سے ایک نئی تہذیبی ہم آہنگی بھی پیدا ہوئی۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں رہی بلکہ یہ تمام پاکستانیوں کی مشترکہ ثقافت اور تہذیب کی نمائندہ زبان بن گئی۔ دیگر زبانوں سے اثرات قبول کر کے اردو نے ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کر لیا ہے جو خالصتاً پاکستانی ہے۔ مقامی زبانوں کے مخصوص الفاظ اور طرز بیان کی آمیزش سے اردو میں ایک منفرد رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو صرف ایک رابطے کی زبان ہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ بھی ہے جو پاکستان کے تمام خطوں کو آپس میں جوڑتا ہے۔ بقول شاعر:

زندہ وطن میں روحِ ثقافت اسی سے ہے　　آزادیٔ وطن کی علامت اسی سے ہے

پاکستان میں بولی جانے والی تمام زبانوں کے درمیان ایک گہرا تعلق موجود ہے۔ یہ سب زبانیں ایک دوسرے سے مسلسل سیکھ رہی ہیں۔ یہ قدرتی عمل ہے کہ جب مختلف زبانیں ایک معاشرتی اور ثقافتی ماحول میں پروان چڑھتی ہیں تو ان کے درمیان لسانی تبادلے کا عمل جاری رہتا ہے۔ اردو زبان نے پاکستانی زبانوں سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ علاقائی زبانوں نے بھی اردو زبان و ادب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہ عمل زبانوں کے زندہ رہنے کی ضمانت ہے۔ وہ زبانیں جو دوسری زبانوں سے اثرات قبول نہیں کرتیں اور خود کو محدود رکھتی ہیں، وہ وقت کے ساتھ ماند پڑ جاتی ہیں۔ دیگر پاکستانی زبانوں کے الفاظ کی شمولیت سے اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں ایک خوش گوار اضافہ ہوا ہے اور اسے مقامی رنگ عطا ہوا ہے۔ آج جو اردو بولی اور لکھی جاتی ہے، وہ خالصتاً پاکستانی اردو ہے۔ اس میں مختلف خطوں کے لب و لہجے، الفاظ اور طرزِ بیان کی جھلک نظر آتی ہے۔ بقول فرمان فتح پوری:

''اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون، ایک ہی رنگ و نسل، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین، ایک ہی اندازِ فکر اور ایک ہی طرزِ ادا کا رشتہ ہے اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں۔''

(قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں)

اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اس کا ایک مضبوط تاریخی پس منظر بھی ہے۔ پاکستان کے آئین کے مطابق اردو ہماری قومی اور سرکاری زبان ہے۔ اردو نے پاکستان کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں اردو نے ایک ایسی زبان کا کردار ادا کیا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو یکجا کر کے ایک الگ قوم ہونے کا شعور دیا۔ علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی اور دیگر رہنماؤں نے اردو زبان میں تقریروں اور تحریروں کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کو مضبوط کیا۔ اردو شاعری نے مسلمانوں کے جذبات کو بیدار کیا اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اردو کو پاکستان کی قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ کیوں کہ یہی وہ زبان تھی جو مختلف علاقوں اور قومیتوں کے لوگوں کے درمیان رابطے اور اتحاد کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

''قومی زبان کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں پوری قوم اور پورے ملک کی زبان ہوتی ہے، اس لیے اس پر پشاور سے لے کر کراچی تک سب کا یکساں حق ہے۔''

(قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانیں)

پاکستان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی تمام زبانوں کی قدر کریں اور ان کی ترقی کے لیے کام کریں۔ ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہماری قومی یکجہتی کی ضمانت ہے۔ اس لیے دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کو فروغ دے کر ہم اپنی تمام لسانی اور ثقافتی روایات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اسی سے ہم ایک مضبوط اور مستحکم قوم بن کر دنیا میں اپنا نام پیدا کر سکتے ہیں۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

شہد و شکر سے شیریں زباں ہماری　　ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری

مشقی سوالات

سوال نمبر ۱: مختصر جواب دیں۔

۱۔ **پاکستانی تہذیب و ثقافت سے کیا مراد ہے؟**

جواب۔ پاکستانی تہذیب و ثقافت سے مراد یہاں کے لوگوں کا رہن سہن اور زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ اس تہذیب میں رنگا رنگی ہے۔ اس میں اسلامی روایات کا عکس بہت نمایاں ہے۔

۲۔ **پاکستان کے مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ کون سی زبان ہے؟**

جواب۔ پاکستان کے مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ اردو زبان ہے۔ یہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔

۳۔ **''اس زبان کی ہمہ گیری و ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کو دعویٰ ہے کہ اردو اس کے ہاں پیدا ہوئی۔'' اس جملے کی تاریخی اور لسانی حیثیت کیا ہے؟**

جواب۔ ''اس زبان کی ہمہ گیری ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کو دعویٰ ہے کہ اردو اس کے ہاں پیدا ہوئی۔'' اس جملے کی تاریخی اور لسانی حیثیت بہت اہم ہے۔ جب اردو کو عروج حاصل ہوا تو مختلف علاقوں کے محققین نے اردو کو اپنے علاقے سے منسوب کیا اور حوالے سے تاریخی اور لسانی رابطے تلاش کیے۔

۴۔ **پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کے وسیع سلسلے کو اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟**

جواب۔ پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کے وسیع سلسلے کو اصطلاح میں ''ہند آریائی زبانیں'' کہتے ہیں۔

۵۔ **پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، یہ کس امر کی آئینہ دار ہیں؟**

جواب۔ پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں، آرزوؤں، جذبات، احساسات اور طریق تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہیں۔

سوال نمبر ۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

۱۔ **سبق کے متن کے مطابق پاکستانی زبانوں میں باہمی رشتے قائم ہیں۔**

الف۔ مذہبی، تمدنی اور روحانی　　ب۔ تاریخی، تمدنی اور روحانی
ج۔ تاریخی، تمدنی اور علاقائی　　د۔ تاریخی، اخلاقی اور روحانی

۲۔ **شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تعلق پاکستان کے صوبے سے ہے۔**

الف۔ خیبر پختونخوا　　ب۔ پنجاب　　ج۔ بلوچستان　　د۔ سندھ

۳۔ **جنوبی ایشیا کی زبانوں کی نشوونما کس کے دور اقتدار کی مرہون منت ہے؟**

الف۔ سکھوں کے　　ب۔ ہندوؤں کے　　ج۔ مسلمانوں کے　　د۔ انگریزوں کے

۴۔ **پاکستانی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ ہے۔**

الف۔ جاگیر　　ب۔ میراث　　ج۔ ثقافت　　د۔ یادگار

۵۔ **کون سی زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن بھی قرار پائی ہے؟**

الف۔ اردو　　ب۔ سندھی　　ج۔ بلوچی　　د۔ پنجابی

جوابات

۱	تاریخی، تمدنی اور روحانی	۲	سندھ	۳	مسلمانوں کے	۴	میراث	۵	اُردُو

سوال نمبر ۳۔ متن کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں۔

۱۔ پاکستانی زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا.....موجود ہے۔

۲۔ شمالی علاقوں اور چترال کی زبانیں بھی قابل قدر.....رکھتی ہیں۔

۳۔ پاکستانی ادب کی عظیم شخصیات کے شاعرانہ کارناموں پر ہر.....کو بجا طور پر فخر ہے۔

۴۔ پاکستان کی یہ زبانیں باہم گہرے تاریخی.....میں پیوست ہیں۔

۵۔ اردو ہی پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی.....، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔

جوابات

۱	ذخیرہ	۲	ادبی سرمایہ	۳	پاکستانی	۴	رشتوں	۵	بولی

سوال نمبر ۴۔ طلبہ پانچ پانچ جملے اپنی مقامی اور علاقائی زبان کے بولیں اور انھیں اردو زبان میں ترجمہ کر کے ایک دوسرے کو سنائیں۔

جواب۔ عملی کام

سوال نمبر:۵۔ سبق "پاکستانی زبانیں اور ان کا باہمی رشتہ" کے متن میں سے علاقائی زبانوں اور اردو کے مشترکہ مستعمل الفاظ کی نشان دہی کریں اور ایک دوسرے کو بتائیں۔

جواب۔ لوک، جھنکار، پھیلا، حصے، اصل، پاکستانی، احترام، پڑھی لکھی، نظم، نثر، ضامن۔ وغیرہ

سوال نمبر:۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

حقوق و فرائض کو توازن میں رکھنا خوش حال معاشرے کی بنیاد کا ضامن ہے۔ اگر ہم کما حقہ اپنے فرائض کو محنت اور خلوص کے ساتھ انجام دے رہے ہیں تو گویا ہم دوسروں کے حقوق ادا کر رہے ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے صلے میں اپنا حق حاصل کرنے کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ فرائض کی اقسام میں اخلاقی اور قانونی فرائض انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان فرائض کی انجام دہی سے معاشرہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر خوش حال ہو جاتا ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسروں کے حقوق پامال کرنا اخلاقی بے ضابطگی ہے۔ کوڑا کرکٹ سر عام پھینکنا، آلودہ پانی گلیوں، سڑکوں پر چھوڑنا اور گھروں میں شور شرابا کرنا ہماری ذات کے لیے تو فرحت و تسکین کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ عمل ہمسائیوں اور محلے داروں کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسا عمل اختیار کرتے ہوئے ہم ایک طرف تو خود اخلاقی بے ضابطگی کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اختیار کیے بغیر ہم اپنے آپ کو اچھے ماحول کا حق دار کیوں کر ٹھہرا سکتے ہیں۔ قانونی فرائض کی پاس داری کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے۔ قوانین ایک طرف تو ریاست کی ترقی کے لیے بنتے ہیں تو دوسری طرف یہ امن و امان قائم رکھنے اور عام شہریوں کے تحفظ کے ضامن بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم کوئی قانون شکنی کرتے ہیں تو اس کی گرفت میں آتے ہیں۔ قانونی تقاضے پورے کیے بغیر اس کی حدوں کو تجاوز کر کے ناجائز مراعات حاصل کرنا قانون شکنی بھی ہے اور شہریوں کے حقوق کی پامالی بھی۔ ٹیکس کی عدم ادائیگی، بجلی چوری اور رشوت ستانی اس کی مثالیں ہیں۔

سوالات:

۱۔ **حقوق و فرائض کے توازن سے کیا مراد ہے؟**

جواب۔ حقوق و فرائض کے توازن سے مراد یہ ہے کہ ہم اپنے فرائض محنت اور خلوص سے ادا کریں اور اپنے حقوق حاصل کریں۔

۲۔ **کون سے فرائض انتہائی اہمیت کے حامل ہیں؟**

جواب۔ اخلاقی اور قانونی فرائض انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

۳۔ **معاشرہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسے خوش حال ہوتا ہے؟**

جواب۔ معاشرہ فرائض کی انجام دہی سے انفرادی اور اجتماعی طور پر خوش حال ہوتا ہے۔

۴۔ **قانون شکنی سے کیا مراد ہے؟**

جواب۔ قانونی تقاضے پورے کیے بغیر اس کی حدود سے تجاوز کرنا اور ناجائز مراعات حاصل کرنا قانون شکنی کہلاتا ہے۔

۵۔ **اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔**

جواب۔ حقوق و فرائض کا توازن

زبان شناسی:

حروف کا بیان: ایسے حروف جو کوئی بات کرنے یا بات کی وضاحت کرنے کے لیے دو جملوں کے درمیان لائے جائیں، حروف بیان کہلاتے ہیں۔ جب دو جملوں میں سے دوسرا جملہ اپنے سے پہلے آنے والے جملے کی وضاحت کرتا ہو تو اس کے شروع میں حروف "کہ" لایا جاتا ہے۔ مثلاً: اُس نے کہا کہ میں ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔ یہاں حرف "کہ" حرف بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

سوال نمبر:۷۔ حروف بیان کی مدد سے پانچ جملے بنائیں۔

جواب۔ ۱۔ استاد نے کہا کہ شور مت کرو۔ ۲۔ امی نے کہا کہ کھانا کھالو۔ ۳۔ بھائی نے کہا کہ کتاب نکالو۔
۴۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں آ جائیں۔ ۵۔ ابو نے کہا کہ جلدی سکول جاؤ۔

حروف تاکید: ایسے حروف جو کلام میں زور پیدا کرنے اور تاکید کے لیے استعمال کیے جائیں حروف تاکید کہلاتے ہیں۔ کلام میں جس حصے پر زور دیا جائے یا تاکید کی جائے اسے "مؤکد" کہتے ہیں۔ حروف تاکید درج ذیل ہیں:۔ بے شک، ہرگز، ضرور، مطلق، سراسر، کبھی، قطعی، سبھی، صرف وغیرہ۔

سوال نمبر:۸۔ حروف تاکید کی مدد سے پانچ جملے بنائیں۔

جواب۔ ۱۔ بے شک اللہ بڑا مہربان ہے۔ ۲۔ اسے ہماری مطلق پروا نہیں۔ ۳۔ میں قطعی طور پر آپ کے مخالف ہوں۔ ۴۔ آپ ہرگز شور نہ کرنا۔ ۵۔ مجھے صرف اردو زبان آتی ہے۔

حروف علت: ایسے حروف جو کسی بات کا سبب، وجہ یا باعث بیان کرنے کے لیے استعمال ہوں، حروف علت کہلاتے ہیں، جیسے: تاکہ، آخر، کیوں کہ، اس لیے، اس واسطے، اس باعث، لہٰذا، چوں کہ وغیرہ۔

سوال نمبر:۹۔ (۱) درج ذیل جملوں میں سے حروف علت کی نشان دہی کریں۔

الف۔ محنت کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ جواب۔ تاکہ

ب۔ چوں کہ وہ غریب ہے اس لیے فیس ادا نہیں کر سکتا۔ جواب۔ اس لیے

ج۔ مجھ پر رحم کرو آخر میں تمھارا بھائی ہوں۔ جواب۔ آخر

د۔ میں اس لیے جاؤں گا تاکہ اس سے ملاقات ہو جائے۔ جواب۔ تاکہ

ہ۔ تم نے وعدہ توڑا لہٰذا اب میں بھی پابند نہیں۔ جواب۔ لہٰذا

(۲) ذیل میں دی گئی عبارت غور سے پڑھیں اور حروف علت تلاش کر کے ان کی فہرست بنائیں۔

جب تک رنگ نہ ہو پھول وجود میں نہیں آتا، اس لیے پھول کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا صحیح آواز اور حرکت کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے پھول کا رنگ سے۔ آواز حرکات یعنی زیر، زبر، پیش وغیرہ کے ساتھ رہتی ہے تاکہ اپنی شناخت قائم رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی بنیاد اور ذات کے حوالے سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرکتیں صحیح آواز کو جوڑ کر آوازوں کا ایک نظام بناتی ہیں۔

جواب۔ اس لیے، لہٰذا، جیسے، تاکہ، پس

سوال نمبر:۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں اور حوالہ متن بھی درج کریں۔

"پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہماری قومی زبان اُردو ہے۔"

"اردو ادب نے دیگر پاکستانی زبانوں۔۔۔۔۔۔۔ خالصتاً پاکستانی لب و لہجہ کر سکتے ہیں۔"

جواب۔ دیکھیے نثر پاروں کی تشریحات

روزمرہ: اہل زبان ایک طویل عرصے سے زبان کو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے استعمال کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا پڑھا، بولا اور لکھا درست تصور کیا جاتا ہے۔ اہل زبان اپنے معمول کی بول چال میں جو الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں، اسے روزمرہ کہتے ہیں۔ مثلاً: آئے دن، ہر روز، تقریر کا لکھا، تو بہ ہی بھلی وغیرہ۔

سوال نمبر:۱۱۔ روزمرہ کے لحاظ سے درج ذیل جملوں کی درستی کریں۔

الف۔ وہ دن بدن کم زور ہو رہا ہے۔ جواب۔ وہ روز بروز کم زور ہو رہا ہے۔

ب۔ دن دن کا آنا جان قدر کھو دیتا ہے۔ جواب۔ روز روز کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے۔

ج۔ اسد آئے روز غیر حاضر رہتا ہے۔ جواب۔ اسد آئے دن غیر حاضر رہتا ہے۔

د۔ یہ لڑکی بڑی لڑاکی ہے۔ جواب۔ یہ لڑکی بڑی لڑاکا ہے۔

ہ۔ ہم ہر دن سیر کو جاتے ہیں۔

جواب۔ ہم ہر روز سیر کو جاتے ہیں۔

و۔ وہ لڑکا تو گھوڑے فروخت کر کے سویا ہوا ہے۔

جواب۔ وہ لڑکا تو گھوڑے بیچ کر سویا ہوا ہے۔

سوال نمبر:۱۲۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے۔

آئینہ دار، بیش بہا، تہذیب و ثقافت، نشو و نما، مرہون منت، رسم الخط، مشترکہ میراث، پاکستانی ادب، صورت حال، ذخیرۂ الفاظ، قومی زبان، علمی و ادبی سرمایہ، وطن عزیز، وحدت پاکستان، خدوخال

جوابات:

تراکیب	جملے
آئینہ دار	زبان تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔
بیش بہا	اردو زبان میں مقامی الفاظ کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔
تہذیب وثقافت	پاکستان کی تہذیب وثقافت میں مذہب کا رنگ غالب ہے۔
نشوونما	اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا بڑا حصہ ہے۔
مرہون منت	کامیابی محنت کی مرہون منت ہے۔
رسم الخط	اردو کا رسم الخط بہت خوب صورت ہے۔
مشترکہ میراث	پاکستانی ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔
ذخیرہ الفاظ	زبان کی وسعت کا اندازہ اس کے ذخیرہ الفاظ سے ہوتا ہے۔
وحدتِ پاکستان	اردو زبان وحدت پاکستان کی علامت ہے۔
خدوخال	لوک ادب اور شاعری سے ثقافت کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔

سوال نمبر:۱۳۔اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

پاکستانیت،تمدن،حمیت،فوقیت، آمیزش

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
پاکستانیت	پَاکِسْتَانِیَت	تمدن	تَمَدُّن	حمیت	حَمِیَّت	اصطلاح	اِصطِلَاح
فوقیت	فَوْقِیَت	آمیزش	آمیزِش				

مصنف سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری پیدا ہوئے:
(الف)1930ء میں (ب)1933ء میں (ج)1937ء میں (د)1939ء میں (ج)

2۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری پیدا ہوئے:
(الف)بنگلور میں (ب) منگلور میں (ج)لکھنؤ میں (د)کلکتہ میں (ب)

3۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے شیروان ہائی سکول سے کیا:
(الف)میٹرک (ب) ایف۔اے (ج)بی۔اے (د)ایم۔اے (الف)

4۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے کیا:
(الف)میٹرک (ب) ایف۔اے (ج)بی۔اے (د)ایم۔اے (ج)

5۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ایم۔اے کیا:
(الف)پشاور یونی ورسٹی سے (ب) جامعہ کراچی سے
(ج)علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے (د)پنجاب یونی ورسٹی سے (د)

6۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری پنجاب یونی ورسٹی میں لیکچرر مقرر ہوئے:
(الف)۱۹۶۰ء میں (ب) ۱۹۶۱ء میں (ج)۱۹۶۲ء میں (د)۱۹۶۳ء میں (ج)

7۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے پی۔ایچ۔ڈی اور ایم۔اے تاریخ کا امتحان پاس کیا:
(الف)1965-66ء کے دوران میں (ب) 1966-67 کے دوران میں
(ج)1967-68 کے دوران میں (د)1968-69 کے دوران میں (ب)

8۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی NWFP ٹیکسٹ بک بورڈ میں تعیناتی ہوئی:
(الف)1968ء میں (ب) 1969ء میں (ج)1970ء میں (د)1971ء میں (د)

9۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ملازمت سے سبکدوش ہوئے؟
(الف)1997ء میں (ب) 1998ء میں (ج)1999ء میں (د)2000ء میں (الف)

10۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری ہم وطن تھے:
(الف)ڈاکٹر نیاز فتح پوری کے (ب) ڈاکٹر انور سدید کے
(ج)ڈاکٹر سید عبداللہ کے (د)رشید احمد صدیقی کے (ج)

11۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے کیا:
(الف)میٹرک (ب) ایف۔اے (ج)بی۔اے (د)ایم۔اے (ج)

12۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے اپنی ذاتی لائبریری کی کتب وقف کرنے کی وصیت کی:
(الف)پشاور یونی ورسٹی کو (ب) ہزارہ یونی ورسٹی کو (ج)پنجاب یونی ورسٹی کو (د)جامعہ کراچی کو (ب)

13۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری استاد تھے:
(الف)فارسی کے (ب) اُردو کے (ج) انگریزی کے (د)عربی کے (ب)

14۔ ماہر لسانیات ہیں:
(الف)غلام عباس (ب) پریم چند (ج)احمد ندیم قاسمی (د)ڈاکٹر ممتاز منگلوری (د)

15۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے آر۔این کالج حاجی پور میں بطور لیکچرر اُردو ذمہ داریاں سنبھالیں:
(الف)1980ء میں (ب)1982ء میں (ج)1984ء میں (د)1986ء میں (الف)

16۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ترقی ہوئی:
(الف)1992ء میں (ب)1994ء میں (ج)1996ء میں (د)1998ء میں (ب)

17۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "ادب اور ادبی رویہ" شائع ہوا:
(الف)1990ء میں (ب)1992ء میں (ج)1994ء میں (د)1998ء میں (الف)

18۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے "متاعِ لوح و قلم" اور "متاعِ نقد و نظر" کے مصنف ہیں:
(الف)ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ب)ڈاکٹر انور احمد (ج)ڈاکٹر ممتاز منگلوری (د) ڈاکٹر نجیب جمال (ج)

19۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی تصنیف "اقبال،شاعر و دانش ور" پہلی بار شائع ہوئی:
(الف)2009ء میں (ب)2010ء میں (ج)2012ء میں (د)2013ء میں (د)

20۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی تصنیف "اقبال شاعر و دانش ور" دوسری بار نئی دہلی سے شائع ہوئی:
(الف)2015ء میں (ب)2018ء میں (ج)2020ء میں (د)2022ء میں (ب)

21۔ طیف نثر اور "طیف غزل" کتب ہیں:
(الف)ڈاکٹر انور سدید کی (ب) ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی
(ج)ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی (د)ڈاکٹر انور احمد کی (ج)

22۔ ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے وفات پائی:
(الف)2008ء میں (ب) 2009ء میں (ج)2010ء میں (د)2011ء میں (د)

سبق سے متعلق کثیر الانتخابی سوالات

1۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں اور شمالی علاقوں کی زبانوں کے علاوہ زبانیں ہیں:
(الف) مقبوضہ کشمیر کی (ب) آزاد کشمیر کی (ج) فاٹا کی (د) گلگت بلتستان کی (ب)

2۔ پاکستان کی تمام زبانیں اپنے اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں، جذبات واحساسات اور طریقِ تمدن ومعاشرت کی ہیں:
(الف) نمائندہ (ب) عکاس (ج) آئینہ دار (د) ترجمان (ج)

3۔ ان زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا موجود ہے:
(الف) خزانہ (ب) اثاثہ (ج) سرمایہ (د) ذخیرہ (د)

4۔ علاقائی زبانیں مخصوص علاقوں کے تعلق سے بظاہر ایک دوسری سے ہیں:
(الف) مختلف (ب) ایک جیسی (ج) مترادف (د) متضاد (الف)

5۔ علاقائی زبانوں کو بغور دیکھا جائے تو ان میں رشتے قائم ہیں، تاریخی، تمدنی اور:
(الف) برادرانہ (ب) مساویانہ (ج) روحانی (د) جسمانی (ج)

6۔ علاقائی زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی نشوونما جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی ہے:
(الف) دین (ب) باقیات (ج) برکات (د) مرہونِ منت (د)

7۔ ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ، رسم الخط، روزمرہ محاورات، تلمیحات وضرب الامثال اور روایات وحکایات سے نمایاں ہوتی ہے:
(الف) اصلیت (ب) حقیقت (ج) فضیلت (د) دلیل (ب)

8۔ پاکستان کی علاقائی زبانیں رکھتی ہیں اسلامی:
(الف) تشخص (ب) حقیقت (ج) روایات (د) تاریخ (الف)

9۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے شعروادب نے _____ کے فیوض وبرکات کے سائے میں پرورش پائی ہے:
(الف) بزرگوں (ب) پیروں (ج) صوفیائے کرام (د) علما کرام (ج)

10۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں نے اخوت ومساوات، غیرت وحمیت اور باہمی مہر ومحبت کی اعلیٰ انسانی اقدار کی پاس داری کا فریضہ:
(الف) نبھایا (ب) سرکیا (ج) انجام دیا (د) پورا کیا (ج)

11۔ پاکستانی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ:
(الف) میراث ہے (ب) ورثہ ہے (ج) خزانہ ہے (د) قیمتی سرمایہ ہے (الف)

12۔ اپنے دائرۂ اثر کے اعتبار سے پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہندکو، سرائیکی اور _____ زبانیں یہاں کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں:
(الف) براہوی (ب) کشمیری (ج) ہریانوی (د) مکرانی (ب)

13۔ شمالی علاقوں اور چترال کی زبانیں بھی قابلِ قدر _____ رکھتی ہیں:
(الف) لوک ورثہ (ب) تاریخی پس منظر (ج) ادبی سرمایہ (د) تاریخی اہمیت (ج)

14۔ پاکستانی زبانوں میں پشتو، پنجابی، سندھی اور _____ پاکستانی آبادی کے وسیع حصے کی زبانیں ہیں:
(الف) سرائیکی (ب) ہندکو (ج) کشمیری (د) بلوچی (د)

15۔ سندھ کی عظیم ادبی شخصیت ہیں:
(الف) شاہ عبداللطیف بھٹائی (ب) سلطان باہو (ج) رحمان بابا (د) وارث شاہ (الف)

16۔ پنجاب کی عظیم ادبی شخصیت ہیں:
(الف) رحمان بابا (ب) سچل سرمست (ج) بُلھے شاہ (د) خوش حال خاں خٹک (ج)

17۔ سرحد کی عظیم ادبی شخصیت ہیں:
(الف) رحمان بابا (ب) بُلھے شاہ (ج) سچل سرمست (د) مست توکلی (الف)

18۔ بلوچستان کی عظیم ادبی شخصیت ہیں:
(الف) وارث شاہ (ب) سچل سرمست (ج) رحمان بابا (د) مست توکلی (د)

19۔ پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں بیشتر ایک ہی اصل کی مختلف ہیں:
(الف) شاخیں (ب) شاخیں (ج) ثقافتی ورثہ (د) تہذیبی ورثہ (ب)

20۔ جغرافیائی صورتِ حال اور مرورِ زمانہ کے باعث علاقائی زبانوں میں پیدا ہوتے گئے:
(الف) خیالات (ب) حالات وواقعات (ج) تغیرات (د) نظریات (ج)

21۔ علاقائی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں بے پناہ اضافہ ہوا، جب یہاں حکومت کرتے تھے:
(الف) ہندو (ب) عیسائی (ج) سکھ (د) مسلمان (د)

22۔ پاکستان کی علاقائی زبانیں پیوست ہیں گہرے:
(الف) تضادات میں (ب) تاریخی رشتوں میں (ج) مسائل میں (د) معاشرتی رشتوں میں (ب)

23۔ ہم علاقائی طور پر سرحدی ہوں یا پنجابی، سندھی ہوں یا بلوچی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ سب ہیں:
(الف) مسلمان (ب) پاکستانی (ج) انسان (د) متحد (ب)

24۔ ہم سب پاکستانی ہیں۔ یہ رشتہ ہمارے تمام تسلی، علاقائی اور لسانی رشتوں پر رکھتا ہے:
(الف) اہمیت (ب) مقام (ج) فوقیت (د) عظمت (ج)

25۔ اُردو ہی پاکستان کی وہ واحد زبان ہے جو ہمارے کسی علاقے کی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی زبان ہے:
(الف) خاص طبقے کی (ب) عام طبقے کی (ج) سبھی کی (د) پاکستانیوں کی (ج)

26۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے:
(الف) پنجابی (ب) اُردو (ج) سندھی (د) پشتو (ب)

27۔ اُردو زبان کے علمی وادبی سرمائے میں اضافہ کرنے والے لوگ شامل ہیں:
(الف) سندھ کے (ب) پنجاب کے (ج) تمام علاقوں کے (د) بلوچستان کے (ج)

28۔ پاکستان کا کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں موجود نہ ہوں اردو کے :
(الف) شاعر (ب) ادیب (ج) صوفیا (د) شاعر اور ادیب (د)

29۔ پاکستان کے کس صوبے کا دعویٰ ہے کہ اُردو اس کے ہاں پیدا ہوئی ہے:
(الف) پنجاب کا (ب) سندھ کا (ج) بلوچستان کا (د) تمام صوبوں کا (د)

30۔ اردو کی تاریخ پر بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے ہمارے:
(الف) شعرا نے (ب) ادیبوں نے (ج) محققین نے (د) نقادوں نے (ج)

31۔ پنجاب میں اُردو، سندھ میں اُردو، سرحد میں اُردو اور بلوچستان میں اُردو کے عنوانات کے تحت متعدد _____ :-
(الف) کتابیں لکھی گئیں (ب) مقالے لکھے گئے (ج) خطبات لکھے گئے (د) تقریریں لکھی گئیں (الف)

32۔ مقامی زبانوں اور اُردو کے لسانی روابط پر بھی خاصی ہو چکی ہے:
(الف) چھان بین (ب) تحقیق (ج) تنقید (د) تحقیق وتنقید (ب)

33۔ دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر گہرے اثرات ڈالے ہیں:
(الف) پنجابی ادب نے (ب) سندھی ادب نے (ج) اُردو ادب نے (د) بلوچی ادب نے (ج)

34۔ اُردو میں اب لب ولہجہ پیدا ہو رہا ہے خالصتاً:
(الف) پاکستانی (ب) سندھی (ج) پنجابی (د) بلوچی (الف)

35۔ تخلیقِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ہے:
(الف) سندھی زبان نے (ب) بلوچی زبان نے (ج) پنجابی زبان نے (د) اُردو زبان نے (د)

حصہ نظم

- ☆ امتحانی نقطۂ نظر سے اشعار کی تشریح کے حوالے سے اہم معلومات
- ☆ شاعر کا تعارف ☆ نظم کا خلاصہ
- ☆ نظم کا مرکزی خیال ☆ حل لغت
- ☆ اشعار کا مفہوم ☆ اشعار کی تشریح
- ☆ فنی محاسن

حصہ نظم

امتحانی پرچے میں حصہ نظم میں سے کل پچیس نمبر کا سوال آتا ہے۔ پرچے میں حصہ نظم سے دو سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ حصہ انشائی کا پہلا سوال اشعار کی تشریح سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ حصہ ''الف'' میں نظم کے دو اشعار کی تشریح درکار ہوتی ہے۔ اس کے دس نمبر ہوتے ہیں۔ اس کی ترتیب "8+1+1" ہوتی ہے۔ ایک نمبر نظم کا عنوان، ایک نمبر کا شاعر کا نام اور آٹھ نمبر کی تشریح۔

حصہ ''ب'' میں غزل کے تین اشعار کی تشریح درکار ہوتی ہے۔ اس کے نمبروں کی ترتیب "(3+3+3+1)" ہوتی ہے۔ ایک نمبر کا شاعر کا نام اور تین نمبر ہر ایک شعر کی تشریح کے ہوتے ہیں۔

یاد رکھیں:

- ☆ حصہ نظم میں شاملِ نصاب کسی بھی ایک نظم کے دو مسلسل اشعار دیے جاتے ہیں۔
- ☆ حصہ غزل میں کسی ایک ہی غزل میں سے تین اشعار دیے جاتے ہیں۔
- ☆ نظم کے اشعار کی تشریح اکٹھی کرنی چاہیے جب کہ غزل کے ہر شعر کی الگ الگ تشریح کرنی چاہیے۔

ادبی اصطلاحات

شعر:

دو مصرعے جو ایک وزن پر ہوں اور ان میں ایک خیال پیش کیا گیا ہو، شعر کہلاتا ہے۔ شعر میں جذبے اور تخیل کا ہونا ضروری ہے۔

- ☆ نظم کا ہر شعر باہم مربوط ہوتا ہے۔ پوری نظم میں کسی ایک خیال کو پیش کیا جاتا ہے۔
- ☆ غزل کا ہر شعر الگ اکائی ہوتا ہے۔ اس کا اپنا مفہوم ہوتا ہے۔ شعر کے لیے ''ے'' علامت استعمال کرتے ہیں۔

ے تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
(میر درد)

ے سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
(مرزا غالب)

مصرع:

مصرع کا لفظی مطلب دروازے کا ایک کواڑ یا پٹ ہوتا ہے۔ اس سے مراد آدھا شعر لیا جاتا ہے۔ شعر کا ایک حصہ مصرع کہلاتا ہے۔ اس کے لیے 'ع' کی علامت استعمال کرتے ہیں۔

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ع غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا

تشبیہ:

تشبیہ کا مطلب ہے ایک چیز کو دوسری چیز کی مانند قرار دینا۔

علم بیان کی اصطلاح میں کسی چیز کو اس کی مشترک خصوصیات کی وجہ سے کسی دوسری چیز جیسا قرار دینا تشبیہ کہلاتا ہے۔

مثلاً: پھول کی طرح نازک، سیب کی طرح سرخ، برف کی مانند ٹھنڈا وغیرہ۔

تشبیہ کے لیے کچھ حروف مخصوص ہوتے ہیں جیسے: مانند، کی طرح، کے جیسا، کا سا، کے سے، کی سی، مثل، کی طرح، جیسا، ایسی وغیرہ۔

استعارہ:

استعارہ کا لفظی مطلب ہے ''ادھار لینا''۔ اگر کوئی لفظ اپنے اصل معنوں کی بجائے مجازی معنوں میں استعمال کیا جائے اور اس کے اصلی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق پایا جائے تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ مثلاً: بہادر کو شیر کہنا، چالاک کو لومڑی کہنا۔

تلمیح:

تلمیح کا لفظی مطلب ''اشارہ کرنا''۔ علم بدیع کی اصطلاح میں کلام میں کسی لفظ یا لفظوں کا استعمال کرنا جو کسی مخصوص آیت، حدیث یا تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کریں، تلمیح کہلاتا ہے۔ مثلاً: آتشِ نمرود، چاہِ یوسف، حسنِ یوسف، کوہِ طور، تختِ سلیمان وغیرہ۔

آفاقیت:

شعر میں ایسے جذبات اور احساسات بیان کرنا جو عالمگیر اور ہمہ گیر ہوں، جن میں تمام انسانیت کے لیے یکساں مفید اور مقبول ہونے کی صلاحیت ہو۔

ے نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں (میر درد)

صنعتِ تضاد:

شعر میں ایسے الفاظ لانا جو ایک دوسرے کے اُلٹ ہوں، متضاد کہلاتے ہیں، مثلاً:

ے ایک سب آگ ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں (میر درد)

سہلِ ممتنع:

ایسا شعر جو دیکھنے میں بہت آسان ہو لیکن اس جیسا شعر لکھنا ممکن نہ ہو۔ اتنا آسان شعر کہ اس سے آسان شعر کہنا ممکن نہ ہو۔

ے تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن خان مومن)

ایہام:

ایسا شعر جس میں ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن کے دو مطلب ہوں، ایک مطلب قریب کا ہو اور دوسرا بعید کا۔ اس کو پڑھنے والا معنوں کی وجہ سے وہم میں پڑ جاتا ہے، وہ یقین نہیں کر پاتا کہ اس کے معانی کون سے ہیں۔

مراعاۃ النظیر:

ایک شعری صنعت جس میں باہم مناسبت رکھنے والی چیزوں کا ایک جگہ ذکر کیا گیا ہو، مثلاً: کسی شعر میں چمن، پھول، بلبل، گھاس اور درختوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہو۔

ے پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے
(میر تقی میر)

منظر نگاری:

کلام میں اردگرد کا ماحول اس طرح بیان کرنا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، منظر نگاری کہلاتا ہے۔

- بھلا بھلا کے جتایا ہے ان کو رازِ نہاں — چھپا چھپا کے محبت کو آشکار کیا (داغؔ دہلوی)
- صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
  ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو (علامہ اقبالؒ)

صنعتِ سیاقۃ الاعداد:

اگر شعر میں اعداد (گنتی) کا ذکر ہو تو اسے صنعتِ سیاقۃ الاعداد کہتے ہیں۔

- مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمایاں — ہم آئینے کے سامنے جب آ کے ہو کریں (میر دردؔ)
- شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر — اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش (میر تقی میرؔ)

رجائیت:

کلام میں اشیا و واقعات کا روشن پہلو دیکھنا اور مستقبل کے بارے میں پُر امید نقطۂ نظر رکھنا رجائیت کہلاتا ہے۔

یاسیت:

کلام میں مایوسی اور ناامیدی کا اظہار کرنا یاسیت کہلاتا ہے۔

صنعتِ تضمین:

کسی شاعر کے ایک مصرعے پر دوسرا مصرع لگا کر نیا شعر کہنا قواعد کی رُو سے تضمین کہلاتا ہے۔

- یہ امت اسی بات میں کھو گئی — حقیقت خرافات میں کھو گئی (سید محمد جعفریؔ)

صنعت لف و نشر:

لف کا مطلب لپیٹنا اور نشر کا مطلب پھیلانا ہے۔ علم بدیع کی رو سے اگر کلام میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کیا جائے اور پھر ان کی مناسبت سے ایسے الفاظ لائے جائیں جو اس کی وضاحت کریں۔

- ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

حسنِ تعلیل:

وہ صنعت جس میں شاعر یا مصنف ایسی چیز کو کسی چیز کی علت (وجہ) قرار دیتا ہے، جو درحقیقت اس کی علت نہیں ہوتی۔

- میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا — بلبلیں سن کر میرے نالے، غزل خواں ہو گئیں (مرزا غالبؔ)

تغزل:

شعر میں نفاست و نزاکت، رمز و ایما، بے ساختگی اور جذبے کا سوز و گداز تغزل کہلاتا ہے۔ تغزل کے لیے غزل کا ہونا ضروری نہیں، یہ نظم کے اشعار میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس میں گہرے جذبات کو نرمی اور آہستگی سے بیان کیا جاتا ہے۔

شاعر
ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ
(1877-1938)

سبق ۱۳: اے وادیِ لولاب!

شاعر کا تعارف

علامہ اقبالؒ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد گرامی شیخ نور محمد بڑے پرہیز گار اور عبادت گزار انسان تھے۔ ان کی والدہ امام بی بی بھی بڑی خلیق، نیک سیرت اور زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔ ان کا زیادہ تر وقت محلے کی بچیوں کو تعلیم دینے اور عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ نیکوکار والدین سے تربیت پانے کے ساتھ ساتھ اقبالؒ نے ابتدائی تعلیم سید میر حسن کی درس گاہ سے حاصل کی۔ علامہ اقبالؒ اپنے مقام و مرتبہ کو ہمیشہ انھی کا فیض سمجھتے تھے۔ سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج لاہور سے پاس کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انھیں فلسفے کے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ مل گئے جو آپؒ کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے فلسفے کے ساتھ اقبالؒ کے فطری لگاؤ کو دیکھ کر ان کے خیالات کو اور بھی جلا بخشی۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ اپنے احباب میں اقبالؒ کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ بعد ازاں اقبالؒ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں مقیم رہے۔ انھوں نے جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی جب کہ لندن سے قانون کی سب سے بڑی ڈگری بار ایٹ لا حاصل کی۔

علامہ اقبالؒ برِعظیم کے مسلمانوں بلکہ امت مسلمہ کے اس لحاظ سے بہت بڑے محسن ہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے سے مسلمانوں کے دلوں میں حرارت اور خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پیروی قرآن اور اطاعت رسول ﷺ کا درس دیا اور خودی، مردِ مومن اور شاہین جیسی اصطلاحات اور علامات کے ذریعے سے مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے کی کام یاب کوشش کی۔ اسی بنا پر انھیں ''حکیم الامت'' اور ''شاعرِ مشرق'' جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی کتابوں میں ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم''، ''ارمغانِ حجاز'' (نصف حصہ) اردو شاعری کی کتابیں ہیں جب کہ ''اسرار و رموز''، ''پیامِ مشرق''، ''زبورِ عجم''، ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغانِ حجاز'' (نصف حصہ) فارسی شعری مجموعے ہیں۔ اس نصابی کتاب میں ان کی نظم ''اے وادیِ لولاب'' شامل ہے جو ''ارمغانِ حجاز'' سے لی گئی ہے۔

نظم کا خلاصہ

اے وادیٔ لولاب تیرے چشموں کا پانی پارے کی طرح بے تاب ہے۔ تیری فضا میں پرندے بے قرار ہیں۔ اگر منبر و محراب سے تیرے لیے آواز بلند نہ ہو تو پھر دینِ مومن کے لیے موت ہے۔ اگر تیری آزادی کے لیے مُلّا کا علم اور صوفی کی بصیرت کچھ نہیں کر رہے تو وہ بے کار ہیں۔ مجھے اس وادی میں ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا جس کی آواز قوم میں آزادی کی روح پھونک دے۔

مرکزی خیال

اے وادیٔ لولاب فطرت کی ہر چیز تیری آزادی اور خود مختاری کے لیے بے تاب ہے لیکن تیرے باشندوں میں ابھی وہ جذبہ صحیح طور پر بیدار نہیں ہوا۔ ان کی آزادی ان کے اندر دین کے صحیح جذبے اور تڑپ پر موقوف ہے۔ کاش علمائے دین اور خطیبوں میں دین کی صحیح سمجھ پیدا ہو اور تیرے باشندوں تک دین کا صحیح پیغام پہنچ جائے۔

اشعار کی تشریح

بند نمبر 1

- پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
  مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
  اے وادیِ لولاب

حل لغت

سیماب: پارہ، مرغان: پرندے، سحر: صبح، بے تاب: بے چین، فضا: ہوا۔ مُرغانِ سحر: صبح کے پرندے

مفہوم

اے وادیِ لولاب! تیرے چشموں میں پانی پارے کی طرح متحرک ہے۔ تیری فضا میں صبح کے پرندے بے قرار ہیں۔

تشریح

علامہ محمد اقبالؒ فطرت شناس شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے مناظر سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر اقبالؒ کے آباؤ اجداد کا علاقہ تھا اس لیے اقبالؒ کو اس خطے سے خاص طرح کی محبت تھی۔ اس کا اظہار اس نظم میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''اے وادیِ لولاب!'' کا اصل عنوان ''مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ مُلّا ضیغم لولابی ایک فرضی شخص ہے جس کا تعلق کشمیر کی ایک خوب صورت وادی لولاب ہے۔ اس کی یادداشتوں میں ایک فرضی بیاض (ڈائری) ہے جس میں درج خیالات کو علامہ اقبال نے انیس (19) نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جن کا مقصد کشمیر کے باشندوں کو ہندو راجا کی غلامی سے آزادی پر ابھارنا ہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ الغرض اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

تشریح طلب بند میں شاعر نے وادیٔ لولاب کے حسن و جمال کو اپنے فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وادیٔ لولاب کشمیر کی ایک وادی ہے جو سرسبز اونچے حسین کوہساروں کے درمیان صاف شفاف ندی نالوں اور مرغزاروں سے مزین ہے۔ علامہ اقبالؒ وادیٔ لولاب کے چشموں کے پانی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ چشمے مسلسل رواں دواں ہیں۔ ان کا پانی ٹھہرا ہوا نہیں ہے بلکہ مسلسل حرکت میں ہے۔ شاعر نے وادی کے چشموں کے پانی کی مسلسل حرکت کو ''سیماب'' سے تشبیہ دی ہے۔ سیماب پارہ (مرکری) کو کہتے ہیں۔ پارہ ایک ایسی چاندی کے رنگ کی دھات ہے جو مائع حالت میں رہتی ہے اور بہت زیادہ حرکت کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح پارہ سکون سے نہیں رہ سکتا اسی طرح اس وادی کے چشموں کا پانی بھی ہر لحہ بے تاب و بے قرار رہتا ہے۔ اے وادیٔ لولاب! تیرے چشموں کا پانی صاف، شفاف، سفید اور پارے کی طرح تڑپتا ہوا ہے۔ ان چشموں میں اضطراب کی کیفیت ہے۔ جو حالت اس پانی کی ہے وہی اسے پینے والوں کی بھی ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کے قائل تھے۔ وہ اس پر غاصبوں کے قبضے کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے کشمیری جوانوں کی آزادی سے محبت اور بے تابی اقبالؒ کو بہت بھاتی تھی۔ آپؒ نے چشموں کے پانی کی بے تابی بیان کر کے درحقیقت اہلِ کشمیر کی بے قراری بیان کی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں حرکت و عمل اور جہدِ مسلسل کا پیغام دیا ہے۔ مسلسل حرکت میں رہنا اور نئے جہان کی جستجو کرنا اقبالؒ کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ آپ نے زندگی کو حرکت سے تعبیر کیا ہے۔ دائمی حیات کے لیے مستقل حرکت ضروری ہے۔ ایک جگہ آپؒ نے فرمایا:

؎ چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں

دوسرے مصرعے میں شاعر نے وادیٔ لولاب میں صبح کے وقت چہچہانے والے پرندوں کی بے قراری کا ذکر کیا ہے۔ جس طرح وہاں کے چشموں کا پانی بے تاب ہے اسی طرح وہاں کے پرندے بھی فضاؤں میں بے قرار ہیں۔ وہ بھی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھ سکتے بلکہ اِدھر سے اُدھر اُڑتے رہتے ہیں۔ اپنی بلند پروازی سے اپنی بے تابی و بے قراری کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ پرندوں کی یہ بے قراری ان کی زندگی کا باعث ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مرغانِ سحر فضاؤں میں بے قرار و بے تاب ہیں۔ صبح کے وقت خوش آواز پرندے چہچہاتے ہیں اور خدا کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے پرندوں کی چہچاہٹ میں ایک بے تابی اور بے قراری دکھائی دیتی ہے۔ ایک اور جگہ اقبالؒ کہتے ہیں:

؎ تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند
(علامہ اقبال)

اس بند میں اقبال نے خطابیہ انداز اختیار کیا ہے۔ بظاہر وادیٔ لولاب کو خطاب کیا گیا ہے لیکن اس کے در پردہ اس کے باشندے مخاطب ہیں۔ تشبیہ اور استعارے نے شعر کے حسن کو بڑھا دیا اور اس کے مفہوم کو وسیع کر دیا ہے۔ وادیٔ لولاب کے چشموں کے پانی کی حرکت کو ''سیماب'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ''مرغانِ سحر'' کا استعارہ اہلِ بصیرت اور اہلِ علم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عمدہ منظر نگاری، گویا شاعرانہ مصوری ہے۔

بند نمبر 2

؎ گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیِ لولاب

حل لغت

صاحبِ ہنگامہ: انقلاب برپا کرنے والے، جوش و جذبہ رکھنے والا، منبر: مسجد میں خطبہ دینے کی جگہ، مراد مسجد کا خطیب۔
محراب: مسجد میں وہ کمان نما جگہ جہاں امام کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے، مراد مسجد کا امام۔

مفہوم

اگر منبر و محراب کا وارث لوگوں کے دلوں میں انقلاب برپا نہیں کر سکتا تو اس کا دین اس کے لیے موت یا خواب کے برابر ہے۔

تشریح

علامہ محمد اقبالؒ فطرت شناس شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے مناظر سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر اقبالؒ کے آباؤ اجداد کا علاقہ تھا اس لیے اقبالؒ کو اس خطے سے خاص طرح کی محبت تھی۔ اس کا اظہار اس نظم میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''اے وادیِ لولاب!'' کا اصل عنوان ''مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ مُلّا ضیغم لولابی ایک فرضی کردار ہے جس کا تعلق کشمیر کی ایک خوب صورت وادی لولاب ہے۔ اس کی یادداشتوں میں ایک فرضی بیاض (ڈائری) ہے جس میں درج خیالات کو علامہ اقبال نے انیس (19) نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جن کا مقصد کشمیر کے باشندوں کو ہندو راجا کی غلامی سے آزادی پر ابھارنا ہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ الغرض اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری میں حریت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آپؒ نے امتِ مسلمہ کو آزادی کا درس دیا۔ چوں کہ اقبالؒ کو کشمیر سے دلی وابستگی تھی اس لیے آپؒ اس کی غلامی پر بہت غم زدہ ہوتے تھے۔

تشریح طلب بند میں شاعر علما اور صوفیائے کرام کو حُریّت پسندی کا درس دینے اور لوگوں کو اس کے لیے اُبھارنے کا کہہ رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر مساجد سے حریت کا نعرہ بلند ہوگا تو لوگ اس پر زیادہ توجہ دیں گے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ علمائے کرام لوگوں میں جذبۂ جہاد پیدا کریں۔ کیوں کہ جہاد ایمان کی روح ہے۔ ایک اور مقام پر آپؒ فرماتے ہیں:

؎ نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

علامہ محمد اقبالؒ کی نظر میں اس ایمان کی کوئی وقعت نہیں جس میں حریت اور جہاد کی تبلیغ نہ ہو۔ اسلام میں آزادی پر بہت

زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس لیے اسلام نے غلامی کا نظام ختم کر دیا۔ جہاد مسلمان کی رگ رگ میں بسا ہونا چاہیے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ وادیِ لولاب کے علمائے کرام کو مسجدوں میں ایسے خطاب کرنا چاہیے کہ لوگ آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر وادی کو غلامی سے آزاد کروالیں۔ اگر علمائے کرام ایسا نہیں کرتے تو پھر ان کے ایمان کا کوئی بھروسا نہیں۔ بزدلی ایمان کی موت ہے۔ مذہب اسلام میں علمائے کرام کو بہت زیادہ عزت و احترام دیا گیا ہے۔ علمائے کرام کو انبیائے کرام کا وارث کہا گیا ہے۔ جس قدر بلند مقام ہو ذمہ داری بھی اسی قدر بڑی ہوتی ہے۔ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو جہاد کا اصل معانی و مفہوم بتائیں اور ان میں آزادی کی تڑپ بیدار کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنے منصب سے بے وفائی کرتے ہیں۔ اسی لیے اقبال کو مجاہد پسند ہے کیوں کہ وہ جذبہ جہاد سے لبریز ہے اور ملا صرف باتوں تک محدود ہو کے رہ گیا ہے۔ بقول اقبالؒ:

؎ الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

دوسرے مصرعے میں شاعر کہتے ہیں کہ اگر دین میں کوئی جوش و جذبہ اور سرگرمی نہ ہو تو وہ بندۂ مومن کے لیے موت کی طرح ہے یا پھر محض ایک خواب ہے۔ یہاں ''موت'' سے مراد دین کی عدم فعالیت ہے اور ''خواب'' سے مراد دین کا خیالی تصور اور خیالی باتیں ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک دین ایک زندہ حقیقت ہے اور اسے بندۂ مومن کی زندگی میں متحرک نظر آنا چاہیے۔ ورنہ یہ محض ایک نظریاتی اور خیالی تصور بن کر رہ جاتا ہے۔

اے وادیِ لولاب اگر تیری مسجدوں کے امام اور خطیب اپنے دل میں دین کا صحیح جذبہ، تڑپ اور جوش و ولولہ نہیں رکھتے اور مسجد کے منبر و محراب سے لوگوں میں آزادی کی تڑپ اور آزادی کا جذبہ بیدار کرنے کی صدا بلند نہیں ہوتی تو پھر ان کا دین، دین نہیں ہے۔ یہ صرف خیالی باتیں ہیں۔ ایسا دین تو موت کے مترادف ہے جو تمھیں بھی مردہ کر دیتا ہے یا یہ خواب کی مانند ہے جو تمھیں بھی حقیقت سے غافل رکھتا ہے۔ کیوں کہ دین تو جدوجہد اور جہاد کا درس دیتا ہے۔ سعی و عمل اور آزادی کا درس دیتا ہے۔ کاش مساجد کے آئمہ کرام اور خطیبوں میں دین کی صحیح تفہیم پیدا ہو جائے۔

؎ کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

(علامہ اقبال)

یہ بند بھی تشبیہ، استعارے اور خطابیہ اندازِ کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ مصرع اولیٰ میں منبر و محراب کی اہمیت اور ذمہ داری کو بیان کیا گیا ہے اور ''صاحبِ ہنگامہ'' کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ مصرع ثانی میں دینی جوش و جذبے کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور دین کی عدم فعالیت اور غیر عملی کو موت اور خواب سے تشبیہ دی گئی ہے۔

بند نمبر 3

؎ ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مضراب
اے وادیِ لولاب

حل لغت

موقوف: منحصر، انحصار، **نواہائے جگرسوز:** جگر کو چیر دینے والی آوازیں، مراد تڑپا دینے والی آوازیں، **مضراب:** ایک خاص مثلثی تار جسے اُنگلی میں پہن کر ستار کو بجایا جائے، اسے آلہ ضرب بھی کہتے ہیں۔

مفہوم

اے وادیِ لولاب! آزادی کی تڑپ پیدا کرنے والا جذبہ راہ نماؤں پر موقوف ہے۔ اگر وہ سُست پڑ جائیں تو آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔

تشریح

علامہ محمد اقبالؒ فطرت شناس شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے مناظر سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر اقبالؒ کے آباؤ اجداد کا علاقہ تھا اس لیے اقبال کو اس خطے سے خاص طرح کی محبت تھی۔ اس کا اظہار اس نظم میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''اے وادیِ لولاب!'' کا اصل عنوان ''مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ مُلّا ضیغم لولابی ایک فرضی شخص ہے جس کا تعلق کشمیر کی ایک خوب صورت وادی لولاب ہے۔ اس کی یادداشتوں میں ایک فرضی بیاض (ڈائری) ہے جس میں درج خیالات کو علامہ اقبال نے 19 نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جن کا مقصد کشمیر کے باشندوں کو ہندو راجا کی غلامی سے آزادی پر ابھارنا ہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ الغرض اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ حریت پسند شاعر تھے۔ آپؒ کی شاعری میں مسلم امت کی بیداری کی کوشش کی گئی ہے۔ آپؒ نے مسلمانوں میں آزادی کی امنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تشریح طلب بند میں شاعر نے اپنے مقصد کے بیان کے لیے موسیقی کی اصطلاحات کا سہارا لیا ہے۔ ساز اور اس سے متعلقہ علامتوں کے استعمال سے اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے وادیِ لولاب کے باشندو! اگر کسی ستار کے تار ڈھیلے ہوں تو مضراب بے کار ہوتا ہے اور اس سے ساز پیدا نہیں ہوتا، جب کہ جگر کو تڑپا دینے والی آواز کا انحصار ساز پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب تک تم اپنے اندر دین کا صحیح جذبہ اور تڑپ پیدا نہیں کرو گے دین تمھارے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرے گا۔

ستار ایک مخصوص قسم کا ساز ہوتا ہے جس میں تار لگے ہوتے ہیں۔ ان تاروں کے تناؤ کی وجہ سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ تار جتنے زیادہ تنے ہوں آواز اتنی ہی زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ کسی ستار کے تار ڈھیلے ہوں تو مضراب سے ضرب لگانے کے باوجود جگر کو حرارت دینے والے نغمے پیدا نہیں ہوتے۔ اس بند میں مضراب سے مراد دینِ اسلام ہے اور ساز سے مراد مسلمان ہے۔ ڈھیلے تاروں والے ساز میں اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح مسلمان کا ایمان اور جذبہ بھی ستار کے تار کی طرح ہے۔ اگر یہ مضبوط اور طاقت ور ہوگا تو اس سے آزادی کا نغمہ گونجے گا۔ اگر یہ کمزور ہوگا تو پھر اس سے ایسی کوئی بھی آواز آنا ناممکن ہے۔ بقول اقبالؒ:

؎ غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (علامہ اقبالؒ)

جگر کو چیر دینے والی آواز، اثر انگیز ساز (خیالات و نظریات) اسی وقت ممکن ہے جب اس کے پیچھے ایک مکمل اور صحیح ساز (داخلی کیفیت و جذبہ) موجود ہو۔ یعنی آپ کے خیالات و نظریات کی اثر انگیزی اسی وقت ممکن ہے جب ان کے پیچھے داخلی کیفیات اور جذبات موجود ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے وادیِ لولاب کے عوام کو بالعموم اور وہاں کے راہ نماؤں اور علمائے کرام کو بالخصوص مخاطب کیا ہے۔ آپ راہ نماؤں اور علمائے کرام سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے اندر جذبۂ جہاد پیدا کریں۔ ان کی تقریر میں جتنی زیادہ قوتِ ایمانی ہوگی اتنا ہی اس کا اثر زیادہ ہوگا۔ لوگ ان کے خیالات سُن کر ان سے متاثر ہوں گے اور آزادی کے لیے کوشش کریں گے۔ اگر خطیب کے لہجے میں توانائی نہ ہو تو اس کی بات لوگوں پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ بقول اقبالؒ:

؎ الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

(علامہ اقبال)

ایک جگہ اقبال کہتے ہیں:

؎ دلِ مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ (علامہ اقبال)

پیام بر کے لیے خلوصِ نیت سب سے اہم چیز ہے۔ اگر وہ قوم کا سچا ہمدرد اور خیر خواہ ہوگا تو وہ قوم میں ضرور آزادی کی امنگ پیدا کرے گا۔ اگر علمائے کرام اپنے خطبات میں آزادی کی ضرورت و اہمیت اور جہاد کی فرضیت بیان کریں تو لوگوں کے دل جذبہ جہاد سے سرشار ہو جائیں۔ اقبالؒ لوگوں میں آزادی کا ایسا جذبہ چاہتے ہیں جو طوفان کی طرح ہر چیز کو تہس نہس کر دے۔

؎ شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تُو (علامہ اقبال)

یہ بند بھی تشبیہ، استعارے اور خطابیہ انداز کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ مصرع اولیٰ میں ''نواہائے جگر سوز'' ایک بلیغ فارسی ترکیب ہے۔ مصرع ثانی میں ''ڈھیلے تار'' اور ''مضراب'' کا استعارہ سرد جذبات، مردہ ایمان اور کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

بند نمبر 4

مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے مے خانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیِ لولاب

حل لغت

مُلّا: مولوی، دین کا نمائندہ۔ نورِ فراست: دانائی کی روشنی، بصیرت کا نور، دور اندیشی۔ بے سوز: جس میں حرارت نہ ہو، مے خانہ: شراب خانہ۔ صوفی: روحانیت کا نمائندہ۔ مئے ناب: خالص شراب۔

مفہوم

اے وادی لولاب کے باشندو! ملا کی نظر دانائی اور بصیرت کے نور سے خالی ہے اور صوفی کی خانقاہ میں بھی اب وہ تعلیم نہیں ہے جو قوتِ عمل پیدا کر سکے۔

تشریح

علامہ محمد اقبالؒ فطرت شناس شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے مناظر سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر اقبالؒ کے آباؤ اجداد کا علاقہ تھا اس لیے اقبال کو اس خطے سے خاص طرح کی محبت تھی۔ اس کا اظہار اس نظم میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''اے وادیٔ لولاب!'' کا اصل عنوان ''مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ مُلّا ضیغم لولابی ایک فرضی شخص ہے جس کا تعلق کشمیر کی ایک خوب صورت وادی لولاب ہے۔ اس کی یادداشتوں میں ایک فرضی بیاض (ڈائری) ہے جس میں درج خیالات کو علامہ اقبال نے 19 نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جن کا مقصد کشمیر کے باشندوں کو ہندو راجا کی غلامی سے آزادی پر ابھارنا ہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ الغرض اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کو ظاہر پرست ملا اور صوفی سے شدید اختلاف تھا۔ آپؒ ان سے نالاں تھے کہ وہ بظاہر عالم یا صوفی بنے ہوئے ہیں لیکن اپنے علم سے لوگوں کو عمل کا درس نہیں دے سکتے۔ ان کی بات میں کوئی لذت ہی نہیں کیوں کہ وہ بے دلی سے گفت گو کرتے ہیں۔ اگر دل میں تڑپ ہو تو پھر زبان سے نکلنے والی بات بھی اثر رکھتی ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (علامہ اقبال)

تشریح طلب بند میں علامہ اقبالؒ وادیٔ لولاب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے وادیٔ لولاب! تیرے علما اور صوفی بے ذوق ہو چکے ہیں۔ آج تیرے شریعت اور طریقت کے علَم بَردار خود دین پر عمل پیرا نہیں رہے۔ شریعت کے علَم بَردار مولوی، مُلّا اور علما بصیرت و دانائی کے اس نور سے محروم ہیں جس سے وہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کی حقیقت کو دیکھ سکیں۔ ان کی تہ تک پہنچ سکیں اور ان کا انجام دیکھ سکیں۔ ان کے دماغ دین کی صحیح سمجھ بوجھ سے خالی ہیں۔ وہ محض سطحی اور ظاہری علم پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی اور حکمت موجود نہیں۔ طریقت کے علم بردار پیر فقیر اور صوفیوں کی خانقاہیں بھی اس خالص شراب (تعلیم، جوش و جذبہ) سے محروم ہیں جسے پی کر انسان خدا کی محبت میں ڈوب جاتا ہے اور گناہوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ آج صوفی بھی صرف نام کے رہ گئے ان کے پاس وہ شراب (تعلیم، جوش و جذبہ) نہیں جو روح میں حرارت پیدا کر دے۔ الغرض نہ تو علما کے مدرسوں میں کوئی ایسا

جذبہ موجود ہے جو لوگوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کر دے اور نہ ہی صوفی کی خانقاہ میں ایسی کوئی تعلیم ہے جو لوگوں کو عمل کا درس دے سکے۔ اقبال دونوں طبقات سے ہی دل برداشتہ ہیں۔ آپؒ ایک جگہ فرماتے ہیں:

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب — نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے (علامہ اقبال)
خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں (علامہ اقبال)

اس بند میں اقبالؒ نے علم و عمل کی شراب کا ذکر کیا ہے کہ جسے پینے کے بعد بے خودی کی کیفیت طاری ہو جائے۔ قوموں کی بیداری میں علما کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ یہ قوموں کی تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ جس رخ پر چاہیں قوم کو ڈال سکتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کے علما قوتِ عمل سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ اب ان کی تعلیم میں وہ جذبہ ہی نہیں کہ لوگوں میں ایمان کی حرارت پیدا کر سکیں۔ اب وہ تربیتِ قوم کے فریضے سے غافل ہو چکے ہیں۔ اہلِ مدرسہ اب بچوں کو جذبۂ حریت کے بجائے غلامی کے فوائد سکھا رہے ہیں۔ ایسے میں قوم کیسے بیدار ہو سکتی ہے۔ بقول شاعر:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا — کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ (علامہ اقبال)

ایک زمانے میں خانقاہیں مسلمانوں کے لیے تصوف کے مراکز تھے۔ وہاں معرفت کی نایاب شراب ملتی تھی۔ لیکن اس کے بعد یہ خانقاہیں صرف دکھاوے کی رہ گئیں۔ اقبال اس وجہ سے اس خانقاہی نظام سے نالاں تھے کہ اس میں اب معرفت کی جگہ دکھاوا آ گیا ہے۔ وہ لوگوں میں آزادی اور جہاد کی روح پھونکنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکے ہیں۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک — نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ (علامہ اقبال)

یہ بند بھی تشبیہ، استعارے اور خطابیہ اندازِ کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ مُلّا کی نظر کا ''نورِ فراست'' سے خالی ہونا، اپنے اندر وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مصرع ثانی میں ''بے سوز''، ''مے خانۂ صوفی'' اور ''مئے ناب'' کے استعارے خانقاہی نظام کی خامیوں کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔ خطابیہ انداز نے شعر میں جان پیدا کر دی ہے۔

بند نمبر 5

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیِ لولاب

حل لغت

بیدار ہونا: جاگنا، زندہ ہونا، فغانِ سحری: صبح کی فریاد۔ درویش: اللہ والا، وہ شخص جس نے اللہ کے واسطے فقر اختیار کیا ہو، نایاب: نہ ملنے والا، کم یاب۔

مفہوم

اے وادیٔ لولاب! جس مردِ قلندر کی بات سے لوگوں کے دل بیدار ہو جائیں وہ مدت سے یہاں نظر نہیں آیا۔

تشریح

علامہ محمد اقبالؒ فطرت شناس شاعر ہیں۔ وہ فطرت کے مناظر سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ کشمیر اقبالؒ کے آباؤ اجداد کا وطن تھا اس لیے اقبال کو اس خطے سے خاص محبت تھی۔ اس کا اظہار اس نظم میں واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نظم ''اے وادیٔ لولاب!'' کا اصل عنوان ''مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ مُلّا ضیغم لولابی ایک فرضی شخص ہے جس کا تعلق کشمیر کی ایک خوب صورت وادی لولاب ہے۔ اس کی یادداشتوں میں ایک فرضی بیاض (ڈائری) ہے جس میں درج خیالات کو علامہ اقبال نے 19 نظموں میں قلم بند کیا ہے۔ جن کا مقصد کشمیر کے باشندوں کو ہندو راجا کی غلامی سے آزادی پر ابھارنا ہے۔ انھیں آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ کرنا اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا ہے۔ الغرض اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

کلام اقبال میں مردِ قلندر، مردِ حُر اور مردِ درویش کی اصطلاحات خاص انداز میں آئی ہیں۔ آپؒ کی فکر میں مردِ درویش

ہی ہے جو قوم کی بیداری میں کردار ادا کر سکتا ہے کیوں کہ وہ دکھاوا نہیں کرتا بلکہ خالص اللہ کی رضا کے لیے کام کرتا ہے۔ اس کی فکر دلوں پر اثر کرتی ہے۔ وہ حالات کے تابع نہیں ہوتا بلکہ حالات کو اپنے تابع کرنے کی طاقت وقدرت رکھتا ہے۔

درویش خدا کا وہ سچا عاشق ہوتا ہے جو خدا کی محبت میں اس قدر مستغرق ہوتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کا لالچ، حرص و ہوس اور خود غرضی نہیں ہوتی۔ مسلمان کو خالصتاً خدا کے لیے وقف کرنے کا کام صرف درویش کر سکتا ہے۔ وہ خود بھی ''اللہ بس، باقی ہوس'' کے اصول کے تحت زندگی گزارتا ہے۔ اس کی صحبت اور نگاہ کے فیض سے دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ صبح کے وقت مردِ درویش کی خدا کے حضور آہ وفریاد، جو وہ ہر چیز سے مُنھ موڑ کر ذکر وفکر کی صورت میں کرتا ہے، اس کی صحبت میں بیٹھنے والوں پر بھی اثر کرتی ہے اور ان میں بھی روحانی انقلاب پیدا کر کے ان میں انسانیت اور مسلمانی کی صحیح صفات پیدا کر دیتی ہے۔ ''فغانِ سحری'' سے مراد وہ دعا ہے جو علی الصبح کی جاتی ہے۔ تہجد کے وقت خدا کے حضور آنسوؤں سے تر دعا وفریاد اپنے اندر اثر رکھتی ہے۔ یہ دل کو بیدار اور روشن کر دیتی ہے۔ لیکن افسوس! ایک مدت سے مسلمان قوم ایسے درویش سے محروم ہے۔ ایسا درویش ڈھونڈے بھی اب نہیں ملتا۔

وہ درویش جو صرف خدا کے لیے جیتا اور مرتا تھا، جس کی مرضی خدا کی مرضی میں گم ہوتی تھی اور اس بنا پر خدا اس کی مرضی کے مطابق ہر چیز درست کر دیتا تھا، وہ جس کے ہاتھ میں زمانے کی باگ ڈور ہوتی تھی، وہ جدھر چاہے اسے موڑنے کی طاقت رکھتا تھا، وہ جس کے بوریا سے تخت لرز اُٹھتے تھے۔ وہ جس کی جھونپڑی کے سامنے محل جھک جاتے تھے۔ ایسا درویش اب کہیں نظر نہیں آتا۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو — یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں (علامہ اقبال)

وادیٔ کشمیر کے حوالے سے اقبالؒ بہت غم زدہ ہیں کیوں کہ وہاں اب کوئی ایسا درویش دکھائی نہیں دیتا جو اپنے خالص تصوف کی تعلیمات سے لوگوں میں معرفت کا نور بھر دے۔ اب خانقاہوں میں صرف دکھاوے باز صوفی بیٹھے ہیں۔ ان کا کام لوگوں کو بھٹکانا ہوتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

تم بِاِذْنِ اللّٰہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن (علامہ اقبال)

علامہ اقبالؒ کسی ایسے مردِ قلندر کی تلاش میں تھے جس کی ایک نگاہ تقدیر بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جو لوگوں کو غلامی کے اندھیروں سے نکلنے کی روشنی دے سکے۔ آپؒ اس بات سے پریشان ہیں کہ اب انھیں ایسا کوئی درویش نظر نہیں آتا۔ آپؒ چاہتے ہیں کہ اب ملا اور صوفی حقیقی معنوں میں قوم کی اصلاح کے لیے کردار ادا کریں۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ ودل گیری (علامہ اقبال)

علامہ اقبالؒ کی نظر میں کشمیر کی غلامی کی اصل وجہ وہاں کے ملا، لیڈر اور صوفی ہیں جو اپنے اصل مقصد سے ہٹ چکے ہیں۔ وہ قوم کی بیداری میں ناکام ہو چکے ہیں اس لیے قوم غلامی کی زندگی گزار رہی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ وادیٔ کشمیر اب خدا شناس درویشوں سے خالی ہو چکی ہے۔ علامہ اقبالؒ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غم ناک — نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ (علامہ اقبال)

یہ بند بھی تشبیہ، استعارے اور خطابیہ اندازِ کلام کا بہترین نمونہ ہے۔ مصرع اولیٰ میں دل کی بیداری کو ''فغانِ سحری'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مصرع ثانی میں 'درویش'' کا استعارہ ایک روحانی اور بیدار شخصیت کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ نظم کا خطابیہ انداز اپنے اندر ایک جوش وجذبہ رکھتا ہے۔

مشقی سوالات

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) وادیٔ لولاب کے دل کش حسن کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟

جواب: وادیٔ لولاب کے چشموں کا پانی سیماب (پارے) کی طرح ہے۔ صفاف، شفاف، سفید اور متحرک۔ وادیٔ لولاب کی فضاؤں میں صبح کے وقت خوش الحان پرندے چہچہاتے ہیں۔

(ب) علامہ اقبالؒ نے صاحبانِ منبر ومحراب کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟

جواب: اقبال کہتے ہیں اگر صاحبانِ منبر ومحراب دین کی صحیح سمجھ بوجھ اور آزادی کا جوش وجذبہ نہ رکھتے ہوں، انقلاب برپا نہ کر سکتے ہوں تو ان کا دین موت ہے یا خواب۔

(ج) دوسرے شعر کا مفہوم لکھیں۔

جواب: اگر منبر ومحراب کا وارث لوگوں کے دلوں میں انقلاب برپا نہیں کر سکتا تو اس کا دین اس کے لیے موت ہے یا پھر خواب۔

(د) نواہائے جگر سوز کا دارومدار کس بات پر ہے؟

جواب: نواہائے جگر سوز کا دارومدار ساز کی عمدگی پر ہے۔

(ہ) قوم میں کس طرح کے درویش نایاب ہیں؟

جواب: قوم میں ایسے درویش نایاب ہیں جن کی دعاؤں کی بدولت لوگوں کے دل بیدار ہو جائیں۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) وادیٔ لولاب سے مراد ہے:

(الف) ملکہ کوہسار مری (ب) وادیٔ نیلم **(ج) وادیٔ کشمیر** (د) وادیٔ زیارت

(ب) وادیٔ لولاب کے چشموں کا پانی ہے:

(الف) زریاب **(ب) سیماب** (ج) کم یاب (د) نایاب

(ج) نواہائے جگر سوز موقوف ہیں:

(الف) ساز پر (ب) ناز پر (ج) راز پر (د) دراز پر

(د) تار ڈھیلے ہوں تو بے کار ہے:

(الف) ساز **(ب) مضراب** (ج) گٹار (د) بگل

(ہ) بے سوز ہے:

(الف) مے خانہ (ب) جم خانہ (ج) مردِ رندانہ (د) فرزانہ

(و) قوم میں مدت سے فغانِ سحری والے نایاب ہیں:

(الف) فقیر **(ب) درویش** (ج) پیر (د) شاعر

۳۔ نظم ''اے وادیٔ لولاب!'' کے چوتھے بند کی روشنی میں درج ذیل شعر پر باہمی گفت گو کریں اور مشترک رائے قلم بند کریں۔

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

جواب: صوفی اور مُلا پر طنز کرتے ہوئے اقبالؒ کہتے ہیں کہ علمیت اور تصوف کا دعویٰ کرنے والوں کا دامن ابھی چاک نہیں ہوا اس لیے انھیں میرے جنون کی خبر تک نہیں۔ سرِ دامن کے چاک کا کنایہ خالص روحانی اور مذہبی ہونے کا اشارہ ہے۔ جب کہ صوفی اور ملا دعویٰ تو بہت کرتے ہیں لیکن ان کی حالت دیوانوں والی نہیں۔ صوفی اور مُلا کو علامت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اقبال صوفی اور مُلا کے ان دعووں پر چوٹ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صوفی اور ملا ذاتِ الٰہی کے عرفان سے یکسر محروم ہو چکے ہیں عصرِ حاضر کے مسائل وہ کیا سمجھیں گے صوفی اور ملا تو ابھی تک میرے جنون سے آگاہ نہیں ہیں۔ مادّی دنیا کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں وہ دن رات لگے ہوئے ہیں اُمت مسلمہ کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے وہ مزید الجھا دیتے ہیں۔

۴۔ اقبالؒ کے کلام میں مئے لالہ فام، مئے ناب اور بادۂ ناب وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً:

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں ان تراکیب کی وضاحت کریں:

مرغانِ سحر، صاحبِ ہنگامہ، بندۂ مومن، نورِ فراست، فغانِ سحری

جواب:

تراکیب	وضاحت
مرغانِ سحر	صبح کے پرندے
صاحبِ ہنگامہ	انقلاب برپا کرنے والا
بندۂ مومن	خدا پر کامل ایمان والا
نورِ فراست	بصیرت والا شخص
فغانِ سحری	صبح کی دعا

۵۔ نظم اے وادیِ لولاب! کا اصل عنوان ''ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض'' ہے۔ اقبالؒ نے اس جرات مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام اقبالؒ سے کشمیر کے حوالے سے مزید اشعار تلاش کر کے ''اقبال'' اور ''کشمیر'' کے عنوان پر ایک تقریر تیار کریں۔

۶۔ مختلف حوالوں سے شعری محاسن کی روشنی میں تشریح کریں:

؎ پانی تیرے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیِ لولاب

؎ گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیِ لولاب

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

۷۔ نظم ''اے وادیِ لولاب'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے خلاصہ نظم۔

۸۔ نیچے دیے گئے الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

وادیِ لولاب سیماب منبر و محراب موتوف نورِ فراست بے سوز

جواب:

تراکیب	معانی	جملے
وادیِ لولاب	کشمیر کی وادی کا نام	وادیِ لولاب کا حسن جنت نظیر ہے۔
سیماب	پارہ	میرا دل آپ کی جدائی میں سیماب کی مانند تڑپ رہا ہے۔
منبر و محراب	مسجد میں خطبہ و امامت کی جگہ	آج منبر و محراب سے محبت و اتحاد کی بجائے فرقہ واریت پھیلائی جا رہی ہے۔
موقوف	منحصر	دعا کی قبولیت دل کی کیفیت پر موقوف ہے۔
نورِ فراست	بصیرت کی روشنی	مومن نورِ فراست سے دیکھتا ہے۔
بے سوز	جس میں تڑپ نہ ہو	دل اگر بے سوز ہے تو وہ دوسروں کو بیدار نہیں کر سکتا۔

۹۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں ان کی شخصیت کا مرقع پیش کریں۔

۱۰۔ ''اے وادیِ لولاب'' کے اشعار کی روشنی میں مسلمانوں خصوصاً کشمیر اور غزہ کے مسلمانوں کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کریں اور ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

۱۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں آزادیِ کشمیر کے موضوع پر کسی ڈرامے کا اہتمام کریں۔

۲۔ یومِ کشمیر کے موقع پر کشمیر کے حوالے سے کلام اقبالؒ سنانے کے مقابلے میں حصہ لیں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ طلبہ کو نظم ''اے وادیِ لولاب'' کا مکمل تعارف کرائیں۔

۲۔ کشمیر سے علامہ اقبالؒ کی محبت اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کوششوں سے آگاہ کریں۔

۳۔ علامہ اقبال کی ایک معروف نظم ''بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' کے کرداروں کا تعارف کرائیں۔

جواب:

؎ ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دِلّی نہ بخارا

تعارف:

بلوچ ایک قبیلہ ہے جو بلوچستان (پاکستان) ایرانی بلوچستان (ایران) اور عمان میں آباد ہے۔ بلوچ بیابان، دشت، صحرا اور پہاڑوں کے باسی ہیں۔ جہاں آبادی کم اور زمین وسیع ہوتی ہے۔ برصغیر کے شہر، دِلّی، آگرہ، لکھنؤ، لاہور وغیرہ اور وسط ایشیا کے شہر ثمرقند بخارا وغیرہ بلوچ علاقوں سے بالکل مختلف ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی نظم ''بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' اُن کے مجموعہ کلام ''ارمغانِ حجاز'' میں شامل ہے۔ اس نظم میں آپؒ نے ایک خیالی کردار ''بڈھا بلوچ'' تخلیق کیا ہے۔ ''ضیغم لولائی کشمیری کی طرح یہ کردار بھی حقیقی نہیں ہے۔ بڈھے بلوچ کی زبان سے اقبالؒ بلوچ، جو خالصتاً مسلمان قوم ہے کو غیرت کا سبق دیتے ہیں۔

؎ غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اقبالؒ فرد اور جماعت کے تعلق کو بیان کرتے ہیں کہ مسلمان قوم کا ایک ایک فرد ملت اسلام کے نصیب کا نشان ہے۔ اگر اس قوم کا ہر فرد اچھا ہو گا تو مسلمان قوم بھی اچھی ہو گی۔

؎ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

آخر میں اقبال بڈھے بلوچ کے الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں کہ اے میرے بیٹے! اگر تم اپنے بزرگوں کی روایات اپنا لو گے تو سرفرازی تمھاری قسمت بن سکتی ہے۔

؎ اِخلاص عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

اصل میں اقبال مسلمان قوم سے مخاطب ہیں کہ اے عہد حاضر کے مسلمان! اپنے بزرگوں سے اخلاصِ عمل مانگ لے۔ کیوں کہ ان کا ہر عمل صرف اللہ کی رضا کے لیے ہوتا تھا۔ اگر اُن کی طرح تو اپنے عمل کو خالص کر لے تو کیا عجب ہے کہ بادشاہ بھکاری کو نواز دے اور سُرخ رُو کر دے۔

شاعر
اختر شیرانی
(1905-1948)

سبق:۱۴ اودیس سے آنے والے بتا

شاعرہ کا تعارف

شاعرِ رومان اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خان اور تخلص اختر ہے۔ آپ نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے۔ ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے اپنے والدِ گرامی کے پاس لاہور چلے آئے۔ جہاں ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج سے منشی فاضل اور اس سے اگلے سال ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے البتہ انگریزی زبان وادب کا مطالعہ نجی اور ذاتی حیثیت سے جاری رکھا اور مضمون نگاری و شعر و شاعری کا آغاز کر دیا اور ان کا کلام مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا۔

بعض رسائل میں بطور مدیر بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۸ء میں ماہ نامہ ''بہارستان'' نکالا جو چل نہ سکا۔ ۱۹۳۰ء میں ''خیالستان'' جاری کیا۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چلا۔ ۱۹۳۵ء میں ماہ نامہ ''رومان'' کا بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اسی اثنا میں اختر کی شاعری کی دھوم مچ گئی اور ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شعرا میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن ٹونک چلے آئے۔ چناں چہ اختر شیرانی کو بھی ٹونک جانا پڑا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں وہ پھر لاہور لوٹ آئے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنے رسالے ''شاہکار'' کی ادارت ان کے سپرد کر دی لیکن اختر تھوڑے ہی عرصہ بعد ''شاہکار'' سے الگ ہو گئے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے شعری مجموعے ''نغمۂ حرم''، ''شعرستان''، ''لالہ طور''، ''صبحِ بہار''، ''اخترستان''، اور ''طیورِ آوارہ'' کے نام سے شائع کیے۔ انھوں نے چند ڈرامے بھی لکھے جن میں ''ضحاک'' زیادہ مشہور ہے۔

اختر شیرانی کی بہت سی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ قدرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے شعور کا سماجی اور سیاسی پس منظر دوسرے بہت سے شعرا سے مختلف ہے۔ اس لیے ان کے محرکاتِ شاعری اور تخیل کے اجزائے ترکیبی دوسروں سے جدا ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسن و شباب، سرخوشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کے گیتوں میں رس ہے، ان کی نظموں میں مخصوص نغماتی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس میں ڈوب کر محبت کے گیت گانے لگتے ہیں۔ شاملِ نصاب نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' اسی نوعیت کی حامل نظم ہے۔

نظم کا خلاصہ

اے دیس سے آنے والے مجھے بتاؤ کہ میرے ہم وطن دوست کس حال میں ہیں؟ میرا وطن کیسا ہے؟ میرے وطن کے باغات اور وہاں کی ہوائیں کیسی ہیں؟ کیا وہاں پہاڑوں پر اب بھی گھٹائیں چھاتی ہیں اور برسات دلوں کو لبھاتی ہے۔ وطن کے وہ تمام قدرتی مناظر، چاند ستارے اور ہمارے بچپن کے کھیل، کیا وہ سب اب بھی ویسے ہی ہیں؟ کیا اب بھی دوست احباب شام کو دریا کنارے جاتے ہیں۔ وہاں اب بھی گھنے درخت ہیں؟ اور چاند پانی میں جھانکتا دکھائی دیتا ہے؟ کیا اب بھی وطن میں کسی کے دل میں ہماری محبت باقی ہے اور کوئی ہمیں یاد کرتا ہے؟ اے دیس سے آنے والے خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔

مرکزی خیال

وطن کی محبت فطری جذبہ ہے۔ پردیس میں وطن کی ایک ایک چیز یاد آتی ہے۔ دوست احباب، باغات، پھول پودے، بہار، برسات، قدرتی مناظر اور کھیل غرض ہر چیز انسان کو یاد آتی ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

او دیس سے آنے والے بتا!
اودیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن ریحانِ وطن
اودیس سے آنے والے بتا!

حل لغت

دیس (وطن) یارانِ وطن (وطن کے دوست) آوارۂ غربت (پردیس میں رہنے والا) کس رنگ میں ہیں (کس حال میں ہیں) کنعان (فلسطین کے علاقے کا نام جو حضرت یعقوبؑ اور یوسفؑ کا وطن تھا) باغِ وطن (وطن کا باغ) فردوسِ وطن (وطن کی جنت) سرو (ایک مخروطی شکل کے درخت کا نام) ریحان (خوش بو)

مفہوم

اے دیس سے آنے والے مجھ پردیسی کو بتاؤ کہ میرے ہم وطن دوست کس حال میں ہیں، میرا وطن کیسا ہے، وطن کے باغات درخت اور ہوائیں کیسی ہیں؟

تشریح

اختر شیرانی رومانوی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسن و شباب، سرخوشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کی نظموں میں مخصوص نغماتی فضا ہے۔ موسیقیت اور غنائیت ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

تشریح طلب بند ایک پردیسی شخص کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ پردیس میں کسی ہم وطن مسافر کو دیکھ کر شاعر کے دل میں بے ساختہ اپنے وطن کی محبت جاگ اٹھتی ہے اور اسے اپنا وطن یاد آنے لگتا ہے۔ وطن کی گلیاں، وادیاں، باغات، ہوائیں اور سب سے بڑھ کر وطن میں موجود دوست احباب یاد آنے لگتے ہیں۔ چناں چہ شاعر بند کے پہلے مصرع میں کہتا ہے کہ اے میرے دیس سے آنے والے مسافر مجھے میرے دیس کی باتیں بتاؤ تا کہ میرے بے قرار دل کو چین آئے۔ مجھے بتاؤ کیا اب بھی میرا وطن ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ مجھے بتاؤ کہ میرے دوست احباب کیسے ہیں؟ اور کس حال میں ہیں؟ وہ مجھے اب بھی یاد کرتے ہیں یا مجھے بھول گئے ہیں۔ بقول شاعر:

؎ وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے، وہ شہر ہمارا کیسا ہے سب دوست ہمیں پیارے ہیں مگر وہ جان سے پیارا کیسا ہے
(احمد فراز)

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے مجھ غریب الوطن پردیسی کو بھی بتاؤ کہ میرے وطن کی حالت کیسی ہے۔ میں وطن سے دور وطن کی جدائی میں پردیس میں سرگرداں ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرا کنعان کیسا ہے؟ شاعر نے یہاں ''کنعانِ وطن'' کی ترکیب بطور تلمیح استعمال کی ہے۔ کنعان فلسطین کے ایک علاقے کا نام ہے جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام رہا کرتے تھے۔ جب یوسف علیہ السلام اپنے وطن کنعان سے جدا ہو کر مصر میں رہنے پر مجبور ہو گئے تو وہ بے قراری میں کنعان کی جانب سے آنے والے مسافروں کی راہ تکتے تھے اور ہم وطن مسافروں سے اپنے کنعان کے حالات پوچھا کرتے تھے۔ شاعر کہتے ہیں کہ

میرا کنعان (جنم بھومی) بھی مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ مجھے بتاؤ میرے کنعان کے کیا حالات ہیں؟ بند کے تیسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ میرے وطن کے باغات کیسے ہیں؟ کیا وہاں کے باغوں کی ہریالی اور شادابی اب بھی اسی طرح قائم ہے؟ میرے وطن کی جنت نظیر وادیاں کیا اب بھی ویسی ہی سرسبز و شاداب ہیں؟ کیا اب بھی وہ جنت کا منظر پیش کرتی ہیں؟ کیا وہاں اب بھی ویسے ہی سرو کے بلند و بالا درخت لہلہاتے ہیں؟ کیا اب بھی وطن کی ہواؤں میں خوش بُوئیں رچی بسی ہیں؟ کیا اب بھی ان ہواؤں میں وہ سرور ہے جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ کیا اب بھی وطن کی ہوائیں ویسے ہی نغمے سناتی ہیں۔ اے میرے دیس سے آنے والے مسافر! مجھے میرے دیس کے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ بقول شاعر:

شب بزمِ حریفاں سجتی ہے، یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں — یاروں کی بسر اوقات ہے کیا، ہر انجمن آرا کیسا ہے
وہ پاس نہیں، احساس تو ہے، اِک یاد تو ہے، اِک آس تو ہے — دریائے جدائی میں دیکھو، تنکے کا سہارا کیسا ہے

(احمد فراز)

بلاشبہ وطن سے محبت انسان کا فطری جذبہ ہے۔ وطن کی ہر چیز اسے عزیز ہوتی ہے۔ اپنا وطن جنت کی مانند لگتا ہے۔ وطن کے کانٹے بھی سنبل و ریحان سے بڑھ کر لگتے ہیں۔ جیسا کہ شیخ سعدی کہتے ہیں:

حبِ وطن از ملکِ سلیمان خوش تر — خارِ وطن از سنبل و ریحان خوش تر

اس بند میں شاعر نے کنعانِ وطن کی تلمیح استعمال کی ہے۔ جس سے شعر کی معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ''باغِ وطن، فردوسِ وطن، سروِ وطن اور ریحانِ وطن'' کے الفاظ کی تکرار سے اس شعر کا صوتی حسن نکھر جاتا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال ہے۔ بند کے آغاز اور اختتام پر ٹیپ کا مصرع ''او دیس سے آنے والے بتا'' ایک خاص روانی اور موسیقیت پیدا کرتا ہے۔

شعر نمبر 2

کیا اب بھی وہاں باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

حلِ لغت

مستانہ (دیوانوں کی مانند) پربت (پہاڑ) گھنگور گھٹائیں (گہرے سیاہ بادل) برکھائیں (برسات) دل کو بھانا (دل کو اچھا لگنا)

مفہوم

اے دیس سے آنے والے مجھے بتاؤ کہ میرے وطن کے باغات میں کیا اب بھی مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟ پہاڑوں پر گہرے بادل چھاتے ہیں؟ کیا برسات اب بھی جی لبھاتی ہے؟

تشریح

اختر شیرانی رومانوی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسن و شباب، سرخوشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کی نظموں میں مخصوص نغماتی فضا ہے۔ موسیقیت اور غنائیت ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

تشریح طلب بند کے پہلے مصرع میں شاعر وطن کے قدرتی مناظر کو یاد کرتا ہے اور اپنے وطن سے آنے والے مسافروں سے وطن کے قدرتی مناظر کے بارے میں دریافت کرتا ہے کہ کیا اب وہ ویسے ہی ہیں یا تبدیل ہو گئے ہیں۔ شاعر پوچھتا ہے کہ مجھے

بتاؤ کیا میرے وطن کے باغات میں اب بھی پہلے کی طرح مستانہ ہوائیں چلتی ہیں۔ کیا اب بھی ہوائیں خوش بوؤں سے مہکتی ہیں۔ کیا اب بھی وہ مستی بھری ہوائیں لہراتی ہیں جو دل کی دنیا کو شاداب اور مسرور کر دیتی تھیں۔

دوسرے مصرع میں شاعر مزید پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی میرے وطن کے بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر گہرے بادل چھائے رہتے ہیں اور پہاڑوں کی چوٹیاں گھٹاؤں میں گھری رہتی ہیں؟ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جب وطن میں ہوتا تھا تو وہاں بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر وہ گھنے بادلوں اور گھٹاؤں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ منظر شاعر کے دل کو بھاتا تھا۔ اب وطن سے دور ہونے کی بنا پر شاعر کو وہی خوب صورت مناظر رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ چناں چہ وہ وطن سے آنے والے مسافر سے پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی وہاں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں یا وہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔

تیسرے مصرع میں شاعر مزید پوچھتا ہے کیا اب بھی میرے وطن میں برسات ہوتی ہے؟ کیا اب بھی میرے وطن کی برسات اہلِ وطن کے دل کو بھاتی ہے اور اپنی بہاریں دکھاتی ہے۔ کیا اب بھی وہ یوں ہی دلوں کو بہلاتی ہے۔ شاعر کے سوالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جب اپنے وطن میں تھا تو وہاں برسات کی بہار سے بھرپور لطف اُٹھاتا تھا۔ اب جب کہ شاعر وطن سے دور ہے تو اسے وہ برسات، وہ بہاریں اور ان سب سے وہ لطف اندوز ہونا یاد آتا ہے۔ چناں چہ وہ آنے والے مسافر سے پوچھتا ہے کہ کیا اب وہاں پہلے کی طرح بارشیں ہوتی ہیں۔ جس سے لوگوں کے دل سرشار ہو جاتے تھے۔ کیا اب بھی میرے وطن کی شادابی قائم ہے؟ کیا اب بھی وہاں رنگ برنگے پھولوں کی بہار ہوتی ہے یا اب سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ ایک اور بند میں اختر شیرانی کہتے ہیں:

کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں — گھنگھور گھٹائیں گونجتی ہیں
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں — برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں
جھینگر کے ترانے گونجتے ہیں — موروں کی صدائیں گونجتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا! — او دیس سے آنے والے بتا!

یہ بند سادگی، سلاست اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی سے وطن کے قدرتی مناظر کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔ ''مستانہ ہوائیں'' اور ''گھنگھور گھٹائیں'' کے الفاظ ذوقافیتین ہیں۔ بند کے اشعار وطن کی یادوں سے متعلق ہیں لیکن یہ اشعار رومانیت سے بھرپور ہیں۔

شعر نمبر 3

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

حلِ لغت

سرمست (سرشار، کیف و وجد کے عالم میں) سہانی (خوب صورت)

مفہوم

وطن میں کیا اب بھی سرمست مناظر ہوتے ہیں، وہاں راتوں کو چاند ستارے ہوتے ہیں اور ہم جو کھیل کھیلتے تھے کیا وہ تمام کھیل اب بھی کھیلے جاتے ہیں۔

تشریح

اختر شیرانی رومانوی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے

اپنے تخیل سے حسنِ مطلوب، خوش نما وادی اور اس وادی کی ایک ایک چیز کو تخلیق کیا ہے۔ ان کی نظموں میں تصوراتی دنیا نظر آتی ہے۔ موسیقیت اور لطافت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔

تشریح طلب بند میں شاعر ایک پردیسی کی حیثیت سے وطن کے قدرتی مناظر کو یاد کرتا ہے جو اسے اپنے وطن سے آنے والے مسافر سے ملنے پر یاد آتے ہیں۔ وہ اس سے قدرتی مناظر کے بارے میں دریافت کرتا ہے کہ کیا اب بھی وہاں پہلے جیسی خوب صورتی اور دل کشی ہے جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ پہلے مصرعے میں شاعر پوچھتا ہے کہ شفق کے سایوں میں کیا اب بھی دن رات کے دامن ویسے ہی ملتے ہیں جیسے پہلے ملا کرتے تھے۔ وہ منظر بڑا دل کش ہوتا تھا اور اس کی موجودگی میں سماں بہت خوب صورت ہو جاتا تھا۔ کیا اب بھی وہی منظر ہوتا ہے۔

دوسرے مصرعے میں شاعر وطن کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں۔ جن کی خوش بو سے چمن مہک اٹھتا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی تھی۔ شاعر کہتا ہے کہ کیا اب بھی وہاں کے لوگ ان شگوفوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں؟ تیسرے مصرعے میں شاعر اپنے وطن کی یاد کرتا ہے اور اپنے دوستوں کے ہمراہ جو کھیل کھیلا کرتا تھا ان کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کیا اب بھی میرے وطن میں ویسے ہی کھیل کھیلے جاتے ہیں جیسے ہم بچپن میں کھیلا کرتے تھے یا اب وہاں کھیل تبدیل ہو گئے ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ لوگوں میں کھیلوں سے دل چسپی ختم ہو گئی ہو؟ کھیلوں کے میدان ختم کر دیے گئے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے حالات اور مناظر تبدیل ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ لوگوں کے رویے اور ان کی دل چسپیاں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ یہی شاعر دریافت کرنا چاہتا ہے کہ کیا صرف میرے ہی دل میں ان سب کی چاہت ہے یا پھر وہاں وطن کے لوگوں میں بھی ابھی تک ان کی محبت باقی ہے۔ بقول شاعر:

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے، وہ شہر ہمارا کیسا ہے	سب دوست گئے بھلا رہے ہیں کہ وہ جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزمِ حریفاں سجتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں	یاروں کی بسر اوقات ہے کیا، ہر انجمن آرا کیسا ہے
وہ پہلی سی احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے	دریائے جدائی میں دیکھو، تنکے کا سہارا کیسا ہے

(احمد فراز)

شاعر کو اپنے وطن کی ایک ایک چیز رہ رہ کر یاد آتی ہے۔ اسی لیے وہ آنے والے مسافر سے ہر چیز کے بارے میں سوال کرتا ہے۔ سوالات کے پس پردہ شاعر کی وطن سے محبت اور اس کی جدائی میں بے قراری نظر آتی ہے۔ وہ وطن کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ اگرچہ وطن کی ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی لیکن شاعر کی محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ وطن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے۔ بقول شاعر:

یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں، یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں	میرے بد قسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے

(احمد فراز)

یہ بند سادگی، سلاست اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔ لفظ "کھیل" اور "کھیلا" صنعتِ اشتقاق کا خوب صورت استعمال ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی سے وطن کے قدرتی مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ بند کے اشعار وطن کی یادوں سے متعلق ہیں لیکن حسن اور رومانویت سے بھرپور ہیں۔

بند نمبر 4

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب، کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب، کنارِ دریا پر
اور پیار سے آ کر جھانکتا ہے مہتاب، کنارِ دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا!

حلِ لغت

احباب: دوست۔ کنارِ دریا: دریا کے کنارے۔ پیڑ: پودے۔ گھنیرے: گھنے۔ شاداب: سرسبز، تر و تازہ۔ مہتاب: چاند

مفہوم

اے دیس سے آنے والے بتا کیا اب بھی شام کے وقت دوست دریا کے کنارے جاتے ہیں؟ کیا دریا کے کنارے گھنے درخت اب بھی شاداب ہیں؟ کیا اب بھی وہاں چاند جھانکتا ہے؟

تشریح

اختر شیرانی رومانوی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور حسنِ فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسنِ مطلوب، خوش نما وادی اور اس وادی کی ایک ایک چیز کو تخلیق کیا ہے۔ ان کی نظموں میں تصوراتی دنیا نظر آتی ہے۔ موسیقیت اور لطافت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔

تشریح طلب بند میں شاعر اپنے وطن اور وطن کے خوب صورت مناظر کو یاد کرتا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر وطن سے آنے والے مسافر سے سوال کرتا ہے کہ اے دیس سے آنے والے مسافر بتا کیا اب بھی میرے وطن میں دوست احباب شام کے وقت دریا کے کنارے سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ وہاں کی تازہ ہوا اور پانی کے خوب صورت منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دریا کے کنارے پر گھنے درخت جو اس وقت وطن کے راستے میں ہم دیکھا کرتے تھے کیا اب بھی ویسے ہی سرسبز، شاداب اور سایہ دار ہیں؟ شاعر کے سوالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جب وطن میں موجود تھا تو شام اپنے دوستوں کے ہمراہ دریا کے کنارے سیر و تفریح کے لیے جایا کرتا تھا۔ وہاں کے پانیوں، درختوں اور ہریالی سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ اب شاعر وطن سے دور ہے اس لیے شاعر کو وہی مناظر اور دوست احباب یاد آتے ہیں؟ چنانچہ شاعر اپنے بے قرار دل کو تسلی دینے کے لیے پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی وطن میں میرے دوست احباب اسی طرح دریا کے کنارے سیر پر جاتے ہیں اور وہاں کے قدرتی مناظر اب بھی ویسے ہی ہیں؟ یا سب کچھ تبدیل ہو گیا ہے؟ بقول شاعر:

کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں، گھنگرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں، اب وقت کا دھارا کیسا ہے؟ (احمد فراز)

بند کے تیسرے مصرعے میں شاعر یہ پوچھتا ہے کہ کیا اب بھی وہاں خوش بوئیں مہکتی ہیں۔ کیا اب بھی رات کے وقت چاند نکلتا ہے اور اس کا عکس پانی میں نظر آتا ہے۔ کیا اب پانی پر چاند کا عکس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خوب صورت چہرہ جھانک رہا ہو۔ وہ منظر نہایت دل فریب ہوا کرتا تھا۔ کیا اب بھی چاندنی راتوں میں وہاں ویسا ہی خوش نما منظر ہوتا ہے۔ شاعر کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جب وطن میں موجود تھا تو رات کے وقت پانی میں چاند کے عکس کو دیکھا کرتا تھا جو اسے کسی خوب صورت چہرے کی مانند لگتا تھا جو پانی میں جھانک رہا ہوتا تھا۔ شاعر اس منظر کو یاد کرتے ہوئے پوچھتا ہے کہ کیا اب وہاں چاند ایسے ہی پانی میں جھانکتا دکھائی دیتا ہے؟ ایک اور بند میں اختر شیرانی کہتے ہیں:

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں	دن رات کے دامن ملتے ہیں
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی	خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں
برساتی ہوا کی لہروں سے	بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!	او دیس سے آنے والے بتا!

یہ بند سادگی، سلاست اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی سے وطن کے قدرتی مناظر کی تصویر کشی کی ہے۔ بند کے اشعار وطن کی یادوں سے متعلق ہیں لیکن ان میں رومانیت بسی ہوئی ہے۔

شعر نمبر 5

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ، بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ، بتا
او دیس سے آنے والے بتا، للہ بتا، للہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا!

حل لغت

چاہ (چاہت، محبت) یاروں (دوستوں) آہ (گہری سانس لینے یا کراہنے کی آواز) للہ (خدا کے لیے)

مفہوم

کیا اب بھی کوئی ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمارے دوست کیا اب بھی ہمیں یاد کرتے ہیں۔ اے دیس سے آنے والے خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ۔

تشریح

اختر شیرانی رومانوی شاعر ہیں۔ ان کی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ فطرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسن و شباب، سرخوشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کی نظموں میں مخصوص نغماتی فضا ہے۔ موسیقیت اور غنائیت ان کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔

تشریح طلب بند میں شاعر اپنے وطن اور اہلِ وطن کو یاد کرتا ہے۔ پہلے شعر میں شاعر وطن سے آنے والے مسافر سے پوچھتا ہے کہ میرے دیس سے آنے والے مجھے بتاؤ کیا میرے ہم وطنوں میں اب بھی کوئی ہے جس کے دل میں میری چاہت اور محبت موجود ہے؟ کیا اب بھی کوئی مجھے یاد رکھے ہوئے ہے یا وہاں سب مجھے بھول چکے ہیں؟ شاعر آہِ سرد کے ساتھ پوچھتا ہے کہ مجھے بتاؤ میرے وہ دوست احباب جن کے ساتھ میں نے بچپن گزارا تھا کیا وہ اب بھی مجھے یاد کرتے ہیں؟ جیسے وہ بچپن میں میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتے تھے کیا اب بھی ان کا میرے بغیر دل نہیں لگتا؟ جیسے میں انھیں یہاں یاد کرتا ہوں اور ان کے لیے بے قرار ہوں کیا وہ بھی وہاں مجھے اسی طرح یاد کرتے ہیں اور میری جدائی میں بے قرار ہوتے ہیں یا وہ مجھے یکسر بھلا چکے ہیں۔ ایک اور بند میں اختر شیرانی کہتے ہیں:

کیا ہم کو وطن کے باغوں کی مستانہ ہوائیں بھول گئیں؟
برکھا کی بہاریں بھول گئیں ساون کی گھٹائیں بھول گئیں؟
دریا کے کنارے بھول گئے جنگل کی ہوائیں بھول گئیں؟
او دیس سے آنے والے بتا! او دیس سے آنے والے بتا!

آخر میں شاعر التجائیہ انداز میں کہتا ہے اے میرے دیس سے آنے والے خدا کے لیے مجھے کچھ بتاؤ۔ اس سے شاعر کی بے قراری اور بے چینی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے وطن اور اہلِ وطن کے بارے میں جاننے کے لیے بہت بے تاب ہے۔

اپنے پیاروں اور دوست احباب کی جدائی انسان کو بے قرار کر دیتی ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ وہ مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ تنہائی اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔ پردیس میں چوں کہ اجنبی لوگ ہوتے ہیں اس لیے کسی بھی انسان کا پردیس میں دل بہت مشکل سے لگتا ہے۔ اپنی مٹی، وطن اور گھر یار سے محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ ایک چھوٹے سے پودے کو بھی

اگر اس کی جگہ سے اکھاڑ کر کسی دوسری جگہ لگا دیا جائے تو وہ بھی کچھ دن کے لیے مرجھا جاتا ہے۔ اس کی تروتازگی ماند پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی جب اپنی مٹی، اپنے وطن اور اپنے گھر یار دوست احباب سے جدا ہو کر پردیس میں جاتا ہے تو اس کا وہاں دل نہیں لگتا۔ اسے اپنے وطن کی یاد ستانے لگتی ہے۔ اسے اپنا گھر اور اپنے دوست احباب یاد آنے لگتے ہیں۔ چناں چہ شاعر بھی اپنے وطن اور دوست احباب کی جدائی میں اداس ہے اور ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہے۔ بقول شاعر:

قاصد کے لبوں پر کیا اب بھی آتا ہے ہمارا نام کبھی — وہ بھی تو خبر رکھتا ہوگا یہ جھگڑا سارا کیسا ہے
اے دیس سے آنے والے مگر تم نے تو نہ اتنا بھی پوچھا — وہ کوئی جسے بن باس ملا، وہ درد کا مارا کیسا ہے

(احمد فراز)

یہ بند سادگی، سلاست اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔ ''للہ بتا، للہ بتا'' کی التجائیہ تکرار شعر کے حسن کو بڑھاتی ہے۔ اسی طرح ٹیپ کا مصرع ''او دیس سے آنے والے بتا'' کی تکرار بھی صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ اس سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ بند کے اشعار وطن کی یادوں سے متعلق ہیں لیکن ان میں رومانیت بسی ہوئی ہے۔

مشقی سوالات

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر اس نظم میں کس سے مخاطب ہے؟
جواب: شاعر اس نظم میں اپنے وطن سے آنے والے نو وارد مسافر سے مخاطب ہے۔

(ب) شاعر کو کس کی یاد ستا رہی ہے؟
جواب: شاعر کو اپنے وطن کی یاد ستا رہی ہے۔ اسے اپنے دوست احباب، وطن کی گلیاں اور باغات یاد آتے ہیں۔

(ج) شاعر نے خود کو آوارۂ غربت کیوں کہا؟
جواب: شاعر وطن سے دور پردیس میں بھٹک رہا ہے اس لیے شاعر نے خود کو آوارۂ غربت کہا ہے۔

(د) وطن کی ہوائیں اور گھٹائیں کیسی ہیں؟
جواب: وطن کی ہوائیں مستانہ ہیں اور وطن کی گھٹائیں گھنگھور ہیں۔

(ہ) سرمست نظاروں سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
جواب: سرمست نظاروں سے مراد وہ قدرتی مناظر جنھیں دیکھ کر انسان پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور اس کی روح سرشار ہو جاتی ہے۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) نظم ''او دیس سے آنے والے بتا!'' کے شاعر ہیں:
(الف) احمد ندیم قاسمی (ب) اختر شیرانی (ج) ابن انشا (د) جمیل الدین عالی

(ب) شاعر کو کہاں کی یاد ستا رہی ہے؟
(الف) باغ کی (ب) سمندر کی (ج) وطن کی (د) صحرا کی

(ج) ''کنعانِ وطن'' اردو قواعد کی رو سے ہے؟
(الف) تشبیہ (ب) استعارہ (ج) تلمیح (د) کنایہ

(د) ''یارانِ وطن'' اردو قواعد کی رو سے ہے:
(الف) مرکب عطفی (ب) مرکب اضافی (ج) مرکب توصیفی (د) مرکب عددی

(و) وطن کے باغوں میں ہوائیں چلتی ہیں:
(الف) خنک (ب) مستانہ وار (ج) مخمور (د) تیز تیز

(ہ) دریا میں پیار سے جھانکتا ہے:

(الف) حباب (ب) شباب (ج) مہتاب (د) آفتاب

(و) وطن کے پیڑ ہیں:

(الف) گھنیرے (ب) پھل دار (ج) سرسبز (د) سایہ دار

۳۔ نظم ''اودیس سے آنے والے بتا!'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے خلاصہ نظم۔

۴۔ نظم ''اودیس سے آنے والے بتا!'' کے پہلے بند میں استعمال ہونے والی تلمیح کی روشنی میں بند کی تشریح کریں اور مرزا غالب و مولانا حالی کے درج ذیل اشعار کو بھی شامل کریں۔

نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے
(مرزا غالب)

آرہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
(مولانا الطاف حسین حالی)

جواب: دیکھیے تشریحات۔

۵۔ اپنے ہم وطن کو دیکھ کر شاعر کے دل میں کیا کیا جذبے بیدار ہوتے ہیں اور وہ کیا جاننا چاہتا ہے؟ نظم ''اودیس سے آنے والے بتا!'' کی روشنی میں بیان کریں۔

جواب: اپنے وطن کو دیکھ کر شاعر کے دل میں وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ وطن کے بارے میں پوچھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے دوست احباب کے بارے میں پوچھتا ہے۔ وطن کی ہواؤں، گھٹاؤں، پہاڑوں، برسات، کھیلوں، چاند ستاروں اور دیگر قدرتی مناظر کے بارے میں پوچھتا ہے۔ آخر میں وہ پوچھتا ہے کہ کیا وطن میں اب بھی کسی کے دل میں ہماری محبت باقی ہے اور ہمارے دوست کیا اب بھی ہمیں یاد کرتے ہیں۔

۶۔ کیا نظم ''اودیس سے آنے والے بتا!'' کے آخری بند میں شاعر کی خواہشوں کا رخ تبدیل ہوا ہے؟ وضاحت کریں۔

جواب: آخری بند میں شاعر وطن کے قدرتی مناظر سے نکل کر اپنی ذات کے بارے میں سوال کرنے لگتا ہے۔ شاعر پوچھتا ہے کہ کیا اب وطن میں کسی کے دل میں ہماری چاہت موجود ہے۔ ہمارے دوست احباب کیا اب بھی ہمیں یاد کرتے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے کچھ تو بتاؤ۔

مرکب ناقص، مرکب اضافی، مرکب توصیفی اور مرکب عطفی:

مرکب ناقص: دو الفاظ سے مل کر بننے والا ایسا مرکب جو بامعنی تو ہو لیکن اس سے پورا مطلب واضح نہ ہو۔ مثلاً:
تیز گھوڑا، نیک آدمی، رات اور دن وغیرہ۔

مرکب اضافی: جب دو لفظ حرفِ اضافت، زیرِ اضافت یا ہمزہ اضافت سے مل کر مرکب بنائیں تو اسے مرکب اضافی کہتے ہیں۔ مثلاً:
شامِ غریباں، دوستوں کی محفل، نورِ حق، حلقۂ زنجیر وغیرہ۔

مرکب توصیفی: صفت اور موصوف سے مل کر بننے والے مرکب ناقص کو مرکب توصیفی کہتے ہیں۔ مثلاً: روشن چاند، خوب صورت پھول، سفید پتھر وغیرہ۔

مرکب عطفی:

حرف عطف ''اور''، ''و'' سے مل کر بننے والے مرکب ناقص کو مرکب عطفی کہتے ہیں۔ مثلاً: صبح و شام، حق و باطل، چاند اور سورج وغیرہ۔

نظم ''اودیس سے آنے والے بتا'' میں استعمال ہونے والے ان چاروں مرکبات کی فہرست بنائیں، ان کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

مرکب اضافی	معنی	جملے
یارانِ وطن	وطن کے دوست، ہم وطن	یارانِ وطن دوسرے ملکوں کو ہجرت کر گئے اور ہم اکیلے رہ گئے۔
باغِ وطن	وطن کا باغ یا سرزمین	دوست چلے گئے اور باغِ وطن اجڑ گیا۔
آوارۂ غربت	پردیس کا مارا ہوا	آوارۂ غربت ہر شام وطن کی یاد میں تڑپتا ہے۔
سروِ وطن	وطن کا سرو	سروِ وطن اب خزاں کی زد میں ہے۔
کنعانِ وطن	وطن کا کنعان، پیارا وطن	پردیسی کنعانِ وطن کی یاد میں پریشان ہے۔
کنارِ دریا	دریا کے کنارے	لوگ کنارِ دریا، کشتی کے انتظار میں تھے۔
مرکب عطفی	**معنی**	**جملے**
چاند ستارے	چاند اور ستارے	چاند ستارے آسمان کی زینت ہیں۔
مرکب توصیفی	**معنی**	**جملے**
مستانہ ہوائیں	خوش گوار ہوائیں	پھولوں کی خوش بو لیے مستانہ ہوائیں آرہی ہیں۔
گھنگور گھٹائیں	گہرے سیاہ بادل	آسمان پر گھنگور گھٹائیں چھا گئی ہیں۔
سرمست نظارے	مستی بھرا منظر	لوگ غروبِ آفتاب کے سرمست نظارے سے محظوظ ہو رہے تھے۔
سہانی راتوں / راتیں	خوب صورت راتوں	سہانی راتوں میں چاندنی خاص لطف دیتی ہے۔
پیڑ گھنیرے / گھنیرے پیڑ	گھنے درخت	ندی کے کنارے گھنیرے پیڑ کھڑے ہیں۔

نوٹ: یہ تمام مرکب ناقص ہیں، مرکب اضافی، مرکب عطفی اور مرکب توصیفی دراصل مرکب ناقص کی اقسام ہیں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ کے مترادفات تلاش کریں:

وطن غربت فردوس گھنگھور یار سہانی احباب مہتاب

جواب:

الفاظ	مترادف	الفاظ	مترادف	الفاظ	مترادف
وطن	ملک	غربت	پردیس، مفلسی	فردوس	جنت
گھنگھور	گھنی	سہانی	خوب صورت	احباب	دوست
مہتاب	چاند				

شاعر
احسان دانش
(1914-1982)

سبق:۱۵ آزادی

شاعر کا تعارف

نام احسان الحق اور تخلص بھی احسان ہی تھا۔ کبھی وہ اپنے والد قاضی دانش علی کی نسبت سے اپنا پورا نام احسان بن دانش لکھتے تھے۔ پھر احسان دانش لکھنے لگے جو بعد میں اضافت کی زیر کو حذف کر کے احسان دانش کی صورت اختیار کر گیا اور کبھی کبھی اپنا تخلص دانش بھی کرنے لگے۔

ان کا آبائی وطن باغ پت ضلع میرٹھ ہے لیکن احسان دانش کی ولادت، پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کے قصبے کاندھلہ ضلع مظفر آباد (ہندوستان) میں ہوئی۔ گھریلو مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہ پا سکے اور وقتاً فوقتاً معمولی نوعیت کے کام کرنے لگے جن میں مزدوری کے علاوہ باغبانی اور قلی تک کے کام بھی شامل تھے۔ احسان دانش نے کسی زمانے میں انارکلی بازار لاہور کی بغلی سڑک ایبک روڈ پر ''مکتبہ دانش'' بھی قائم کیا تھا۔ جہاں وہ مخطوطات (کتابوں کے پرانے نسخے) کا کاروبار کرتے تھے۔

احسان کو شاعری سے لگاؤ چھوٹی عمر ہی سے ہو گیا تھا اور وہ قیامِ پاکستان سے بہت پہلے لاہور آ گئے تھے۔ یہاں کے ادبی ماحول نے انھیں بہت جلد محفلوں میں نمایاں کر دیا۔ احسان دانش اردو کے نامور شاعر اور فاضل ادیب علامہ تاجور نجیب آبادی کے تلامذہ میں شامل تھے۔ وہ مشاعروں میں اپنا کلام نہایت دل کش ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ بہت سادہ، فقیر منش، خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے۔

احسان دانش کے کلام میں نظم، غزل، نعت، قطعہ، رباعی، گیت سب کچھ ملتا ہے لیکن ان کی اصل شہرت بیانیہ نظموں کی وجہ سے ہے۔ وہ خود مزدور تھے اور مزدوروں کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا، اس لیے انھیں ''شاعرِ مزدور'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے کئی ایک مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں ''آتشِ سیال''، ''نوائے کارگر''، ''نفیرِ فطرت''، ''جادۂ نو''، ''فصلِ سلاسل''، اور ''چراغاں'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ''دارین'' کے نام سے ان کا نعتیہ کلام بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

احسان دانش نے جو نظمیں محنت مزدوری کے موضوع پر لکھی ہیں، ان میں واقعیت نگاری کا رنگ موجود ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے ایک عظیم نظم نگار تھے۔ ان کی غزل میں بھی تغزل کے سارے اوصاف: دل کشی، دل سوزی، دل ربائی اور دل آویزی موجود ہیں۔

شاعری کے علاوہ وہ ایک نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے نثر میں بھی بعض ضروری موضوعات مثلاً: ضرب الامثال، تذکیر و تانیث اور مترادفات پر کام کیا جو چھپ چکا ہے۔ احسان دانش نے ''جہانِ دانش'' کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھی جو بہت مقبول ہے۔

نظم کا خلاصہ

آزادی کے حصول کا جذبہ عین عبادت ہے۔ قربانیوں کے بغیر آزادی ممکن نہیں۔ جہاں شہریوں کو حق کہنے کی اجازت نہ ہو وہ حقیقی آزادی نہیں۔ یہاں کا ماحول لوگوں میں قربانی اور جدوجہد کا شوق پیدا کر رہا ہے اور ہمارے خون میں آزادی کی تاثیر شعلہ کی مانند دوڑ رہی ہے۔ ظلم و ستم کا حد سے بڑھ جانا ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ خدا نے قرآن کے پردے میں آزادی کے متعلق بیان کر دیا ہے۔ اب قیامت تک دنیا اس کی تفسیر کرتی رہے گی۔ ہم نے آزادی کے لیے بے شمار قربانیاں دیں لیکن ابھی تک حقیقی آزادی سے محروم ہیں۔ مجھے پوری دنیا میں آزادی کی مشعل روشن کرنی ہے۔ میرا مذہب پوری دنیا کے لیے آزادی کا پیغام ہے۔ دنیا کو آزادی کا درست مطلب ہم بتائیں گے۔ آزادی کے متوالے تکلیفیں جھیل کر پاکستان میں تو آ گئے لیکن ابھی تک غلامی کے اندھیروں سے آزادی کی روشنی نہیں پھوٹی۔

مرکزی خیال

آزادی ایسی عبادت ہے جو قربانی کے بغیر مکمل نہیں۔ اظہارِ رائے کی آزادی حقیقی آزادی ہے جس سے ہمیں محروم کیا گیا

ہے۔ شاعر حقیقی آزادی کا متلاشی ہے جسے وقت کے حکمرانوں نے سلب کر لیا ہے۔ بے شمار قربانیوں کے باوجود بھی حقیقی آزادی کے ثمرات ہمیں میسر نہیں آ سکے۔ شاعر آزادی کے نام پر اس دھوکے کی مذمت کرتا ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

عبادت ہے سراپا جذبہ تعمیر آزادی
شہادت مستقل اک سرخیِ تحریر آزادی

حل لغت

سراپا (مکمل طور پر، سراسر) جذبہ تعمیر آزادی (آزادی کی تعمیر کا شوق) شہادت (قربانی، جان قربان کرنا) مستقل (ہمیشہ کے لیے، بنیادی) سرخیِ تحریر آزادی (آزادی کے مضمون کا عنوان، ہیڈنگ)

مفہوم

آزادی کے حصول کا شوق سراسر عبادت ہے، آزادی کے مضمون کا عنوان بنیادی طور پر قربانی ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں ممکن نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ آزادی کے حصول کا جذبہ سراسر عبادت ہے۔ آزادی کی جدوجہد ایک مقدس اور روحانی فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ کوئی بھی دانش مند اپنی آزادی پر سمجھوتہ نہیں کرتا۔ کسی کی آزادی سلب کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ چناں چہ شاعر پہلے مصرع میں کہتا ہے کہ آزادی کے حصول کا شوق اور جذبہ بھی عین عبادت ہے اور نیکی کا کام ہے۔ اس مقصد کے لیے ہر طرح کا جہاد چاہے وہ جان کے ذریعے ہو، زبان کے ذریعے ہو یا قلم کے ذریعے ہو، عین عبادت ہے۔ مشہور عربی مقولہ ہے:

"حب الوطنِ من الایمان"

ترجمہ: وطن سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔

ظالم کے خلاف کلمۂ حق کہنا اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا انسان کی بنیادی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد میں اگر انسان کامیاب ہو جاتا ہے تو کیا کہنا، وہ غازی کہلاتا ہے اور اگر اسے موت بھی آ جائے تو وہ شہادت کے رتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ الغرض دونوں صورتوں میں اس کا جذبہ رائیگاں نہیں جاتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ گر بازیِ عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں
(فیض احمد فیض)

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے شہادت اور قربانی آزادی کے مضمون کا ایک مستقل عنوان ہے۔ آزادی کی عبارت ہمیشہ شہیدوں کے خون سے لکھی جاتی ہے۔ قربانی کے بغیر آزادی کا حصول ممکن نہیں۔ کوئی بھی اعلیٰ مقصد بغیر قربانی، بغیر خون بہائے

اور بغیر جان قربان کیے حاصل نہیں ہوتا۔ کسی بھی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے انسان کو جان، مال اور وقت کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ قربانی سے دوسرے لوگوں کا جذبۂ آزادی بھی بلند ہو جاتا ہے اور وہ بھی آزادی کے حصول کے لیے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ آخر کار شہیدوں کا لہو رنگ لاتا ہے اور قوم ایک دن آزادی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر:

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے — بڑی زرخیز ہوتی ہے بہت شاداب ہوتی ہے

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا — تیرے بیٹے تیرے جاں باز چلے آتے ہیں (ماہر القادری)

شاعر نے آزادی اور شہادت کے لیے بڑی عمدہ تشبیہات استعمال کی ہیں۔ آزادی کے جذبے کو عبادت سے تشبیہ دی ہے اور شہادت کو آزادی کے مضمون کی سرخی قرار دیا ہے۔ تعمیر اور تحریر خوب صورت قافیے ہیں۔ شعر کے دونوں مصرعوں کے ابتدائی الفاظ عبادت اور شہادت شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

شعر نمبر 2

جہاں آزاد کر سکتے نہ ہوں تقریرِ آزادی
وہ آزادی مری نظروں میں ہے تحقیرِ آزادی

حل لغت

تقریرِ آزادی (آزادی کے موضوع پر گفت گو) تحقیرِ آزادی (آزادی کی ذلت، بے قدری، بے حرمتی)

مفہوم

جہاں آزاد لوگ آزادانہ اظہار رائے نہ کر سکتے ہوں، میری نظر میں وہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کی بے حرمتی ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں ممکن نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ کہنے کو تو ہم نے انگریزی اقتدار سے آزادی حاصل کر لی لیکن ابھی تک ہم مکمل طور پر آزاد نہیں ہیں۔

ہمارے مخلص رہنماؤں میں سے کچھ طبعی موت وفات پا گئے کچھ کو قتل کروا دیا گیا۔ اس کے بعد ملک پر ایسے لوگ قابض ہو گئے، جنھوں نے عوام سے ان کی آزادی سلب کر لی، ان کا استحصال کیا اور بنیادی ضروریات سے انھیں محروم کر دیا۔ عوام میں جن لوگوں نے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کی ان کی زبان بند کر دی گئی اور انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ چناں چہ شاعر پہلے مصرع میں کہتا ہے کہ یہاں عوام الناس کو اپنے حق کے لیے تقریر و تحریر کی آزادی نہیں ہے۔ یہاں اظہارِ رائے کی آزادی نہیں بلکہ جو بااثر اشرافیہ چاہتا ہے صرف وہی کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے۔ بقول شاعر:

وہ جو خواب تھے مرے ذہن میں، نہ میں کہہ سکا نہ میں لکھ سکا — کہ زباں ملی تو کٹی ہوئی کہ قلم ملا تو بکا ہوا

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ میری نظر میں اظہارِ رائے پر پابندی بھی آزادی کی تحقیر ہے۔ یہ آزادی کی ناقدری اور بے حرمتی ہے۔ آزاد ملک کے باشندوں کو اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر ہوتی ہے۔ یہ ان کا بنیادی حق ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ دنیا کے تمام انسانوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا مافی الضمیر بیان کر سکیں۔ جسے وہ صحیح سمجھتے ہوں اسے صحیح کہیں اور جسے وہ غلط سمجھتے ہوں اسے غلط کہیں۔ یہ وہ بنیادی حق ہے جسے عالمی برادری نے انسانی عالمی حقوق کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگر ریاست آزادی سے فیصلے کرنے کی طاقت نہیں رکھتی تو وہاں کے عوام بھی غلامی کے حصار میں رہتے ہیں، ایسی آزادی بھی آزادی کی توہین ہے۔ چناں چہ شاعر کے نزدیک ایسی آزادی جس میں اظہارِ رائے پر پابندی ہو، آزادی نہیں، بلکہ آزادی کی توہین ہے۔ آزادی کا مطلب صرف جسمانی غلامی سے نجات نہیں بلکہ ذہنی و فکری طور پر بھی آزادی ہے۔ بقول شاعر:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی — جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

(علامہ اقبال)

شعر میں صنعتِ تکرار بڑی عمدگی سے استعمال ہوئی ہے۔ آزاد اور آزادی کے الفاظ کی تکرار سے شعر کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اور شعر کے قوافی نے شعر میں اثر انگیزی اور تاثیر پیدا کر دی ہے۔

شعر نمبر 3

فضائیں کر رہی ہیں ذوقِ ایثار و عمل پیدا
لہو میں دوڑتا ہے شعلۂ تاثیرِ آزادی

حل لغت

فضا (ہوا، ماحول) ذوق (شوق، جذبہ) ایثار و عمل (قربانی و جدوجہد) لہو (خون) شعلۂ تاثیرِ آزادی (آزادی کے اثر کی حرارت)

مفہوم

یہاں کا ماحول لوگوں میں قربانی اور جدوجہد کا شوق پیدا کر رہا ہے اور ہمارے خون میں آزادی کی تاثیر شعلے کی مانند دوڑ رہی ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں ممکن نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ یہاں کی فضائیں لوگوں میں قربانی اور جدوجہد کا شوق اور جذبہ پیدا کر رہی ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ ظلم و ستم پر زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہر سلیم الفطرت شخص ظلم و ستم پر سراپا احتجاج ضرور ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ جبر کے سلسلے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہو جائیں ایک دن ختم ضرور ہوتے ہیں۔

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے — خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

ہم نے پہلے بھی انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کی تھی۔ اب جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے تسلط سے بھی آزادی حاصل کر لیں گے۔ ہمارے خون میں وہی آزادی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے پہلے بھی ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور اپنی آزادی کے لیے جانیں قربان کی تھیں۔ ہمارے اندر بھی انھی کا خون دوڑتا ہے۔ اس خون میں وہی تاثیر

ہے۔اپنی آزادی کے لیے ویسی ہی تڑپ، بے قراری اور جاں نثاری ہے۔

یہاں کا ماحول لوگوں میں اب قربانی اور ایثار کا جذبہ پیدا کر رہا ہے۔لوگ اپنی حقیقی آزادی کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار ہیں۔اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرنے کا ذوق ان میں بیدار ہو رہا ہے۔یہ سب کچھ اس فضا اور اس ماحول کی بدولت ہے۔ماحول انسان پر اثر ضرور کرتا ہے۔کسی ایک شخص کی قربانی سے باقی قوم میں بھی قربانی اور ایثار کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔اس جذبے کے اثرات اور ثمرات دوسرے لوگوں تک بھی ضرور پہنچتے ہیں۔جب کوئی شخص جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا ہے تو باقی لوگوں میں بھی آہستہ آہستہ یہ جرات پیدا ہو جاتی ہے۔وہ بھی اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے لگتے ہیں۔

مرے ہاتھ میں قلم ہے، مرے ذہن میں اُجالا　　مجھے کیا دبا سکے گا کوئی نفرتوں کا پالا
مجھے فکر امنِ عالم، تجھے اپنی ذات کا غم　　میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا　　(حبیب جالبؔ)

ایک فطری اصول ہے کہ جب کسی جائز چیز کو جبر کے ذریعے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اتنی ہی شدت سے ابھرنے کی کوشش کرتی ہے۔جب لوگوں کی آواز کو دبایا جاتا ہے تو قوم کے اندر اس کے خلاف اتنا ہی شدید ردِعمل پیدا ہو جاتا ہے۔اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا جذبہ اور مرمٹنے کا ذوق اور زیادہ بیدار ہو جاتا ہے۔جیسا کہ ایک شاعر کہتے ہیں:

اسلام کی فطرت کو قدرت نے لچک دی ہے　　اتنا ہی یہ ابھرے گا، جتنا کہ دبا دیں گے

ہر سلیم الفطرت شخص نامناسب بات پر خامی کی نشان دہی کرتا ہے اور غلطی واضح کرتا ہے تاکہ اسے درست کیا جا سکے۔قوم کے اندر اب شعور بیدار ہو گیا ہے۔چناں چہ قوم اب طاقت ور اشرافیہ کی ہر ناجائز پالیسی جو عوام الناس کی حق تلفی پر مبنی ہوتی ہے، پر سراپا احتجاج ہوتی ہے۔کیوں کہ اسے اب اپنے حقوق کا ادراک ہو گیا ہے۔ہر شہری کو حکومت کی ناجائز پالیسوں پر تنقید کا مکمل حق ہے۔چناں چہ ہر شہری اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے اربابِ اختیار کو صحیح اور غلط بتاتا ہے۔اس تقریر اور تحریر میں دراصل آزادی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔یہ آزادی کے حصول کی جانب پہلا قدم ہے۔

مجھے ہر نامناسب بات پر تنقید کا حق ہے　　مری تقریر سے تعبیر ہے تعمیرِ آزادی

آزادی کی اہم شرط یہی ہے کہ ہر فرد کو کسی بھی نامناسب بات پر تنقید کرنے کا حق حاصل ہو۔اگر یہ حق حاصل نہیں تو معاشرہ آزاد نہیں کہلا سکتا اور اس کی اصلاح بھی نہیں ہو سکتی۔تنقید کسی بھی غلط یا نامناسب کام کو روکنے کا پہلا قدم ہے۔تنقید سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور کسی بھی غلط کام کو روکا جا سکتا ہے۔معاشرہ اصلاح اور بہتری کی جانب بڑھتا ہے۔جس ملک میں ہر فرد کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہوتا ہے وہی ملک صحیح معنوں میں آزاد ہوتا ہے۔

شعر میں زبردست صوتی آہنگ ہے۔ایثار و عمل کی ترکیب ظاہر کرتی ہے کہ قوم میں آزادی کے لیے قربانی اور جدوجہد کا جذبہ موجود ہے۔''شعلۂ تاثیرِ آزادی'' نہایت بلیغ ترکیب ہے جس سے شعر کی اثر انگیزی بڑھ گئی ہے اور شعر کا لفظی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

شعر نمبر 4

لہو موسم نے رویا، گردشِ گردوں نے رُخ بدلا
مرے خوابوں میں نازل ہو گئی تعمیرِ آزادی

حل لغت

لہو (خون) گردشِ گردُوں (آسمان کی گردش) نازل ہونا (اترنا) تعمیرِ آزادی (آزادی کی تشکیل، آزادی کی بناوٹ)

مفہوم

موسم خون کے آنسو رو رہا ہے، آسمان کی گردش تبدیل ہو گئی ہے۔مجھے خواب میں آزادی کی تعمیر کی بشارت مل گئی ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں ممکن نہ تھی۔لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریحِ طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میرے خوابوں میں آزادی کی تعمیر نازل ہو گئی ہے۔میں نے خوابوں میں آزادی کی بشارت پا لی ہے۔آزادی کی تعمیر کے لیے بڑی قربانیاں دی گئیں۔موسم نے خون کے آنسو روئے اور آسمان کی گردش نے اپنا رنج بدل لیا۔گویا ایک بڑا انقلاب برپا ہونے والا ہے۔عوام الناس میں شعور بیدار ہو رہا ہے۔آزادی کا نغمہ فضاؤں میں دن رات گونج رہا ہے۔آزادی کے متوالے آزادی کے حصول کے لیے رات دن نعرے لگاتے ہیں۔رات کو خدا کے حضور گریہ وزاری کرتے ہیں اور دن میں اس کے حصول کے لیے جدوجہد میں مشغول ہو جاتے ہیں۔چناں چہ اب غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کا وقت آ گیا ہے، اب غلامی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ظلم و ستم کا دور ختم ہو رہا ہے۔فریب کار اور ظالم و جابر بااثر اشرافیہ اب آزادی کی جدوجہد کے سامنے خوف سے کانپنے لگے ہیں۔جنھوں نے دھوکا دہی سے عوام کو غلام بنایا ہوا تھا اب وہ اپنے انجام سے خوف کھانے لگے ہیں۔بقول شاعر:

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں　　جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
(فیض احمد فیض)

تم سے پہلے جو اک شخص یہاں تخت نشیں تھا　　اس کو بھی اپنے خدا ہونے پہ اتنا ہی یقیں تھا
کوئی ٹھہرا ہو جو لوگوں کے مقابل تو بتاؤ　　وہ کہاں ہیں جنھیں ناز بہت اپنے تئیں تھا　　(حبیب جالبؔ)

میں نے جو خواب دیکھے ہیں اُن میں آزادی ملتی نظر آتی ہے۔شاعر دراصل کہنا چاہتا ہے کہ عنقریب ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہو جائے گی لیکن اس آزادی کے حصول کے لیے ہمیں بے شمار قربانیاں دینا ہوں گی۔تبھی زمانے کی گردش تبدیل ہو گی اور آسمان سے ہمارے حق میں فیصلے ہوں۔تبھی ظالموں سے ہمیں نجات حاصل ہو گی۔بقول شاعر:

خدا نے چاہا تو اب جلد ہی وطن والے　　وطن میں اپنا مشن کامیاب دیکھیں گے
زمانہ آنے ہی والا ہے جب ہم اے ظالم　　تجھے بھی خوار، تجھے بھی خراب دیکھیں گے　　(احمق پھپھوندی)

جس طرح کسی عمارت کی تعمیر کے لیے اینٹ گارے اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح آزادی کی تعمیر میں بھی ہمارا خون، گوشت اور ہڈیاں استعمال ہوں گی۔تب کہیں جا کر آزادی کی تعمیر ممکن ہو گی۔تبھی انقلاب برپا ہو گا۔شاعر آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے اور کہتا ہے کہ آزادی کے متوالے بہادر اور نڈر ہوتے ہیں۔ہمارے اس مقصد کے حصول میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ہمارے راستے میں تپتے صحرا اور لق و دق میدان آ جائیں، سیلاب اور طوفان رکاوٹ بننا چاہیں یا وسیع و عریض دریا، بے کراں سمندر اور بلند و بالا پہاڑ حائل ہو جائیں تو بھی ہمارے قدم نہیں رکنے چاہییں۔مشکلات کو خاطر میں لائے بغیر ہمیں آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔راستہ کتنا ہی کٹھن اور دشوار گزار ہو چلنے والے باہمت ہوں تو آخر طے ہو ہی جاتا ہے۔بقول شاعر:

ہم نے روندا ہے بیابانوں کو صحراؤں کو　　ہم ہیں جو بڑھتے ہیں بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں
ہم سے واقف ہیں یہ دریا، یہ سمندر یہ پہاڑ　　ہم نئے رنگ سے تاریخ کو دہراتے ہیں
(سیف الدین سیف)

الغرض کسی بھی رکاوٹ، مشکل اور مصیبت سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے۔آہستہ آہستہ ہماری یہ آزادی کی جدوجہد پوری دنیا میں پھیل جائے گی۔ہر شہر، ہر گاؤں، ہر قریہ آزادی کے نعروں سے گونج اٹھے گا۔پوری دنیا میں جہاں کہیں ظلم و جبر اور استحصال

ہوگا ہماری یہ جد وجہد وہاں تک ضرور پہنچے گی اور اقوام عالم کو آزاد کروائے گی۔ بقول شاعر:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے
(علامہ اقبال)

شعر میں نہایت عمدہ تشبیہات استعمال ہوئی ہیں۔ جن سے شعر کا حسن دو بالا ہوگیا ہے اور اس کا مفہوم وسیع ہوگیا ہے۔ شاعر نے آنے والے وقت کو اس یقین سے بیان کیا ہے گویا اس نے آنکھوں سے اسے دیکھ لیا ہو۔

شعر نمبر 5

جو کہنا تھا اسے سب کہہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیر آزادی

حل لغت

قرآں کے پردے میں (قرآن میں، در پردہ، قرآن میں پوشیدہ) حشر (قیامت) تفسیر (تشریح، وضاحت، تفصیل)

مفہوم

خدا نے آزادی سے متعلق قرآن میں سب کچھ بیان کردیا ہے۔ اب دنیا قیامت تک آزادی کی تفسیر کرتی رہے گی۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آسکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آسکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں حاصل نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آسکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ خدا نے قرآن کی صورت میں سب کچھ بیان کردیا ہے۔ اب قیامت تک دنیا آزادی کی تشریح و تفسیر کرتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام پر کتابیں نازل فرمائیں۔ آخری کتاب قرآن آخری رسول محمد رسول اللہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل فرمائی، جو قیامت تک کے لیے بھٹکے لوگوں کی رہنمائی کا کام دیتی رہے گی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو کفر و شرک کے اندھیروں سے نکلنے اور دوسرے انسانوں کی غلامی سے نکلنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ نہ صرف عرب بلکہ پوری میں دنیا میں انسانوں کو غلام بنا کر فروخت کیا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ تعلیم دی کہ آزادی سب سے بڑی نعمت ہے، اس لیے لوگوں کی گردنیں چھڑاؤ اور انھیں آزاد کراؤ۔ دوسرا یہ کہ خدا خود بھی لوگوں کو آزادی دیتا ہے کہ جو چاہے اچھائی کی راہ اختیار کرے اور جو چاہے برائی کی راہ اختیار کرے۔ اللہ نے ہدایت بالکل واضح کردی ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جو راستہ چاہے منتخب کرے۔ اس معاملے میں دین میں کوئی جبر نہیں۔ چناں چہ ارشاد فرمایا:

لاِاکراہ فی الدین (سورہ بقرہ:256)

ترجمہ: دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں

شعر کا دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ "اُسے" سے مراد علامہ اقبالؒ ہیں۔ اقبالؒ نے اپنے کلام میں قرآن کے پردے میں آزادی سے متعلق سب کچھ کہہ دیا۔ دنیا قیامت تک ان اشعار کی تشریح کرتی رہے گی اور ان سے معانی نکالتی رہے گی۔ علامہ اقبالؒ اپنے اشعار میں آزادی اور غلامی کے متعلق کہتے ہیں:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

(علامہ اقبال)

قرآن نہ صرف مذہبی بلکہ سماجی اور سیاسی مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ قیامت تک لوگ اس سے رہنمائی لیتے رہیں گے۔ قرآن کا تصورِ آزادی بہت وسیع ہے اور یہ بہت سے انسانی حقوق کی بنیاد بنتا ہے۔ ایمان وعقیدے کی آزادی، اظہارِ رائے کی آزادی، غور و فکر کی آزادی، ملکیت کی آزادی، کسبِ معاش کی آزادی اور تحریر و تقریر کی آزادی وغیرہ۔ قیامت تک اس آزادی کی تشریح و تعبیر اور تفسیر ہوتی رہے گی۔

شاعر نے "تفسیرِ آزادی" کا ذکر کرکے قرآنی آیات کو آزادی کے مفہوم سے منسلک کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی تعلیمات میں آزادی کے تصور کی بہت اہمیت ہے۔ "حشر تک" کے الفاظ نے شعر کے مفہوم کو وسیع کردیا ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی کے ساتھ بہت گہرا فلسفہ شعر میں پرو دیا ہے۔

شعر نمبر 6

لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نا مکمل ہے مگر تعمیر آزادی

حل لغت

لہو برسا (بہت زیادہ خون بہنا، قتل و غارت ہونا) رہرو (مسافر) کٹے رشتے (رشتے ناتے اور تعلقات ٹوٹ گئے) تعمیر آزادی (حقیقی آزادی کا حصول)

مفہوم

ہمارے آباؤ اجداد نے آزادی کے حصول کے لیے بہت سی قربانیاں دیں اور مصیبتیں برداشت کیں لیکن ابھی تک ہم مکمل آزادی حاصل نہیں کر پائے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آسکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آسکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں حاصل نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آسکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر آزادی کے لیے دی جانے والی قربانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے آزادی جیسی نعمت کے حصول کے لیے بے شمار قربانیاں دی تھیں۔ ہمارے شہیدوں کے خون اور ہڈیوں سے

اس ملک کی تعمیر ہوئی تھی۔ ہماری ماؤں نے اپنے بیٹے قربان کیے تھے۔ تقسیمِ ہند کے وقت بے تحاشا خون بہایا گیا، ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا تھا۔ ہجرت کر کے آنے والے قافلوں کو لوٹا گیا تھا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، ہزاروں بچے یتیم ہوئے۔ ہزاروں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ رشتے ناتے اور تعلقات کٹ گئے۔ تب کہیں جا کر یہ آزاد ملک حاصل ہوا تھا۔ لیکن ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ جس آزادی کا خواب ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا وہ ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بقول شاعر:

جس صبح کی دل میں خواہش تھی وہ صبح ابھی تک آئی نہیں　　جس رات کا دل میں خدشہ تھا، وہ رات ابھی تک باقی ہے

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن ابھی تک آزادی کے ثمرات عوام تک نہیں پہنچ سکے۔ ہم انگریزوں کی غلامی سے نکل کر دنیا کی طاقت ور قوتوں کی غلامی میں چلے گئے ہیں۔ ہمارے اربابِ اختیار غلام بن کر رہ گئے۔ ہمارا ملک، ہماری سیاست اور ہماری معیشت اغیار کے رحم و کرم پر ہے۔ ابھی تک ہم حقیقی آزادی حاصل نہیں کر پائے۔ بقول شاعر:

ابھی تک پاؤں سے چمٹی ہیں زنجیریں غلامی کی　　دن آ جاتا ہے آزادی کا، آزادی نہیں آتی
انھیں اقوام کے رحم و کرم پر اب بھی جیتے ہیں　　غرورِ حریت نے جن سے حاصل کی تھی آزادی

(جامی ردولوی)

شاعر نے جدوجہدِ آزادی کی پوری تاریخ کو ایک مصرع میں بیان کر دیا ہے۔ ''لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے'' کے الفاظ میں ایک زبردست روانی اور اثر انگیزی ہے جو تقسیمِ ہند کے وقت ہجرت کے مناظر کو آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتی ہے۔ مصرعِ ثانی موجودہ حالات کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے۔

شعر نمبر 7

مجھے دنیا کے ہر گوشے میں قندیلیں جلانے دو
مرا مذہب ہے اک پیغامِ عالم گیر آزادی

حل لغت

گوشے (کونے، حصے) قندیل (شمع) مذہب (دھرم، دین) پیغامِ عالم گیر آزادی (پوری دنیا کے لیے آزادی کا پیغام)

مفہوم

مجھے دنیا کے ہر حصے میں آزادی کی شمع جلانے دو، میرا مذہب ساری دنیا کے لیے آزادی کا پیغام ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں حاصل نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر کے پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ میں حریت پسند ہوں، آزادی کا متوالا ہوں، مجھے اپنے عمل اور جدوجہد سے دنیا کے ہر کونے میں آزادی کی شمعیں جلانی ہیں۔ کوئی مجھے اس کام سے نہ روکے۔ آزادی ہی میرا مذہب ہے اور یہ پیغام پوری دنیا کے لیے ہے۔ پوری دنیا میں کہیں نہ کہیں لوگ غلامی کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کشمیر، فلسطین، برما اور دنیا کے دیگر علاقوں تک آزادی کی روشنی پہنچانی ہے۔ جس طرح قندیل (شمع) جب جلتی ہے تو اس کی روشنی چاروں اطراف میں پھیل جاتی ہے، اسی طرح ہماری یہ آزادی کی جدوجہد صرف ہم تک محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کے اثرات اور ثمرات پوری دنیا میں پھیل

جائیں گے۔ بقول شاعر:

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہو گی اِک دنیا نئی　　خونِ مسلم صرفِ تعمیرِ جہاں ہو جائے گا
اس بشارت کو نہ سمجھو ایک دل خوش کن قیاس　　جس کو سن کر ہر مسلماں شاد ماں ہو جائے گا
سچ ہے میرا حرف حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج　　دیکھ لینا کل مرا ہم داستاں ہو جائے گا

(مولانا ظفر علی خاں)

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ میرا مذہب یہی ہے کہ پوری دنیا کو آزادی کا پیغام دو۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ لوگوں کی گردنیں چھڑانا بہت بڑی نیکی ہے۔ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرانا ہے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان مبارک ہے:

''ماؤں نے لوگوں کو آزاد جنا ہے تم نے کب سے انھیں غلام بنا لیا''

(حضرت عمرؓ)

اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ فطرت کے قوانین کے عین مطابق ہے۔ ایک دن آئے گا جب یہ دینِ فطرت پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ ہر کچے پکے گھر میں، ہر بستی، قریہ اور گاؤں تک خدا کا یہ آخری پیغام پہنچ کر رہے گا۔ ایک دن ساری دنیا اس دین کے ماننے والی اور اس کی اطاعت کرنے والی ہو گی۔ خدا کا دین پوری دنیا میں پھیل کر رہے گا۔ ایک دوسرے شعر میں احسان دانش یہی بات ان الفاظ میں کہتے ہیں:

رہے گا دینِ فطرت پھیل کر اقصائے عالم میں　　نہیں ہے یہ خطِ سرحد، خطِ تقدیرِ آزادی

اسلام کی تعلیمات ہر زمانے اور ہر شخص کے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلام دنیا میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں اصل قلبی اور روحانی سکون دینِ اسلام کی تعلیمات ہی میں ہے۔ یہی انسانیت کی راہِ نجات ہے۔

شعر میں ''قندیلیں'' کا استعارہ آزادی کے لیے نہایت بلیغ ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ آزادی ایک روشنی کی مانند ہے جب کہ غلامی اندھیرے کی مانند ہے۔ روشنی کے سامنے اندھیرا ٹھہر نہیں سکتا۔ مصرعِ ثانی میں شاعر نے ''پیغامِ عالمِ گیرِ آزادی'' کو اپنا ''مذہب'' قرار دیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ شاعر کو آزادی پر پختہ یقین ہے۔ ''عالم گیر'' کے الفاظ شعر کی آفاقیت کو بیان کرتے ہیں۔ جن کی وجہ سے شعر کی معنویت بڑھ جاتی ہے۔

شعر نمبر 8

زمانے کو اب آزادی کے معنی ہم بتائیں گے
غلط ہوتی رہی ہے آج تک تفسیرِ آزادی

حل لغت

تفسیر (تشریح، وضاحت)

مفہوم

دنیا کو آزادی کا حقیقی مفہوم ہم بتائیں گے کیوں کہ آج تک آزادی کی غلط تشریح ہوتی رہی ہے۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں حاصل نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اب تک آزادی کی غلط تشریح ہوتی رہی ہے۔ آزادی کا مفہوم اب ہم زمانے کو بتائیں گے کیوں کہ آزادی کا صحیح مفہوم ہمیں معلوم ہے۔ ہم نے آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ جس طرح ایک مکان کی تعمیر میں اینٹ گارا اور پانی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح اس ملک کی تعمیر میں ہمارے شہیدوں کا خون شامل ہے۔ آزادی کے حصول کا سفر آسان نہ تھا۔ اس راہ میں بے شمار لوگ بے گھر ہوئے۔ بے شمار لوگوں نے آزادی کی راہ میں اپنے بیٹے قربان کروادیے اور عزیز رشتے دار کھو دیے۔ ان گنت لوگوں نے بے شمار تکلیفیں اٹھا کر اور اذیتیں برداشت کر کے ایک آزاد وطن حاصل کیا۔ ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی جانیں قربان کر کے ہمیں آزادی دلائی ہے۔ لیکن آج ہمیں اس آزادی کے ثمرات سے محروم کیا جا رہا ہے۔ ہمیں ہمارے بنیادی حقوق مہیا نہیں کیے جا رہے۔ آزادی کا مطلب صرف جسمانی غلامی سے نجات نہیں بلکہ ذہنی و فکری طور پر بھی آزادی ہے۔ ایسی آزادی جس میں اظہارِ رائے پر پابندی ہو، آزادی نہیں، بلکہ آزادی کی توہین ہے۔ لیکن یہاں عوام الناس کو اظہارِ رائے کی آزادی نہیں اس لیے وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند نہیں کر سکتے۔

جو لوگ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی زبان بند کر دی جاتی ہے۔ غلط بات پر احتجاج کرنے اور لب کھولنے والوں کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ طاقت ور اشرافیہ چاہتا ہے کہ عوام صرف وہی کہیں اور وہی سوچیں جو ہم چاہتے ہیں۔ میری نظر میں یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کی تحقیر ہے۔ بقول شاعر:

گلستاں کو لہو کی ضرورت پڑی، سب سے پہلے ہی گردن ہماری کٹی
پھر بھی کہتے ہیں مجھ سے یہ اہلِ چمن، یہ چمن ہے ہمارا تمھارا نہیں

الغرض ہماری قربانیوں کے عوض جو آزادی ملی تھی اس پر مفاد پرست قابض ہو گئے اور اس کا فائدہ انھوں نے اٹھایا، اب وہ آزادی کی غلط تعبیر لوگوں کو بتا رہے ہیں۔ آزادی کی جو تصویر وہ دکھا رہے ہیں وہ حقیقی آزادی نہیں۔ درحقیقت وہ غلامی ہے۔ ایک اور شعر میں احسان دانش کہتے ہیں:

غلام ابنِ غلام اپنی وراثت کیوں سمجھتے ہیں — ہوئی ہے جب ہمارے نام پر تعمیرِ آزادی
(احسان دانش)

جنھوں نے آزادی کے لیے ایک قطرہ بھی خون نہیں بہایا آج وہ دعوے دار ہیں کہ آزادی انھوں نے دلوائی تھی۔ مزید یہ کہ ان بادشاہوں کے محلات میں آزادی کا وہ تصور اور عکس جو ہم نے سوچا تھا ناپید ہے۔ ان محلات میں غلامی کا تصور ابھی بھی قائم ہے۔ یہ آج بھی بیرونی طاقتوں کے غلام ہیں اور ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ یہ ملک و قوم کے وفادار نہیں ہیں۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
(فیض احمد فیض)

زمانے کو آزادی کا صحیح مفہوم ہم بتائیں گے کہ آزادی کا مطلب جسمانی غلامی سے نجات کے ساتھ ساتھ ذہنی و فکری طور پر آزاد ہونا بھی ہے۔ حکومت عوام کی رائے کے مطابق ہی بنے اور عوامی رائے کے مطابق قوانین بنائے جائیں۔ سیاست و معیشت اغیار کے تسلط سے پاک ہو۔ حکمران فیصلے کرنے میں آزاد ہوں۔ عالمی دباؤ کا شکار نہ ہوں۔ ہر شخص کو حکومت کی پالیسوں پر تنقید کا حق حاصل ہو۔ آزادیٔ اظہارِ رائے ہی درحقیقت اصل آزادی ہے۔

شعر میں ''تفسیرِ آزادی'' ایک بلیغ ترکیب ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کیا ہے۔ شعر سادگی، سلاست اور روانی میں اپنی مثال آپ ہے جس پر سہلِ ممتنع کا گمان ہوتا ہے۔

شعر نمبر 9

تڑپ کر بزم میں دانش چلے آتے ہیں پروانے
اندھیروں سے مگر پھوٹی نہیں تنویرِ آزادی

حلِ لغت

تڑپ کر (بے قرار ہو کر، مراد تکلیف اٹھا کر) بزم (محفل، مراد پاکستان) پروانے (پتنگے، مراد آزادی کے دیوانے) پھوٹنا (ظاہر ہونا) تنویرِ آزادی (آزادی کی کرن، آزادی کی روشنی)

مفہوم

اے دانش آزادی کے پروانے بے قرار ہو کر وطنِ عزیز میں چلے آئے ہیں مگر ابھی تک غلامی کے اندھیروں سے آزادی کی کرن نہیں پھوٹی۔

تشریح

احسان دانش نے اس نظم میں آزادی کے جذبے اور آزادی کے فوائد و ثمرات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی اس لیے حاصل کی تھی کہ انھیں ایک ایسا ملک میسر آ سکے جس میں انھیں معاشی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی حوالے سے آزادی اور ترقی کے مواقع میسر آ سکیں۔ انھیں تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی ہو جو انگریزی اقتدار میں حاصل نہ تھی۔ لیکن بدقسمتی سے انگریزوں سے آزادی کے بعد بھی ملکِ عزیز میں عوام الناس کو تقریر و تحریر اور اظہارِ رائے کی مکمل آزادی میسر نہ آ سکی۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ آزادی کے پروانوں اور آزادی کے دیوانوں نے آزادی کے حصول کے لیے تکلیفیں اٹھا کر اور قربانیاں دے کر پاکستان آزاد کروایا تھا اور مشقتیں جھیل کر ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی یہاں کے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور، وڈیروں نے پورے ملک کو اپنے اثر و رسوخ میں لے لیا اور لوگوں کو غلام بنا کر رکھا۔ انھوں نے کبھی نہیں چاہا کہ عوام کو حقیقی آزادی میسر آئے۔ چناں چہ بظاہر تو ہم نے آزادی حاصل کر لی لیکن حقیقت میں ہم ابھی تک مکمل آزاد نہیں ہوئے بقول شاعر:

ابھی تک پاؤں سے چمٹی ہیں زنجیریں غلامی کی — دن آجاتا ہے آزادی کا، آزادی نہیں آتی
(جامی ردولوی)

آزادی کے پروانے اور دیوانے تڑپ رہے ہیں اور وہ نہایت بے قرار و بے چین ہیں۔ جس طرح پروانے اور پتنگے شمع کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں اور اپنی جان قربان کر دیتے ہیں، اسی طرح یہ آزادی کے دیوانے اور پروانے بھی آزادی کی شمع کی خاطر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ یہ دیوانے اور پروانے سر پر کفن باندھے دنیا کی محفل میں آزادی کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن مدِ مقابل اشرافیہ ابھی زیادہ طاقت اور غلبہ رکھتے ہیں اس لیے تا حال آزادی کی شمع روشن نہیں ہو سکی۔ ابھی غلامی کا اندھیرا بدستور قائم ہے۔ ابھی اس اندھیرے سے آزادی کی کرن نہیں پھوٹی۔ لیکن امید ہے ایک دن ضرور آزادی کی کرن پھوٹے گی۔ جس طرح رات کے اندھیرے سے سورج کی کرن پھوٹتی ہے اور طلوعِ سحر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک دن ان غلامی کے اندھیروں سے بھی آزادی کی کرن ضرور پھوٹے گی۔ بقول شاعر:

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا — مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم
(ساحر لدھیانوی)

ایک اور جگہ احسان دانش کہتے ہیں:

ابھی طوق و سلاسل میں ہیں آزادی کے دیوانے — مگر زنداں کے دروازے پہ ہے تصویرِ آزادی

شعر میں شاعر نے نہایت عمدہ تشبیہ اور استعارے استعمال کیے ہیں۔ ''بزم'' کا استعارہ وطنِ عزیز کے لیے اور

''پروانے'' کا استعارہ آزادی کی جدوجہد کے متوالوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ''اندھیروں'' کا استعارہ غلامی اور ظلم وستم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ''تنویر'' کی تشبیہ آزادی کے لیے استعمال کی گئی ہے۔

مشقی سوالات

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر نے کس آزادی کو تحقیرِ آزادی کہا ہے؟

جواب: شاعر کے مطابق جہاں آزاد لوگوں کو آزادی کے موضوع پر تقریر و تحریر کی آزادی نہ ہو، وہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کی تحقیر ہے۔ آزاد ملک میں آزادیٔ اظہارِ رائے پر پابندی عائد کرنا آزادی کی تحقیر اور بے عزتی ہے۔

(ب) شاعر نے کس چیز کو عبادت قرار دیا ہے؟

جواب: شاعر نے آزادی کی تعمیر کے جذبے کو عبادت قرار دیا ہے۔

(ج) قرآن کے پردے میں کیا پیغام دیا گیا ہے؟

جواب: قرآن کے پردے میں آزادی کا پیغام دیا گیا ہے۔

(د) کون سی قربانیاں دینے کے باوجود ابھی تک تعمیرِ آزادی نامکمل ہے؟

جواب: شاعر کے مطابق جانیں قربان کرنے، آنسو بہانے، رشتے ناتے اور تعلقات سے کٹنے کے باوجود بھی ابھی آزادی کی تعمیر نامکمل ہے۔

(ہ) شاعر کے خیال میں اس کا مذہب کس چیز کا پیغام دیتا ہے؟

جواب: شاعر کے مطابق اس کا مذہب عالم گیر آزادی کا پیغام دیتا ہے۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) عبادت ہے سراپا:

(الف) بندگی (ب) عشق (ج) اطاعت **(د) جذبۂ تعمیرِ آزادی**

(ب) تحریرِ آزادی کی مستقل سرخی ہے:

(الف) محبت **(ب) شہادت** (ج) عقیدت (د) الفت

(ج) اس نظم میں ''آزادی'' ہے۔

(الف) قافیہ **(ب) ردیف** (ج) قافیہ اور ردیف دونوں (د) تشبیہ

(د) یہ نظم ہیئت میں لکھی گئی ہے:

(الف) مثنوی (ب) رباعی (ج) مسدس **(د) آزا**

(و) ''تفسیرِ آزادی'' قواعد کی رو سے ہے؟

(الف) مرکب اضافی (ب) مرکب توصیفی (ج) مرکب عطفی (د) مرکب نام

(ہ) شاعر جلانا چاہتا ہے:

(الف) چراغ (ب) شمعیں **(ج) قندیلیں** (د) موم بتیاں

۳۔ نظم ''آزادی'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے خلاصہ نظم۔

۴۔ لغت کی مدد سے درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں، مطلب لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں:

جواب:

الفاظ	اعراب	معانی	جملے
سراپا	سَرَاپَا	مکمل طور پر	اللہ تعالیٰ کی ذات سراپا رحمت ہے۔
مستقل	مُستَقِل	ہمیشہ	ہر انسان مستقل سکون چاہتا ہے۔
ذوق	ذَوْق	شوق	احمد کا ادبی ذوق بے مثال ہے۔
شعلہ	شُعلَہ	آگ کی لپٹ	شمع کا شعلہ دیکھ کر پتنگے اس کے گرد منڈلانے لگے۔
قندیل	قَندِیل	شمع	ہمیں آزادی کی قندیل دنیا کے ہر کونے میں روشن کرنی ہے۔
تنویر	تَنوِیر	کرن	اسلام کی تنویر سے سارا عرب روشن ہو گیا۔

۵۔ نظم میں استعمال ہونے والے مرکب اضافی اور مرکب عطفی کی فہرست بنائیں اور معانی لکھیں۔

جواب:

مرکب اضافی	معانی	مرکب عطفی	معانی
جذبۂ تعمیرِ آزادی	آزادی کی تعمیر کا جذبہ	ایثار و عمل	قربانی اور عمل
سرخیِ تحریرِ آزادی	آزادی کی تحریر کی سرخی		
تقریرِ آزادی	آزادی کی تقریر		
تحقیرِ آزادی	آزادی کی توہین		
شعلۂ تاثیرِ آزادی	آزادی کے شعلے کا اثر		
گردشِ گردوں	زمانے کی گردش		
تعبیرِ آزادی	آزادی کی تشریح		
تفسیرِ آزادی	آزادی کی وضاحت		
پیغامِ عالم گیرِ آزادی	آزادی کا عالم گیر پیغام		

۶۔ محاسنِ شعری اور حوالوں کے ساتھ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

لہو موسم نے رویا، گردشِ گردوں نے رُخ بدلا
مرے خوابوں میں نازل ہوگئی تعمیرِ آزادی

جو کہنا تھا اسے سب کہہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیرِ آزادی

لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعمیرِ آزادی

جواب: دیکھیے تشریحِ اشعار۔

۷۔ احسان دانش کی نظم "آزادی" کا یہ شعر غور سے پڑھیں:

جو کہنا تھا اسے، سب کہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیر آزادی

اس شعر میں غالباً علامہ اقبالؒ کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کے درج ذیل اشعار پڑھیں اور ان کے نظریۂ آزادی وغلامی پر تبصرہ کریں۔

غلامی کیا ہے؟ ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

احسان دانش کے درج ذیل شعر کی تشریح کریں:

جہاں آزاد کر سکتے نہ ہوں تقریرِ آزادی
وہ آزادی مری نظروں میں ہے تحقیرِ آزادی

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

۸۔ مولانا ظفر علی خاں کے درج ذیل اشعار پر تحریک آزادی کے تناظر میں تنقید اور تبصرہ کریں:

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہو گی اک دنیا نئی
خون مسلم صرف تعمیر جہاں ہو جائے گا
بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا، باطل نہاں ہو جائے گا
نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں
وہ جو دار الحرب ہے، دارالاماں ہو جائے گا

۱۰۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے سلطان ٹیپو کی کوششوں کے موضوع پر دو دوستوں کے مابین مکالمہ تحریر کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

"شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔" کے موضوع پر مباحثے میں حصہ لیں اور اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلائل دیں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ درست تلفظ اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ نظم کی مثالی بلند خوانی کریں۔
۲۔ مرکبات اور تراکیب کی وضاحت کریں۔
۳۔ شعری اصطلاحات کا تعارف مثالوں کے ساتھ کرائیں۔
۴۔ آزادی کی اہمیت واضح کریں اور تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی حوالوں سے ادب پاروں کی تفہیم کا شعور اجاگر کریں۔

سبق ۱۶: اِخلاص

شاعر
رحمان بابا
(1632-1711)

شاعر کا تعارف

نام عبدالرحمان ہے۔ آپ ۱۰۴۲ھ میں پشاور کے قریب "بہادر کلے" ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور رحمان بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام عبدالستار تھا جو مہمند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ اور تصوف کی تعلیم اپنے گاؤں کے جید عالم دین ملا یوسف سے حاصل کی۔ اس کے بعد کوہاٹ چلے گئے جہاں آپ نے جذب و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جوانی ہی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اکثر عشقِ ربانی میں ڈوبے رہتے۔

پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا ایک صاحب طرز شاعر ہیں جو دوسرے پشتو شعرا سے الگ اپنا مکتب فکر رکھتے ہیں۔ رحمان بابا کے کلام میں خودی کی تعلیم اور عالم گیر انسانی مساوات کا درس ملتا ہے۔ آپ کا پیغام محبت ہے۔ تمام انسانوں سے محبت ساری کائنات سے محبت۔ اگر نفرت ہے تو ظلم سے، بے انصافی سے، استحصال سے، جبر و تشدد اور آمریت سے۔ یہی آپ کی متصوفانہ شاعری کی اساس ہے اور یہی خصوصیت ہے جو انھیں دوسرے پشتو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کے ہاں اخلاقی پہلو غالب ہے لیکن انھوں نے اس ناصحانہ اسلوب کو بھی خشک اور ناگوار نہیں رہنے دیا اسی لیے وہ پشتون شاعری کے "حافظ شیرازی" کہلاتے ہیں۔

پروفیسر محمد طٰہٰ خان (1931-2013ء)

شاعر کا تعارف

پروفیسر محمد طٰہٰ خان ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علم و ادب کے میدان میں مختلف پہلوؤں سے اپنی پہچان کروائی۔ وہ ایک قابل استاد تھے جو ان کی بنیادی حیثیت تھی۔ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقید و تحقیق، شاعری اور ترجمہ کرنے میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ وہ ایک براڈ کاسٹر بھی تھے۔ ان سب صلاحیتوں کے علاوہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری ان کی خاص پہچان ہے۔

انھوں نے عظیم پشتو شاعر رحمان بابا کے صوفیانہ کلام کا منظوم ترجمہ اردو زبان میں کیا جو "متاعِ فقیر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر ۲۰۰۷ء میں انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا گیا۔

مرکزی خیال

اخلاص عزت اور کامیابی کی کنجی ہے۔ دین و دنیا کی کامیابی اخلاص کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اخلاص سے ناممکن کا حصول بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

نظم کا خلاصہ

اخلاص کا مقام ثریا ستارے جتنا بلند ہے۔ اگرچہ زمین سے آسمان تک سفر مشکل ہے لیکن اخلاص اپنانے سے یہ سفر ایک لمحے میں طے ہو سکتا ہے۔ اخلاص کے سوا دنیا میں ہر شے فانی ہے۔ اسلام پابندیٔ اخلاص کا نام ہے۔ اخلاص کی بدولت ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے، اخلاص سے ہما جیسا پرندہ بھی ہاتھ آ سکتا ہے۔ میری شیریں بیانی پر حیران کیوں ہو، میرا کلام اخلاص پر مبنی ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

ہم دوشِ ثُریّا ہے مقامِ اخلاص
جو ملتا ہے، ملتا ہے غلامِ اخلاص

حل لغت ہم دوش (کندھے سے کندھا ملا، ہم سر، برابر)، ثریا (بلند ستاروں کا جھرمٹ، آسمان کا بلند مقام)، مقام (رتبہ)، اخلاص (خلوص، نیک نیتی، بے لوث ہونا، دل کی سچائی)

مفہوم

اخلاص کا مقام ثریا ستارے سے بھی بلند ہے، اخلاص سب کو گرویدہ کر لیتا ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

اس نظم میں رحمان بابا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث **"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"** سے استفادہ کرتے ہوئے اخلاص کی اہمیت کو منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ اخلاص کے لغوی معنی خالص ہونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی اخلاص کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"اخلاص یہ ہے کہ دل کو ہر چیز سے پاک کر کے صرف اللہ کے لیے خالص کر لیا جائے" (امام راغب اصفہانیؒ)

چناں چہ اخلاص یا خلوصِ نیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، اس میں تصنع اور بناوٹ، ریاکاری اور دنیوی غرض شامل نہ ہو۔ اخلاص کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعمال روشن اور وزنی ہوں گے اور قابلِ قبول ہوں گے۔ بصورتِ دیگر اعمال صرف ڈھانچے بن کر رہ جائیں گے۔ جس طرح اعضائے بدن کی کارکردگی روح پر منحصر ہے اسی طرح اعمالِ صالحہ کی قبولیت اور کارکردگی اخلاص اور خلوصِ نیت پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزِ قیامت اعمال کی گنتی نہیں ہوگی بلکہ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ ہر شخص کے اعمال اس کے اخلاص کے بقدر وزنی ہوں گے۔ بقول منکر:

"دنیا میں سب سے عظیم تر چیز اخلاص ہے" (یوسف بن حسینؒ)

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اخلاص کا مقام ثریا ستارے کے برابر ہے۔ یعنی اخلاص اپنانے والا شخص عزت و مرتبے میں ستاروں جیسی بلندی حاصل کر لیتا ہے۔ "ثریا" آسمان پر موجود سات ستاروں کے جھرمٹ کو کہتے ہیں جو انتہائی بلندی پر موجود ہوتے ہیں۔ مسافر ان کی مدد سے وقت اور راستے کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اخلاص کو اپنانے والا شخص دنیا میں ثریا ستاروں جیسی بلندی پاتا ہے جس طرح ثریا ستارے رات کو آسمان پر روشن ہوتے ہیں اور بلندی پر نظر آتے ہیں اسی طرح اخلاص کا حامل شخص دنیا میں مشہور اور معزز ہوتا ہے اور وہ بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ اسلام نے خلوصِ نیت، اللہ کی رضا طلبی اور حسنِ اخلاق پر بہت زور دیا ہے چناں چہ نبی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہے" (حدیث)

دوسرے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جو بھی ملتا ہے وہ اخلاص کا غلام ہے یعنی ہر شخص اخلاص کا گرویدہ ہے۔ اخلاص کے ذریعے دلوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ دل تلوار سے فتح نہیں ہوتے بلکہ خلوص اور محبت سے فتح ہوتے ہیں۔ بقول شاعر:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم — جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (علامہ اقبال)

اخلاص اللہ سے تعلق قائم ہونے کا نام ہے۔ اخلاص کا غلام ہونا دراصل اللہ کا غلام ہونا ہے۔ جب بندہ اللہ کا غلام ہو جاتا ہے تو اس کا ہر عمل مبنی بر اخلاص ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم اللہ کی رضا کے لیے اٹھتا ہے۔ جو شخص اخلاص کا غلام ہو جاتا ہے پوری دنیا اس کی غلام ہو جاتی ہے، وہ دین و دنیا میں بلند مقام حاصل کر لیتا ہے۔

شعر میں "ہم دوشِ ثریا" نہایت خوب صورت ترکیب ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر نے آفاقی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ شعر کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے لیکن اس میں دیا گیا پیغام عالمی سچائی ہے۔

شعر نمبر 2

گو فرش سے تا عرش سفر ہے دشوار
طے کرتی ہے بہ یک جُنبش گامِ اخلاص

حل لغت گو (اگرچہ)، فرش (زمین)، عرش (آسمان)، دشوار (مشکل، کٹھن)، یک جنبش (ایک حرکت)، گام (قدم)

مفہوم

اگرچہ زمین سے آسمان تک سفر کرنا بہت مشکل ہے لیکن اخلاص اپنانے سے یہ سفر ایک لمحے میں ہو جاتا ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اخلاص کی بدولت ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ زمین سے آسمان تک کا سفر انسان کے لیے ناممکن ہے، انسان کے پاس جنات اور فرشتوں کی مانند پرواز کی طاقت نہیں ہے۔ جنات اور فرشتے بھی ایک حد تک پرواز کر سکتے ہیں، عرش تک وہ بھی نہیں جا سکتے۔ لیکن اخلاص میں وہ طاقت اور خوبی ہے کہ اخلاص اپنانے والا شخص وہاں تک کا سفر کر سکتا ہے جہاں جنات اور فرشتوں کی بھی رسائی نہیں، یعنی اخلاص کی بدولت انسان عرشِ معلیٰ تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کا دل اللہ کے انوار کا مرکز ہے۔ اللہ کائنات میں نہیں سماتا لیکن مومن کے دل میں سما جاتا ہے۔ اگر دل گناہوں سے پاک ہو، انسان کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو اور اعمال میں اخلاص ہو تو انسان کا دل اللہ کا عرش بن جاتا ہے۔ زمین پر ہوتے ہوئے انسان کا تعلق عرشِ معلیٰ سے قائم ہو جاتا ہے۔ انسان زمین پر بیٹھ کر خلوصِ دل سے جو بھی دعا و مناجات کرتا ہے وہ سیدھی عرش تک پہنچتی ہے، اس کے راستے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ ادھر اس کے دل سے دعا نکلتی ہے اور ادھر ایک لمحے کی بھی تاخیر کے بغیر وہ عرش تک جا پہنچتی ہے۔ بقول شاعر:

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ (علامہ اقبال)

ایک اور جگہ اقبالؒ کہتے ہیں:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (علامہ اقبال)

معراج کی شب سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ کر جبریل علیہ السلام بھی رک گئے اور فرمایا میری حد یہیں تک ہے، اس سے آگے اگر ایک قدم بھی بڑھایا تو میرے پَر جل جائیں گے۔ اس سے آگے نبی کریم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے اور عالمِ بالا کی سیر کرتے ہوئے عرشِ معلیٰ تک پہنچے۔ اللہ سے ملاقات کی اور راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ یہ تمام سفر لاکھوں نوری سال کا تھا لیکن جب آپ واپس تشریف لائے تو معلوم ہوا گویا اس تمام سفر میں ایک پل بھی نہیں لگا، یہاں تک کہ آپ کا بستر بھی ویسے ہی گرم تھا جیسے

آپ چھوڑ کر گئے تھے۔ گویا ایک لمحے کے بھی ہزارویں حصے میں آپ نے لاکھوں نوری سال کا سفر طے کر لیا تھا۔ یہ اللہ سے سچی محبت سچی لگن اور خلوص ہی تھا جس کی بدولت ایک جست میں تمام مراحل طے ہو گئے۔

خلوص، حسنِ نیت اور سچی لگن کی بدولت ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ منزل کے حصول کا ہر مرحلہ سہل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ جنت بھی چند قدم کی مسافت پر ہوتی ہے۔ ایک اور شعر میں رحمان بابا فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''بے وقوف ہے وہ جو جنت کو آسمان میں ڈھونڈتا ہے، اس کا سفر تو اخلاص کے چند قدموں سے ہوتا ہے'' (رحمان بابا)

شعر میں عرش اور فرش کے الفاظ صنعتِ تضاد ہیں۔ اسی طرح ''بہ یک جنبشِ گام'' فارسی ترکیب ہے جو نہایت بلیغ ہے۔ شعر میں فارسی الفاظ کے باوجود سادگی اور سلاست برقرار ہے۔

شعر نمبر 3

فانی ہے ہر اک چیز، ہر اک رسم و رواج
باقی ہے مگر ایک ، دوامِ اخلاص

حل لغت

فانی (فنا ہونے والی، مٹ جانے والی)، ووام (ہمیشگی والی، سدا رہنے والی)

مفہوم

ہر چیز فنا ہونے والی ہے لیکن اخلاص کو دوام حاصل ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر نے ایک اٹل حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں ہر شے عارضی اور فانی ہے۔ کسی بھی چیز کو ثبات اور قرار نہیں۔ مخلوقات، جمادات و نباتات، دن رات، موسم، حالات، طور طریقے اور رسم و رواج الغرض کسی بھی چیز کو دوام نہیں۔ تغیر و تبدل کا فسوں ہر ایک پر برابر چل رہا ہے۔ دنیا کی ہر چیز کے لیے اللہ تعالیٰ کا اٹل قانون ہے جو اللہ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

ترجمہ: زمین پر ہر چیز کو فنا ہے (سورہ رحمٰن)

بقول شاعر:

دنیا کی عجب کہانی دیکھی ہر شے آنی جانی دیکھی

دنیا میں کسی بھی چیز کو پائیداری حاصل نہیں۔ ہر چیز عارضی اور فانی ہے۔ انسان زندگی گزارنے کے لیے بہت سے رسم و رواج اور قانون و قاعدے بناتا ہے۔ اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق طرزِ زندگی اور رہن سہن کے اطوار اپناتا ہے۔ علاقائی نسبت سے تہذیب و ثقافت اختیار کرتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں اور چیزوں میں تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں، وہاں انسان کے رسم و رواج، قانون و قاعدے، تہذیب و ثقافت اور رہن سہن کے طور طریقے بھی حالات و واقعات کے مطابق تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان کی جگہ جدید رسم و رواج اور قانون و قاعدے اپنا لیے جاتے ہیں۔ یہی دنیا کی ریت ہے۔ سو سال پہلے کے رسم و رواج اور دورِ حاضر کے رسم و رواج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وقت، علاقہ اور زمانے کے حالات کے مطابق رہن سہن و رواج اور طور طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ دیہی اور شہری زندگی اور ایک ہی ملک کے مختلف صوبوں کے رسم و رواج میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ بقول شاعر:

دیہات کے بسنے والے تو
اخلاص کے پیکر ہوتے ہیں
اے کاش! نئی تہذیب کی رو
شہروں سے نہ آتی گاؤں میں

(اختر مسلمی)

لیکن اخلاص ایک ایسی چیز ہے جو کسی خاص وقت، زمانے یا علاقے تک محدود نہیں، بلکہ ہر زمانے میں، ہر وقت اور ہر علاقے میں انسان کو متاثر کرتا ہے۔ ہر چیز ناپائیدار ہے مگر اخلاص کو دوام ہے۔ ہر زمانے میں اخلاص کو پسند کیا گیا، پسند کیا جاتا ہے اور پسند کیا جاتا رہے گا۔ حتیٰ کہ موت بھی اخلاص ختم نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی عمل خلوص، نیک نیتی اور اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے جس میں ذاتی مفاد یا غرض نہ ہو تو ایسا عمل اللہ کے نزدیک نہایت بلند ہوتا ہے۔ بقول مفکر:

''دنیا میں سب سے عظیم تر چیز اخلاص ہے'' (یوسف بن حسینؒ)

شعر میں شاعر نے بڑی خوب صورتی سے ''فانی'' اور ''باقی'' متضاد الفاظ استعمال کیے ہیں جو صنعتِ تضاد ہے۔ شعر سادگی اور سلاست سے بھرپور ہے اور آفاقی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔

شعر نمبر 4

اسلام ہے پابندیِ اخلاص کا نام
اور نام ہے اسلام کا نامِ اخلاص

حل لغت

اسلام (اللہ کا پسندیدہ دین، سرِ تسلیم خم کرنا)، پابندیٔ اخلاص (اخلاص کی عادت)

مفہوم

اسلام اخلاص کی پابندی کا نام ہے، اسلام کا نام ہی بے لوث تسلیم و رضا ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

اسلام اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری اور اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ اسلام کی بنیاد اخلاص ہے۔ انسان کی تخلیق کا بنیادی مقصد اللہ کی بندگی ہے، بندگی کا ایک جُز و عبادت ہے، عبادت میں جان اخلاص سے پڑتی ہے۔ اخلاص کے بغیر عبادت بے فائدہ ہے۔ اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ ہر عمل خاص اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے، اس میں تصنع، بناوٹ، ریاکاری اور کوئی دنیوی غرض شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' (سورہ انعام)

ترجمہ: کہو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

اخلاص کے بغیر ہر قسم کا عمل بے کار ہوتا ہے۔ کوئی عمل کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن نیت درست نہ ہو تو رائیگاں جاتا ہے۔ جو عمل اخلاص پر مبنی ہو، خالص اللہ کی رضا اور خوش نودی کے لیے کیا جائے وہی قابلِ قبول ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اخلاص تمام اعمال کی روح ہے۔ وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو اس جسم کی مانند ہے جس میں روح نہ ہو۔ اللہ کے نزدیک اعمال کی کثرت معتبر نہیں بلکہ اعمال کا حُسن اور اخلاص معتبر ہے۔ گویا اسلام پابندیٔ اخلاص کا نام ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

ترجمہ: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' (حدیث)

تشریح طلب شعر میں شاعر نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اسلام اخلاص کی پابندی اور اللہ کی بے لوث فرماں برداری کا نام ہے۔ جو کام بھی اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا جائے جس میں ذاتی مفاد یا دکھاوا نہ ہو تو ایسا عمل اللہ کے نزدیک قابلِ قبول اور نہایت بلند پایہ ہوتا ہے۔ اس میں بڑی قوت و برکت ہوتی ہے، جس کام میں ذاتی مفاد اور دنیوی غرض کارفرما ہو، اس عمل میں کوئی طاقت اور برکت نہیں ہوتی۔ ایک شاعر اخلاص کی اہمیت یوں اجاگر کرتے ہیں:

درِ اخلاص کی دہلیز پر خم ہوں عابد ایک جینے کا سلیقہ دلِ بے باک میں ہے (سید عابد علی عابد)

شعر میں ''اسلام''، ''اخلاص'' اور ''نام'' کے الفاظ کی تکرار ہے، جو شعر کے صوتی حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ شعر کی یہ خوبی صنعتِ تکرار کہلاتی ہے۔ علاوہ ازیں شعر سادگی اور سلاست سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 5

صیّاد کو ممکن ہے ہما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اخلاص

حل لغت

صیاد (شکاری)، ہما (ایک فرضی پرندہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے)، دام (جال، پھندہ)

مفہوم

اخلاص ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے، اگر شکاری اخلاص و محبت سے جال پھیلائے تو ہما پرندہ بھی ہاتھ آ سکتا ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اخلاص میں وہ قوت اور اعجاز ہے کہ اس کے ذریعے ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ ''ہما'' ایک خیالی پرندہ ہے جو قصے کہانیوں میں پایا جاتا ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ہما جس شخص کے سر پر بیٹھ جائے یا جس کے سر سے گزر جائے وہ شخص بادشاہ بن جاتا ہے۔ قصے کہانیوں میں بادشاہ کے انتخاب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ سب لوگ ایک میدان میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد ''ہما'' پرندہ آتا تھا، وہ جس شخص کے سر پر بیٹھ جاتا اسے بادشاہ منتخب کر لیا جاتا تھا۔ چناں چہ ہر شخص ''ہما'' کا متلاشی رہتا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر شکاری پُرخلوص ہو اور محبت کا علم بردار ہو، اس کا دل محبت کے جذبے سے لبریز ہو تو اس کے جال میں ہما پرندہ بھی آ سکتا ہے۔ شکاری کو دیکھ کر پرندے عموماً دور بھاگتے ہیں لیکن شاعر کا کہنا ہے کہ اگر شکاری کا دل محبت و اخلاص سے بھرپور ہو تو عام پرندوں کا کیا کہنا ہما جیسا نایاب پرندہ بھی شکاری کے جال میں آنے کی خواہش کرے۔

''ہما'' کے دام میں آنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص کی بدولت انسان عزت و شہرت کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اخلاص کی بدولت کامیابی اور شہرت انسان کے دام میں خود چل کر آ جاتی ہے۔ بقول شاعر:

منزل کی جستجو میں کیوں پھر رہا ہے راہی اتنا عظیم ہو جا کہ منزل تجھے پکارے (ابنِ رضا)

الغرض محبت، خلوص اور سچی لگن کی بدولت ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ خلوص و محبت میں وہ قوت ہے کہ انسان اس کی بدولت دنیا پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔ وہ شہرت و ناموری کی چوٹیاں سر کر لیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں

اس کی عزت اور قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے انسان کو اپنے ہر عمل میں اخلاص و محبت اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بقول شاعر:

اخلاص کی دولت دے، کردار کی رفعت دے سرشار مجھے کر دے، اعجاز محبت دے (ابنِ رضا)

شاعر نے شعر میں بڑی عمدگی سے صنعتِ مراعات النظیر کا استعمال کیا ہے۔ ''صیاد'' کا لفظ شروع میں لا کر اسی کی مناسبت سے ''ہما'' اور ''دام'' کے الفاظ لائے گئے ہیں، جو صنعتِ مراعات النظیر ہے۔

شعر نمبر 6

شیرینیِ گفتار پہ حیرت کیسی
ہے گفتۂ رحمٰن ، کلامِ اخلاص

حل لغت

شیرینی (مٹھاس)، گفتار (گفت گو)، گفتہ (کہا ہوا، بات، گفت گو)

مفہوم

میری گفت گو کی مٹھاس پر آپ کو حیرت کیوں ہے؟ یہ رحمان بابا کا کلام ہے جو اخلاص پر مبنی ہے۔

تشریح

رحمان بابا پشتو زبان کے عظیم صوفی شاعر تھے۔ ان کی شخصیت علم، تقویٰ اور سادگی کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے اشعار میں سچائی، اخلاص اور انسان دوستی کا پیغام ہے۔ وہ عشقِ حقیقی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ آج بھی ان کا کلام فکری رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

تشریح طلب شعر میں رحمان بابا نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیتے ہوئے اپنی تعریف اور اپنے کلام کی خوبی بیان کی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میری گفت گو اور میری شاعری میں اتنی مٹھاس دیکھ کر آپ کو حیرت ہو رہی ہے کہ یہ کس وجہ سے ہے؟ آپ سوچتے ہیں کہ میرے کلام میں اس قدر تاثیر اور حلاوت کہاں سے آ گئی کہ سننے والوں کے کانوں سے ہوتا ہوا سیدھا دل میں اتر جاتا ہے اور ان کا دل موہ لیتا ہے۔ سنو! میرے کلام میں شیرینی، مٹھاس اور تاثیر میرے اخلاص کی بدولت ہے۔ میں بغیر کسی دنیوی غرض اور طمع یا شہرت و ناموری کے صرف اللہ کی رضا کے لیے، مخلوقِ خدا کی اصلاح کے لیے، خلوصِ دل سے سیدھی اور سچی باتیں کہتا ہوں۔ میں پیغامِ امن اور پیغامِ محبت دیتا ہوں۔ اس لیے میرے کلام میں وہ تاثیر اور مٹھاس ہے کہ سننے والوں کے دل میں اتر جاتا ہے۔ بقول شاعر:

گفتگو میں وہ حلاوت، وہ عمل میں اخلاص اس کی ہستی پہ فرشتے کا گماں ہو جیسے (دائم غواصی)

ایک اور شاعر اسی مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں:

لفظوں کی روشنی ہے، یا لہجے کی چاشنی میرا تو کچھ نہیں ہے، سارا خدا کا ہے (عمر شاہد)

صوفیا کا کلام دنیوی غرض اور ذاتی مفاد سے پاک ہوتا ہے۔ صوفیا اللہ کا پیغام بے لوث ہو کر اللہ کی مخلوق تک پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنے اخلاص و محبت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔ بر صغیر میں لاکھوں لوگ صوفیا کے اخلاص اور محبت بھرے کلام سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ رحمان بابا بھی ایک صوفی شاعر تھے جو اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو اخلاقیات کا درس دیتے تھے اور نفرتوں کو محبت میں بدل دیتے تھے۔ ان کے اخلاص اور محبت کی وجہ سے لوگ ان کی جانب کھنچے چلے آتے تھے۔ بقول شاعر:

میں محبت ہوں، مجھے آتا ہے نفرت کا علاج تم ہر اک شخص کے سینے میں مرا دل رکھ دو (عاصی کرنالی)

شعر میں شاعر نے صنعتِ اشتقاق کا استعمال کیا ہے۔ گفت گو کا لفظ گفتہ سے مشتق ہے۔ علاوہ ازیں شاعر نے اپنا تخلص بھی بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔

مشقی سوالات

ا۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) نظم ''اخلاص'' میں انسانی کردار کے کس اعلیٰ وصف کا ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: اس نظم میں انسانی کردار کے ایک اعلیٰ وصف اخلاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ اخلاص عزت اور کامیابی کی کنجی ہے۔ دین و دنیا کی کامیابی اخلاص کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اخلاص سے ناممکن کا حصول بھی ممکن ہو جاتا ہے۔

(ب) ''ہم دوش ثریا'' کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟

جواب: ہم دوشِ ثریا کا مطلب ہے ثریا ستارے کے برابر۔ یعنی اخلاص کی بدولت انسان ثریا ستارے کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ ''ثریا'' آسمان پر موجود سات ستاروں کے جھرمٹ کو کہتے ہیں جو انتہائی بلندی پر موجود ہوتے ہیں۔ مسافر ان کی مدد سے وقت اور راستے کی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اخلاص کو اپنانے والا شخص دنیا میں ثریا ستاروں جیسی بلندی پاتا ہے۔ جس طرح ثریا ستارے رات کو آسمان پر روشن ہوتے ہیں اور بلندی پر نظر آتے ہیں، اسی طرح اخلاص کا حامل شخص دنیا میں مشہور اور معزز ہوتا ہے اور وہ بلند مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔

(ج) اخلاص کا ایک قدم انسان کو کس مقام اور مرتبے تک پہنچا دیتا ہے؟

جواب: اخلاص کا ایک قدم انسان کو فرش سے عرش تک پہنچا دیتا ہے۔ جب انسان خلوصِ دل سے اللہ کو پکارتا ہے تو اس کی صدا اللہ کے عرش تک پہنچ جاتی ہے۔

(د) شاعر نے صیاد کو کس کامیابی کی نوید سنائی ہے؟

جواب: شاعر کہتا ہے اگر صیاد اخلاص و محبت سے جال پھیلائے تو ہما جیسا نایاب پرندہ بھی ہاتھ آ سکتا ہے۔ 'ہما'' ایک خیالی پرندہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جس کے سر پر بیٹھ جائے وہ شخص بادشاہ بن جاتا ہے۔

(ہ) گفتۂ رحمان کا مطلب کیا ہے؟ جواب: گفتۂ رحمان کا مطلب شاعر رحمان بابا کا کلام ہے۔

۲۔ نظم کے متن کے مطابق مصرعے مکمل کریں۔

(الف) گو فرش سے تا عرش۔۔۔۔۔ ہے دشوار
(ب) طے کرتی ہے۔۔۔۔۔ گام اخلاص
(ج) اسلام ہے پابندی۔۔۔۔۔ کا نام
(د) اور نام ہے۔۔۔۔ کا نام اخلاص
(ہ) صیاد کو ممکن ہے۔۔۔۔۔ ہاتھ لگے

جواب:

(الف) گو فرش سے تا عرش۔۔۔ سفر۔۔۔۔ ہے دشوار
(ب) طے کرتی ہے۔۔۔ بہ یک جنبش۔۔۔ گام اخلاص
(ج) اسلام ہے پابندی۔۔۔ اخلاص۔۔۔۔ کا نام
(د) اور نام ہے۔۔۔۔ اسلام۔۔۔۔ کا نام اخلاص
(ہ) صیاد کو ممکن ہے۔۔۔۔ ہما۔۔۔۔ ہاتھ لگے

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) نظم اخلاص ترجمہ کی گئی ہے:
(الف) پشتو زبان سے (ب) سندھی زبان سے (ج) بلوچی زبان سے (د) سرائیکی زبان سے

(ب) ہر کوئی غلام ہے:
(الف) دولت کا (ب) محبت کا (ج) اخلاص کا (د) عظمت کا

(ج) دنیا میں دوام حاصل ہے:
(الف) نیکی کو (ب) اخلاص کو (ج) محبت کو (د) جمال کو

(د) پابندیٔ اخلاص نام ہے:
(الف) جہاد کا (ب) قرآن کا (ج) اسلام کا (د) دین کا

(ہ) اس نظم کی ہیئت ہے:
(الف) غزل (ب) مخمس (ج) مسدس (د) مثنوی

۴۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں صوفیانہ کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پنجاب کے کسی بزرگ صوفی شاعر کے چند اشعار کے حوالے سے ان کا تعارف کرائیں۔

جواب: صوفیانہ شاعری محبت، سچائی، انسانیت کے احترام اور اللہ کے عشق کا پیغام دیتی ہے۔ صوفی شاعر اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو نفرت، غرور اور دنیا کی حرص و ہوس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ صوفی شاعر اپنی شاعری میں لوگوں کی دل کی پاکیزگی کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ شاعری صرف الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی سچی پکار ہوتی ہے جو ہر انسان کے دل کو چھو لیتی ہے۔ صوفی شاعر دنیا میں محبت، امن اور سادگی کا چراغ جلاتے ہیں تاکہ انسان اپنے خالق و مالک کو پہچان سکے۔

بلھے شاہ ایک مشہور پنجابی صوفی شاعر تھے ان کا اصل نام عبداللہ شاہ تھا۔ آپؒ 1680ء کے قریب پنجاب کے ضلع قصور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ایک عالم دین تھے۔ بلھے شاہ کو بچپن سے ہی تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ پھر ملتان جا کر آپ نے علمِ دین، تصوف اور روحانیت کی تعلیم حاصل کی۔ بلھے شاہ نے قصور کے مشہور عالم حضرت شاہ عنایت قادری کی بیعت کی اور روحانی فیض حاصل کیا۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اللہ کی محبت اور انسانوں کی خدمت میں گزار دی۔ آپ دنیوی رسم و رواج سے الگ ہو کر سچائی کی راہ پر گامزن رہے۔

بلھے شاہ کا کلام لوگوں میں بہت مقبول ہے، ان کے کلام کی نمایاں خوبی سادگی اور خلوص ہے۔ وہ اپنی شاعری میں نہایت آسان اور سادہ زبان میں بہت بڑی بات کہہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عشقِ الٰہی، انسان دوستی، سچائی، عاجزی اور خودشناسی کا درس ملتا ہے۔ بلھے شاہ نے اپنے اشعار میں دکھاوے اور ریاکاری کی سخت مخالفت کی ہے۔ وہ دل کی پاکیزگی، خلوص اور محبت کو اصل عبادت قرار دیتے ہیں۔ ان کے کلام کا مقبول عوامی انداز بھی لوگوں کے دلوں کو چھو لیتا ہے۔ ان کی شاعری ہر دور میں تازہ محسوس ہوتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں محبت اور اللہ کی یاد جگاتی ہے۔ ان کے کلام سے انسانوں کے درمیان تفریق سے بیزاری نظر آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ کسی خاص مذہبی شناخت یا فرقے میں بندھ کر اللہ کو نہیں پہچانتے۔ اصل معرفت تو انسان کی ذات کے اندر چھپی سچائی کو پہچاننا ہے۔

بلھا کیہ جاناں میں کون
نہ مومن وچ مسیتاں
نہ میں کفر دیاں ریتاں
نہ پاکاں وچ پلیتاں

ظاہری عبادات اور ظاہری علم کی بجائے اللہ کی محبت سے زندگی کا مقصد حاصل کرنا چاہیے، صرف دنیوی علم حاصل کرنا اور عبادت گاہوں میں جانا کافی نہیں۔ اصل علم اپنے آپ کو پہچاننا اور اپنے دل میں اللہ کی محبت کو تلاش کرنا ہے۔

پڑھ پڑھ علم ہزار کتاباں
کدی اپنے آپ نوں پڑھیا نئیں
جا جا وڑدا مندر مسیتاں
کدی اپنے دل وچ وڑیا نئیں

بلھے شاہ کے نزدیک عشق میں خود کو مٹا کر ہی انسان اپنے اصلی وجود کو پہچان سکتا ہے۔

عشق دے وچوں ہو کے فنا آپنے آپ نوں لبھیا اے

۵۔ درج ذیل شعر کی روشنی میں اخلاص کی وضاحت کریں:

صیاد کو ممکن ہے ہُما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اخلاص

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

۶۔ نظم ''اخلاص'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

جواب: دیکھیے خلاصہ نظم۔

۷۔ نظم اخلاص میں استعمال ہونے والے مرکبات کے معنی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

جواب:

مرکبات	معانی	جملے
ہم دوشِ ثریا	بلند مقام	جو اقوام علم اور اخلاق میں ترقی کرتی ہیں وہی ہم دوشِ ثریا ہوتی ہیں۔
مقام اخلاص	اخلاص کا مقام	مقام اخلاص بہت بلند ہے۔
غلام اخلاص	اخلاص کا غلام	دنیا میں ہر شخص غلام اخلاص ہے۔
بہ یک جنبشِ گام	ایک قدم کی حرکت	اخلاص کی بدولت بہ یک جنبشِ گام فرش تا عرش رسائی ہو جاتی ہے۔
رسم ورواج	طور طریقے	گاؤں کے لوگ رسم ورواج کے پابند ہوتے ہیں۔
دوام اخلاص	ہمیشہ کا اخلاص	سبھی رسم ورواج مٹ رہے ہیں صرف دوام اخلاص کا ڈنکا بج رہا ہے۔
پابندیٔ اخلاص	اخلاص کی پابندی	اسلام پابندیٔ اخلاص کا نام ہے۔
نام اخلاص	اخلاص کا نام	اسلام دراصل نام اخلاص ہی ہے۔
دام اخلاص	اخلاص کا جال	دام اخلاص کے ذریعے ہما جیسا پرندہ بھی صیاد کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔
شیرینیٔ گفتار	میٹھی گفت گو	شیرینیٔ گفتار سے جہان رام ہو جاتا ہے۔
گفتۂ رحمان	رحمان کی گفت گو	گفتۂ رحمان بہت دل نشین ہے۔
کلام اخلاص	اخلاص کا کلام	رحمان بابا کا کلام، کلام اخلاص ہے۔

سرگرمی برائے طلبہ:

طلبہ نظم اخلاص کے قوافی کی پہچان کرتے ہوئے ان کی فہرست ترتیب دیں۔

جواب: اس نظم کے قوافی ہیں:

مقام، غلام، گام، دوام، نام، دام، کلام

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ طلبہ کو اس نظم کے پوشیدہ پیغام سے روشناس کرائیں۔

۲۔ صوفیانہ افکار کے حامل چند اردو شعرا سے متعارف کرائیں۔

شاعر
سید محمد جعفری
(1905-1976)

سبق: ۱۷ کھڑا ڈنر

شاعر کا تعارف

اکبر الٰہ آبادی کے بعد طنزیہ مزاحیہ شاعری میں سید محمد جعفری کا نام بہت نمایاں ہے۔ سید محمد جعفری بھرت پور (ہندوستان) کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور تعلیم کے زیادہ تر مراحل لاہور میں طے کیے۔ ان کے والد سید محمد علی جعفری جو اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور کے پرنسپل تھے تاریخ اور فلسفے کے عالم تھے۔ مولانا شبلی نعمانی اور علامہ اقبال جیسے عظیم لوگوں سے ملنے والوں میں سے تھے اور شعر و شاعری کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سید محمد جعفری کے سامنے سب سے پہلا معاش کا مسئلہ پیش آیا تو چند دن ''زمیندار'' سے وابستہ رہ کر صحافت کا شوق پورا کیا اور وہ ایک اسکول کے بعد گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں پڑھایا اور پھر ۱۹۴۰ء میں محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر بن کر دہلی چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۴ء میں بحیثیت پریس اور کلچرل اتاشی مقرر ہوئے جہاں سے ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے تو کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی اور آسودہ خاک ہوئے۔

سید محمد جعفری میں صغر سنی ہی سے مزاح کی حس بہت تیز تھی اور شعر کہنے کا ملکہ بھی فطری طور پر موجود تھا، چناں چہ کم سنی ہی سے فرضی صورت حال کو شعر کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ کبھی کسی سے اصلاح نہ لی البتہ دوران ملازمت ان کا دو سال تک قیام لکھنو میں رہا تو وہاں ظریف لکھنوی، عزیز لکھنوی اور دوسرے اساتذہ کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ سید محمد جعفری، اکبر الٰہ آبادی کے بڑے مداح تھے اور انھیں اردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح ان کی نظموں کا بڑا موضوع بھی تہذیبی تضاد سے دوچار معاشرہ اور اردگرد کا ماحول ہے۔

سید محمد جعفری نہایت ذہین مزاح نگار تھے۔ ان کے یہاں مزاح کی لطافت اور شگفتگی زیادہ اور طنز کی تلخی کم ہے۔ وہ معاشرتی کرداروں اور اجتماعی زندگی کی منافقانہ صورت حال کو مزاح کے انداز میں عیاں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ''شوخیِ تحریر'' اور ''تیر نیم کش'' اور ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام کلام ''کلیات سید محمد جعفری'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نظم ''کھڑا ڈنر'' مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر کھڑا ہو کر کھانے کے نظام کی صورت حال پر لطیف طنز ہے۔

نظم کا خلاصہ

خلاصہ

شادی بیاہ کی تقریبات میں یورپ کی تقلید میں کھڑے ہو کر کھانا کھانے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ جس میں لوگ مسافروں کی طرح چلتے پھرتے کھاتے ہیں۔ شتر بے مہار کی طرح ہر جگہ منھ مارتے ہیں۔ پیٹ بھرنے کی بھاگ دوڑ فوجی پریڈ کی مانند ہوتی ہے۔ کوئی اپنی پلیٹ میں ڈش کے تمام کوفتے سمیٹ لیتا ہے تو کوئی ادھر اُدھر کے تمام کھانے اپنے پاس جمع کر لیتا ہے۔ بڑی دیر بعد میری قسمت جاگی تو مرغ کا پیس میرے اٹھانے سے پیش تر ہی رقیب لے اُڑا۔ کباب اٹھایا تو اس میں وہ گاجا الجھ گیا۔ اس دعوت کی بدنظمی دیکھ کر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ایک میز کے گرد خواتین محوِ گفت گو تھیں۔ میں منتظر تھا کہ وہ ہٹیں تو میں روٹی اٹھاؤں مگر انھوں نے میرا لحاظ نہ کیا اور میں بھوکا واپس آ گیا۔

مرکزی خیال

اہلِ یورپ کی تقلید میں دعوتوں میں کھڑے ہو کر کھانا ہمارے ہاں رواج پا رہا ہے۔ لیکن اس قسم کی دعوتوں میں افراتفری اور بدانتظامی ہوتی ہے۔ لوگ سلیقہ، تہذیب اور ادب آداب فراموش کر کے کھانے پر بھوکوں کی مانند ٹوٹ پڑتے ہیں اور دوسروں کا لحاظ بھی نہیں کرتے۔ جب کہ جو لوگ ادب، تہذیب اور شرافت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے لیے کچھ نہیں بچتا، وہ خالی پلیٹ لیے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

اشعار کی تشریح

بند نمبر 1

کھڑا ڈنر ہے غریب الدیار کھاتے ہیں — بنے ہوئے شتر بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پر ہو کر سوار کھاتے ہیں — کچھ ایسی شان سے جیسے ادھار کھاتے ہیں
شکم غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سائے میں فوجی پریڈ ہوتی ہے

حل لغت

کھڑا ڈنر (وہ کھانا جو کھڑے ہو کر کھایا جاتا ہے، بوفے سسٹم) غریب الدیار (پردیسی، مسافر) شترِ بے مہار (نکیل سے آزاد اونٹ، مراد بے قابو) شکم (پیٹ) فرسٹ ایڈ (ابتدائی طبی مدد) فوجی پریڈ (فوجیوں کی مشق)

مفہوم

کھڑے ہو کر کھانا ایسا ہے گویا بے گھر مسافر بے قابو ہو کر کھاتے ہیں۔ اپنی میز پر سوار ہو کر ایسے کھاتے ہیں جیسے ادھار کھا رہے ہوں۔ بے چارے پیٹ کو یوں بھرا جاتا ہے جیسے فوجی پریڈ ہو۔

تشریح

سید محمد جعفری اُردو ادب کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ ہنسنے ہنسانے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی در آتا ہے لیکن وہ مزاح کے پردے میں لپٹا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی کمزوریوں اور اجتماعی زندگی کی پستیوں کو ہلکے پھلکے مزاح میں بیان کرتے ہیں۔ اس نظم میں سید محمد جعفری کھڑے ہو کر کھانا کھانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مزاحیہ انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کھڑے ہو کر کھانا پڑتا ہے۔ جسے انگریزی میں عموماً بوفے کہا جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ بدتہذیبی اور مشرقی آداب کے خلاف ہے۔ چناں چہ اس نظم میں وہ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

تشریح طلب بند میں شاعر کہتا ہے کہ کھڑا ڈنر کرنے والے ندیدوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جس طرح کوئی بھوکا پردیسی جس نے کئی روز سے کھانا نہ کھایا ہو وہ کھانا دیکھتے ہی اس پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ مسافروں کی طرح چلتے پھرتے میزوں سے کھانا اس طرح پلیٹوں میں بھرتے ہیں کہ دوسروں کو کچھ لینے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ کھڑا ڈنر کرنے والے لوگ بھی تہذیب اور آداب کو بالائے طاق رکھ کر کبھی ایک میز سے کوئی چیز اٹھاتے ہیں تو کبھی دوسری میز سے۔ شترِ بے مہار (بے قابو اونٹ) کی طرح جگہ جگہ منہ مارتے پھرتے ہیں۔ ایسے ندیدوں کی طرح بے قابو ہو کر کھاتے ہیں جیسے دوبارہ کھانا نہیں ملے گا۔ بعض لوگ جو بیٹھ کر کھانے کے عادی ہوتے ہیں انھیں جب کوئی بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تو وہ میزوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور وہیں بیٹھ کر اس شان سے کھانا تناول کرتے ہیں گویا ادھار کھا رہے ہوں۔ ایک مزاحیہ شاعر اسی طرح کی ایک دعوت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

ٹائم کے ہیر پھیر نے سب کو سکھا دیا — کھانے کے انتظار نے ہم کو پکا دیا
آنتیں شکم میں کرنے لگی تھیں اتھل پتھل — میزوں پہ تھی سجی ہوئی ہر چیز برمحل
بریانی، قورما، دہیں روٹی اغل بغل — چٹنی اچار رائتہ اور چاٹ کے تھے پھل
اسٹال میں سجی ہوئی ہر شے عظیم تھی — کوفی تھی کولڈ ڈرنک تھی آئسکریم تھی
کھانا شروع کرنے کا اعلان جب ہوا — ہر سمت جیسے حشر کا عالم ہوا بپا
کیسی سلاد، کس کا اچار اور رائتہ — اک شخص نے پلیٹ میں، ڈونگا پلٹ دیا

بعض لوگ کئی دنوں سے بھوکے ہوتے ہیں وہ اپنے فاقہ زدہ پیٹ کو فرسٹ ایڈ یعنی ابتدائی طبی امداد اس طرح دیتے ہیں جیسے فوجی پریڈ ہو رہی ہو۔ فرسٹ ایڈ (ابتدائی طبی امداد) کا مطلب وہ معمولی مرہم پٹی ہے جو کسی زخمی کو ایمرجنسی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ گویا فاقہ زدہ غریب کے پیٹ میں اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود معمولی سا کھانا گیا جس سے اس کا پیٹ تو نہ بھرا اور نہ بھوک ہی مکمل مٹ سکی البتہ یہ تسلی ہوئی کہ وہ ڈنر میں شریک تھا۔ چناں چہ وہ وقتی خوشی محسوس کرتا ہے۔ ''فوجی پریڈ'' کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ دعوت میں ایک افراتفری مچی ہوتی ہے۔ سبھی جلد از جلد اپنے پیٹ کو کھانے سے بھرنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ جیسے انھیں پہلی بار کھانا ملا ہو اور دوبارہ کبھی نصیب نہ ہوگا۔ بقول شاعر:

پھر دیکھتے دیکھتے ہی بھگدڑ سی مچ گئی — ایسا لگا کہ ہاتھ سے وقت پھسل گیا
میں نے کہا کہ بھائیو موقع تو دیکھیے — کہنے لگے کہ ہٹ پرے موقع محل گیا

دراصل شاعر مزاح کے پردے میں اس قسم کی دعوتوں میں افراتفری اور بدانتظامی کی مذمت کرتا ہے۔ شاعر نے مغربی تہذیب و معاشرت اور طرزِ زندگی کی اندھا دھند تقلید اور پیروی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ انسانی زندگی کے بے شمار ایسے پہلو ہوتے ہیں جن میں ہماری اپنی مقامی اور ملکی رسوم و رواج اور طرزِ عمل ہی ہمارے لیے سودمند ہے۔

اپنی مٹی ہی پہ چلنے کا سلیقہ سیکھو — سنگِ سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

شاعر نے اس بند میں انگریزی الفاظ ''ڈنر''، فرسٹ ایڈ اور'' ''پریڈ'' استعمال کیے ہیں۔ انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال سے اشعار میں مزاح کی چاشنی بڑھ گئی ہے۔ ''غریب الدیار'' کی تشبیہ بہت بلیغ ہے۔ جس سے ان لوگوں کی تصویر کشی گئی ہے جو جسمانی یا روحانی طور پر اپنے وطن، تہذیب اور کلچر سے دور ہیں اور مغربی طور طریقوں کے دلدادہ ہیں۔ ''شترِ بے مہار'' اُردو کا مشہور محاورہ ہے، جس سے دعوتوں میں ہونے والی بدانتظامی کی خوب عکاسی ہوتی ہے۔ الغرض یہ بند فنی محاسن سے بھرپور ہے۔

بند نمبر 2

کھڑے ہیں میز کنارے جو ایک پلیٹ لیے — انھی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
ادھر ادھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے — کھڑا تھا پیچھے سو میں رہ گیا پلیٹ لیے
یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہوگا
''پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا''

حل لغت

کوفتے (کھانے کی ایک ڈش کا نام) پلاؤ (چاول اور گوشت ملا کھانا) احباب (دوست) فاتحہ ہوگا (میت کے ایصالِ ثواب کے لیے سورہ فاتحہ پڑھنا)

مفہوم

میز کے کنارے ایک صاحب جو پلیٹ لیے کھڑے ہیں انھوں نے تمام کوفتے اور اِدھر اُدھر کے کھانے

اپنی پلیٹ میں سمیٹ لیے ہیں، جب کہ میں پیچھے خالی پلیٹ لیے کھڑا رہ گیا۔ یہ تمام میز خالی ہوگئی اب پلاؤ کھا...
گویا کسی کی فاتحہ ہو۔

تشریح

سید محمد جعفری اُردو ادب کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ ہنسنے ہنسانے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی در آتا ہے لیکن وہ مزاح کے پردے میں لپٹا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی کمزوریوں اور اجتماعی زندگی کی پستیوں کو ہلکے پھلکے مزاح میں بیان کرتے ہیں۔ اس نظم میں سید محمد جعفری کھڑے ہو کر کھانا کھانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مزاحیہ انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کھڑے ہو کر کھانا پڑتا ہے۔ جسے انگریزی میں عموماً بوفے کہا جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ بدتہذیبی اور مشرقی آداب کے خلاف ہے۔ چناں چہ اس نظم میں وہ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

تشریح طلب بند میں شاعر کہتا ہے کہ کھڑے ہو کر کھانا کھانے میں ایک قباحت یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا کھانا خود پلیٹ میں ڈالنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں ضیافتوں میں عموماً لوگ ندیدوں کی طرح کھاتے ہیں اس لیے جس کا بھی داؤ لگے وہ اچھی چیزیں اپنی پلیٹ میں ٹھونس لیتا ہے، چاہے دوسروں کے لیے کچھ نہ بچے اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔ چناں چہ شاعر کہتے ہیں کہ میز کے کنارے جو صاحب کھڑے ہیں انھی نے سب کوفتے اپنی پلیٹ میں بھر لیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے سے بھی اچھے اچھے سب کھانے اپنی پلیٹ میں سمیٹ لیے ہیں اور تمام ڈشیں خالی کر دی ہیں۔ جس کی وجہ سے دوسروں کے لیے کچھ نہیں بچا۔ شاعر اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ میں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا، شرم، شرافت اور لحاظ کے باعث میں خالی پلیٹ لیے رہ گیا، میری باری ہی نہیں آئی۔ کھانے کی سب ڈشیں اور میزیں خالی ہوگئی تھیں۔ میں سب کا منہ تکتا رہ گیا۔ بقول شاعر:

ہم یوں بھٹک رہے تھے کہ جیسے حقیر ہوں — خالی پلیٹ ساتھ تھی جیسے فقیر ہوں
بفے دعوت پہ بلوایا گیا ہوں — پلیٹیں دے کے بہلایا گیا ہوں

بھوکے پیٹ جاتے ہوئے شاعر اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلاتا ہے کہ اب جب کسی کے مرنے پر فاتحہ ہوگی تب دوست پلاؤ کھائیں گے تو مجھے بھی نصیب ہوگا۔ میرے مرنے کے بعد بھی یہی کچھ ہوگا کہ میرے دوست پلاؤ کھا رہے ہوں گے۔

ہوگئی قورمے اور قلیے سے خالی دنیا — رہ گئی مرغ پلاؤ کی خیالی دنیا

آخری شعر اُردو کے مشہور مزاحیہ شاعر اکبرالہ آبادی کے شعر کی تضمین ہے جسے شاعر نے کمال مہارت سے اس بند میں ... ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

دراصل شاعر مزاح کے پردے میں اس قسم کی دعوتوں میں افراتفری اور بدانتظامی کی مذمت کرتے ہیں۔ جو لوگ تہذیب اور ادب آداب فراموش کر کے کھانے پر بھوکوں کی مانند ٹوٹ پڑتے ہیں اور دوسروں کا لحاظ بھی نہیں کرتے جبکہ ادب، تہذیب اور شرافت کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے لیے کچھ نہیں بچتا وہ خالی پلیٹ لیے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ ایک ... منظر کی یوں عکاسی کرتے ہیں:

وہ مہماں ہیں اگرچہ ایک دن کے — مہینے بھر کا کھانا کھا گئے ہیں
وہ اپنی ذات میں یوں انجمن ہیں — کہ دسیوں کا وہ تنہا کھا گئے ہیں
وہ بعد از مرغ بریانی کباب بش — کڑاہی بھر کے حلوہ کھا گئے ہیں
بچا کچھ بھی نہیں ان کی زد سے — کہ جو کچھ بھی بچا تھا کھا گئے ہیں

اس بند میں شاعر نے نہایت خوب صورت طریقے کا استعمال کیا ہے کہ "پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا" یعنی جب کھانے کی میز خالی ہوگئی تو اب کیا ہوگا، یہی ہوگا کہ احباب پلاؤ کھا کر فاتحہ پڑھیں گے۔ گویا کوئی بھی چیز باقی نہیں بچی۔ "پلیٹ لیے"، "سمیٹ لیے" کے قافیے اور ردیف نہایت برمحل ہیں، ان سے نہ صرف صوتی حسن پیدا ہوا ہے بلکہ یہ صورت میں لوگوں کی خود غرضی اور لالچ کی منظر کشی بھی بھرپور کرتے ہیں۔

بند نمبر 3

تھی ایک مرغ کی ٹانگ اور رقیب لے بھاگا — مرا نصیب بھی جاگا، پر دیر میں جاگا
کباب اٹھایا تو اس میں لپٹ گیا دھاگا — ڈنر یہ کیا کہ دو پہر سے جس کا لے آگا
یہ کیا خبر تھی میں آیا تھا جب ڈنر کھانے
"حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے"

حلِ لغت

رقیب (دشمن، مقابل) نصیب بھی جاگا (قسمت جاگی، خوش قسمتی) پہ (پہ لیکن) نے (نہ، یہاں معنی نہ ہے) آگا (آگے، سامنے)، افسانے (جھوٹے قصے)

مفہوم

مرغ کی ایک ٹانگ میرے رقیب نے اٹھالی، میری قسمت ذرا دیر سے جاگی۔ میں جو کباب اٹھانے لگا تو اس میں بھی دھاگا لپٹ گیا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیسا ڈنر ہے۔ جب میں یہاں آیا تھا تو کیا کچھ سوچ کر آیا تھا۔ کھڑا ڈنر کی حقیقت یہاں آکر دیکھی ہے۔

تشریح

سید محمد جعفری اُردو ادب کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ ہنسنے ہنسانے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی در آتا ہے لیکن وہ مزاح کے پردے میں لپٹا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی کمزوریوں اور اجتماعی زندگی کی پستیوں کو ہلکے پھلکے مزاح میں بیان کرتے ہیں۔ اس نظم میں سید محمد جعفری کھڑے ہو کر کھانا کھانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مزاحیہ انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کھڑے ہو کر کھانا پڑتا ہے۔ جسے انگریزی میں عموماً بوفے کہا جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ بدتہذیبی اور مشرقی آداب کے خلاف ہے۔ چناں چہ اس نظم میں وہ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

تشریح طلب بند میں شاعر کہتا ہے کہ کھڑا ڈنر میں ہر شخص اپنی اپنی پلیٹ بھرنے میں مصروف تھا۔ میں خالی پلیٹ لیے اپنی باری کے انتظار میں تھا کہ میری باری آئے اور میں بھی کچھ کھانے کے لیے لوں۔ ڈش میں مرغی کی صرف ایک ٹانگ بچی تھی۔ ابھی میں اسے لینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرا دشمن اور مقابل شخص تیزی سے آیا اور اسے اٹھا کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میری قسمت جاگی تو مجھے سیخ کباب کی ایک ڈش نظر آئی۔ لیکن جب میں نے کباب اٹھانے کی کوشش کی تو اس میں دھاگا لپٹ گیا۔ جس کی وجہ سے کباب کا بھرتہ قیمہ بن گیا اور وہ نیچے گر گیا۔ بقول شاعر:

کبابوں کی رکابی ڈھونڈنے کو — کئی میلوں میں دوڑایا گیا ہوں
برائے قتل قتلہ ہائے ماہی — چھری کانٹے سے لڑوایا گیا ہوں (سید ضمیر جعفری)

الغرض میری سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کیسی دعوت تھی کہ جس کا نہ کوئی سر تھا نہ پاؤں، نہ آغاز تھا نہ انجام۔ جس میں کوئی اد...

آداب اور کسی کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ نہ کوئی اصول تھا اور نہ کوئی اخلاقیات تھی۔ بس چھینا جھپٹی تھی اور ایک دوسرے سے زیادہ پلیٹ بھر لینے کا مقابلہ تھا۔ لوگوں نے گنجائش سے زیادہ کھانا پلیٹوں میں ٹھونس لیا تھا جس کی وجہ سے بہت سا کھانا ضائع ہو رہا تھا۔ ایک اور مزاحیہ دعوت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

کوئی تو تھا کباب کے پیچھے پڑا ہوا   مرغے کی ٹانگ لینے پہ کوئی اڑا ہوا
ڈش کے قریب کوئی تھا ایسے کھڑا ہوا   کھمبے کی طرح جیسے زمیں میں گڑا ہوا
بریانی کی طلب میں بھٹکتا ہوا کوئی   بوٹی بنا چبائے نگلتا ہوا کوئی
آئے کباب سیخ تو ہتھیا گیا کوئی   پلّے پڑا نہ کچھ بھی تو جھلا گیا کوئی

شاعر مزید کہتا ہے کہ شاید میری قسمت میں اس دعوت کا کھانا نہیں تھا۔ حالاں کہ میں دعوت میں کھانا کھانے کے لیے آیا تھا۔ اس تقریب کی کہانی کی یہی سچائی ہے ورنہ جب میں یہاں آیا تھا، اپنے جی میں نجانے کیا کچھ سوچ کر آیا تھا۔ لیکن مجھے کھانا نصیب نہیں ہوا۔ بقول شاعر:

شہر میں گوشت کی خاطر صفتِ جام پھرے   ہم پھرے، جملہ اعزّا پھرے، خدام پھرے
جس جگہ پہنچے اس کوچے سے ناکام پھرے   ''مخملِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے''
(سید محمد جعفری)

آخری شعر دراصل ہندوستان کے مشہور شاعر، شاعر لکھنوی کے شعر کی تضمین ہے جسے شاعر نے کمال مہارت سے اس بند میں استعمال کیا ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

عدم کے دوش پہ قائم ہے کائناتِ وجود   حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے   (شاعر لکھنوی)

اس بند میں شاعر نے بہت جان دار اور برمحل قافیے استعمال کیے ہیں جن سے نہ صرف اشعار کی موسیقیت اور روانی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ مزاح کی چاشنی بھی بڑھتی ہے۔ اسی طرح ''ڈنر یہ کیا کہ نہ پیچھا ہے جس کا نے آگا'' ایک زبردست کنایہ ہے، جو اس تقریب کی بے ترتیبی اور بدانتظامی کو ظاہر کرتا ہے۔ بند کا آخری مصرع نہایت بلیغ ہے کہ حقیقتوں کو افسانے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہم زندگی کی تلخ حقیقتوں کو افسانوں اور مزاح کے ذریعے برداشت کر رہے ہیں۔

بند نمبر 4

وہ ایک میز خواتین گرد صف آرا   لبوں سے ان کے رواں گفت گو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما کھڑا ہوں بیچارہ   کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ
اسیر حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

حل لغت

صف آرا (قطار بنانا) لبوں (لب کی جمع، ہونٹ) رواں (جاری ہے) گفت گو کا فوارہ (گفت گو کی دھار) گوشے (کونے) سہما (ڈرا ہوا) نان کا پارہ (روٹی کا ٹکڑا) اسیر (قیدی) حلقۂ خوباں (خوب صورت عورتوں کا گروہ) مرغ و ماہی (مرغی اور مچھلی) ستم ہا (بہت زیادہ ظلم و جفا) کم نگاہی (بے اعتنائی، بے توجہی)

مفہوم

ایک میز کے گرد خواتین ہجوم کی صورت کھڑی محو گفت گو تھیں۔ جب کہ میں ایک گوشے میں سہما ہوا منتظر تھا کہ وہ ہٹیں تو میں روٹی کا ٹکڑا اٹھاؤں۔ مرغ اور مچھلی خواتین کے ہجوم میں قید تھے جب کہ میں ان کی بے توجہی سے بھوک کے مارے شہید ہو گیا۔

تشریح

سید محمد جعفری اُردو ادب کے معروف مزاحیہ شاعر ہیں۔ وہ ہنسنے ہنسانے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی در آتا ہے لیکن وہ مزاح کے پردے میں لپٹا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی کمزوریوں اور اجتماعی زندگی کی پستیوں کو ہلکے پھلکے مزاح میں بیان کرتے ہیں۔ اس نظم میں سید محمد جعفری کھڑے ہو کر کھانا کھانے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی مزاحیہ انداز میں عکاسی کرتے ہیں۔ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات میں مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام ایسا ہوتا ہے کہ انھیں کھڑے ہو کر کھانا پڑتا ہے۔ جسے انگریزی میں عموماً بوفے کہا جاتا ہے۔ شاعر کے نزدیک یہ بدتہذیبی اور مشرقی آداب کے خلاف ہے۔ چناں چہ اس نظم میں وہ اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

تشریح طلب بند میں شاعر دعوت میں آئی ہوئی خواتین کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ خواتین عموماً کسی بھی تقریب میں زرق برق لباس میں ملبوس اور خوب تیار ہو کر جاتی ہیں۔ پھر جب ایک دوسری سے ملتی ہیں تو ایک دوسری کے لباس، فیشن اور میک اپ وغیرہ پر تبصرہ کرتی رہتی ہیں۔ انھیں ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کا بھی خوب موقع مل جاتا ہے۔ بعض اوقات بچے بھی ان کے ساتھ آئے ہوتے ہیں۔ ایک شاعر اس طرح کی محفل کا یوں نقشہ کھینچتا ہے:

کچھ عورتوں کے ساتھ میں بچے تھے چلبلے   کس باپ کے سپوت تھے کس گود کے پلے
نو دس برس کے سن میں یہ ہمت یہ ولولے   کس کی مجال ان سے کوئی ڈونگا چھین لے
مرغے کی ٹانگ پھینک دی آدمی چچوڑ کر   بریانی پر جھپٹ پڑے روٹی کو چھوڑ کر
کوئی تو لے رہا تھا مزا رس ملائی کا   تھپڑ کسی نے کھا لیا دستِ حنائی کا

چناں چہ شاعر بیان کرتا ہے کہ اس دعوت میں خواتین مدعو تھیں جو زرق برق لباس میں ملبوس خوب تیار ہو کر آئیں تھیں۔ وہ سب ایک میز کے گرد جمگھٹا بنائے کھڑی تھیں اور آپس میں محوِ گفت گو تھیں۔ ان کی باتیں تھیں کہ ختم ہونے کو نہیں آتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے منھ سے گفت گو کا فوارہ رواں تھا۔ جب کہ میں ایک گوشے میں سہما ہوا کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ کب ان کی گفت گو ختم ہو اور کب یہ اپنے حصے کا کھانا پلیٹ میں ڈال کر یہاں سے ہٹیں اور کب میں روٹی کا ٹکڑا اٹھاؤں، لیکن وہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ایک اور شاعر کہتے ہیں:

چمچوں کی کھینچ تان، پلیٹوں کی دوڑ میں   شانوں سے عورتوں کے دوپٹہ پھسل گیا
دیکھا جو بیبیوں کا جھپٹنا کباب پر   اکبرو ہیں پہ غیرتِ قومی سے گل گیا

خواتین کے جھرمٹ کے درمیان میز پر مرغ کے پیس اور مچھلی کے پیس ایسے لگ رہے تھے جیسے وہ ان خواتین کے درمیان قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ یعنی میز پر مرغ اور مچھلی حسینوں کے جھرمٹ میں قید تھی اور میں ان خواتین کے وہاں سے ہٹنے کا منتظر تھا اور سوچ رہا تھا کہ شاید انھیں میں کھڑا ہوا نظر آ جاؤں اور یہ میری مراد سمجھ کر خود ہی یہاں سے ہٹ جائیں۔ لیکن انھوں نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ ان کی کم نظری، بے اعتنائی اور بے توجہی کے ظلم کے سبب ہم بھوکے مر گئے گویا شہیدِ کم نگاہی ہو گئے۔ بقول شاعر:

پلّے جب اپنے کچھ نہ پڑا بھاگ دوڑ کر   حسرت بھری نگاہ سے کھانے کو چھوڑ کر
ہم نے سلاد کھا لیا نیبو نچوڑ کر   ویٹر سے پانی مانگا جو پھر ہاتھ جوڑ کر
غصے سے پانی پھر گیا اس وقت پیاس پر   چاروں طرف سی تھی لپ سٹک گلاس پر

اس بند کے قافیے نہایت جان دار اور رواں ہیں۔ عمدہ تشبیہات اور تراکیب نے اشعار کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔ جب کہ رعایتِ لفظی نے مزاح کی چاشنی میں اضافہ کیا ہے۔ ''گفت گو کا فوارہ، اسیرِ حلقۂ خوباں، اور ''شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی'' کی تشبیہات

نہایت بلیغ ہیں۔ مرغ و ماہی کی ترکیب بھی لطف کا باعث ہے۔ الغرض یہ بند مزاح سے بھرپور ہے اور دعوت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔

مشقی سوالات

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) ''کھڑا ڈنر'' کون کھاتے ہیں؟

جواب: شاعر کے مطابق کھڑا ڈنر غریب الدیار لوگ کھاتے ہیں۔

(ب) ''پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا'' کس شاعر کے کلام سے تضمین کی گئی ہے؟

جواب: یہ اُردو کے مشہور شاعر اکبرالہ آبادی کے شعر کی تضمین ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

بتاؤں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

(اکبرالہ آبادی)

(ج) مرغ کی ٹانگ کون لے بھاگا؟

جواب: شاعر کے مطابق مرغ کی ٹانگ رقیب لے بھاگا۔

(د) ''شتر بے مہار'' سے کیا مراد ہے؟

جواب: شتر بے مہار سے مراد بے قابو ہو جانا ہے۔ یعنی کھڑا ڈنر میں لوگ ایسے ندیدوں کی طرح بے قابو ہو کر کھاتے ہیں جیسے دوبارہ کھانا نہیں ملے گا۔

(ہ) گفت گو کا فوارہ کن کے لبوں سے رواں تھا؟

جواب: میز کے گرد قطار بنائے جو خواتین کھڑی تھیں، ان کے لبوں سے گفت گو کا فوارہ رواں تھا۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) ''ادھار کھانا'' اردو قواعد کی رو سے ہے:

(الف) ضرب المثل (ب) محاورہ (ج) روزمرہ (د) تلمیح

(ب) فوجی پریڈ ہوتی ہے:

(الف) شجر کے سائے میں (ب) ڈنر کے سائے میں (ج) تلواروں کے سائے میں (د) دیوار کے سائے میں

(ج) مرغ کی ٹانگ لے بھاگا:

(الف) رقیب (ب) حریف (ج) نوجوان (د) بچہ

(د) ''آ گا پیچھا'' اردو قواعد کی رو سے ہیں:

(الف) ذو معنی الفاظ (ب) مرکب عطفی (ج) متضاد الفاظ (د) مترادف الفاظ

(ہ) ''حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے'' کے شاعر کا نام ہے:

(الف) افتخار عارف (ب) شاعر لکھنوی (ج) سلطان اختر (د) باقی صدیقی

۳۔ نظم کھڑا ڈنر میں شاعر نے کس طرح مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟

جواب: نظم کھڑا ڈنر میں شاعر نے منظر نگاری، واقعہ نگاری، انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال، غزلیہ تراکیب، اشعار کی تضمین اور بے ساختگی جیسے عناصر سے مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

۴۔ ذیل میں دیے گئے الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں:

غریب الدّیار، شکم، رقیب، حقیقت، صف آرا، کم نگاہی

جواب:

الفاظ و تراکیب	معانی	جملے
غریب الدّیار	وطن سے دور	غریب الدیار کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔
شکم	پیٹ	شکم کو بھرنے کے لیے انسان کو نجانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔
رقیب	مقابل، حریف	شاعر اکثر رقیب کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔
حقیقت	سچائی	دنیا کی حقیقت یہی ہے کہ یہاں ہر چیز عارضی ہے۔
صف آرا	قطار بنائے	اسمبلی میں سب طلبہ صف آرا تھے۔
کم نگاہی	بے اعتنائی، نظر انداز کرنا	محبوب کی کم نگاہی عاشق کے لیے جان لیوا ہوتی ہے۔

۵۔ نظم کے متن کے مطابق مصرعے مکمل کریں:

(الف) کھڑا ڈنر ہے۔۔۔۔۔۔ کھاتے ہیں

(ب) ۔۔۔۔۔۔ غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے

(ج) کھڑے ہیں میز۔۔۔۔۔۔ جو ایک پیٹ لیے

(د) کباب اٹھایا تو اس میں۔۔۔۔ گیا دھاگا

(ہ) ۔۔۔۔۔۔ کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

جواب:

(الف) کھڑا ڈنر ہے۔۔۔ غریب الدیار۔۔۔ کھاتے ہیں

(ب) ۔۔۔ شکم۔۔۔۔ غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے

(ج) کھڑے ہیں میز۔۔۔ کنارے۔۔ جو ایک پیٹ لیے

(د) کباب اٹھایا تو اس میں۔۔ لپٹ۔۔۔۔۔ گیا دھاگا

(ہ) ۔۔۔ حقیقتوں۔۔۔۔ کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

رعایت لفظی: عبارت یا شعر میں کسی لفظ کو اس طریقے سے استعمال کرنا کہ پڑھنے یا سننے والے کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب و مفاہیم کا احساس ہو اور اس سے مزاح کا تاثر بھی پیدا ہو، رعایت لفظی کہلاتا ہے۔ جیسا کہ اکبرالہ آبادی نے کہا ہے:

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

اردو اور پنجابی کے ممتاز مزاحیہ شاعر انور مسعود نے اپنے بہت سے قطعات میں رعایت لفظی سے خوب کام لیا ہے۔ ذیل میں دیا گیا ان کا ایک مشہور قطعہ رعایت لفظی کی بہترین مثال کے ساتھ ساتھ ہمارے موجودہ حالات سے مطابقت بھی رکھتا ہے:

جو ضرب بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے تھی
ہر ضرب کرب ناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے آگئے کہ میں بلبلا اٹھا

۶۔ نظم "کھڑاؤنز" کے درج ذیل بند کی تشریح کریں:

وہ ایک میز خواتین ،گردصف آرا — لبوں سے ان کے رواں گفت گو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما کھڑا ہوں بیچارہ — کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ
اسیر حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہید ستم ہائے کم نگاہی ہیں

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

۷۔ نظم "کھڑاؤنز" کا خلاصہ لکھیں۔

جواب: دیکھیے خلاصہ نظم۔

۸۔ شامل نصاب نظم "کھڑاؤنز" چار بندوں پر مشتمل ہے۔ان میں سے پہلے دو بندوں کی ردیف کیا ہے؟ قوانی کی فہرست بھی مرتب کریں۔

جواب:

پہلے بند کی ردیف:	کھاتے ہیں،	ہوتی ہے
پہلے بند کے قوانی:	غریب الدیار، بے مہار، سوار، ادھار	فرسٹ ایڈ، پریڈ
دوسرے بند کی ردیف:	لیے،	ہوگا
دوسرے بند کے قوانی:	پیٹ، لپیٹ، سمیٹ، پلیٹ	کیا، فاتحہ

سرگرمی برائے طلبہ:

طلبہ انٹرنیٹ کی مدد سے یا اپنے کالج کی لائبریری سے طنز و مزاح کے کسی اور معروف شاعر جیسے: دلاور فگار، سید ضمیر جعفری، انشاں الحق حقی وغیرہ کی منتخب مزاحیہ نظمیں تلاش کریں اور اپنی جماعت کے کمرے میں پڑھیں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

اساتذہ کرام طلبہ کو سید محمد جعفری کی شخصیت سے متعارف کراتے ہوئے ان کی مزاحیہ شاعری کی خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔

اساتذہ کرام طلبہ کو رعایت لفظی کی تفہیم کراتے ہوئے انھیں مختلف نثری اور شعری مثالوں کی مدد سے سمجھائیں۔

حصہ غزل

(امتحانی نقطہ نظر سے)

غزل کے اشعار کی تشریح کے لیے ہدایات:

غزل کے معنی ہیں "عورتوں سے گفت گو کرنا' عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا" (بحوالہ فیروز اللغات صفحہ 979) شکار کے وقت ہرن کے منہ سے نکلنے والی دردناک آواز کو بھی غزل کہتے ہیں۔سال اوّل کے پرچہ میں غزلیات میں سے دس نمبرات پر مشتمل تین اشعار آتے ہیں۔نمبرات کی تقسیم حسب ذیل ہے۔

شاعر کا نام:	1 نمبر
تین اشعار کی تشریح:	9 نمبر

-1 غزل کے ہر شعر کی تشریح الگ الگ کرنی چاہیے، کیوں کہ غزل کا ہر شعر دوسرے سے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے منفرد ہوتا ہے۔

-2 تشریح سے قبل تشریح طلب شعر ضرور لکھنا چاہیے۔

-3 جوابی کاپی پر شاعر کا نام لکھنا نہ بھولیں۔شاعر کے نام کا املا درست ہو۔اصل نام لکھنے کی صورت میں مکمل لکھنا چاہیے، تخلص لکھ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔

-4 غزل کے ہر شعر کی معیاری تشریح ڈیڑھ سے دو صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔

-5 دورانِ تشریح اقوال، آیات، احادیث اور موزوں اشعار وغیرہ کا موقع محل کے مطابق استعمال تشریح کو مؤثر اور مدلل بنانے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔اُردو کے علاوہ دوسری زبان کے حوالے کی صورت میں چھوٹی بریکٹ میں اُردو ترجمہ بھی ضروری ہے۔حوالے کو مفہوم سے جوڑ کر بیان کرنا چاہیے۔حوالہ جات تشریح میں مناسب موقع پر استعمال نہ ہوتے ہوں تو آخر میں لکھ دیے جائیں۔مزید برآں حوالے غلط نہ ہوں۔غلط لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔

-6 غزلیات کے اشعار متنوع اور ہمہ گیر ہوتے ہیں، لہٰذا تمام پہلوؤں سے اسے پرکھنا چاہیے۔

-7 غزلیات کے اشعار میں شاعر ہمیشہ تیسرے شخص یا عاشق کی ترجمانی کرتا ہے۔لہٰذا کسی تیسرے شخص یا عاشق کے لحاظ سے اس کی تشریح کرنی چاہیے۔تاہم بعض اوقات شعر میں شاعر کا ذاتی پس منظر، نجی حالات اور ذاتی واقعات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔

شاعر
میر تقی میر
(1723-1810)

سبق ۱۸: پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

شاعر کا تعارف

میر محمد تقی نام اور میر تخلص تھا۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد علی تقی ایک درویش منش انسان تھے اور تصوف سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ میر کے والدین ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

ان سانحات کے بعد میر آگرہ کو خیر باد کہ کر دہلی آ گئے۔ دہلی میں اپنی سوتیلی والدہ کے بھائی سراج الدین احمد خان آرزو (جو خود بھی فارسی کے بہت بڑے عالم، لغت نویس اور شاعر تھے) کے پاس ٹھہرے، مگر جلد ہی آگرہ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ آگرہ میں گزرا اور پھر دہلی جا پہنچے۔ مختلف امرا کے درباروں سے منسلک رہے اور تنخواہ پاتے رہے۔ مگر وہ زمانہ سخت تباہ حالی اور بدامنی کا تھا لہٰذا میر کہیں ٹِک کر ملازمت نہ کر سکے۔ بہت سے شعرا سلطنت اودھ کی خوش حالی اور آرام طلب ماحول کے باعث لکھنؤ جا کر بس رہے تھے۔ میر بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ چلے گئے مگر وہاں پر اپنی خود پسندی کے باعث جلد ہی دربار سے علیحدہ ہو گئے۔ آخری عمر تنگ دستی میں گزری۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔ تدفین بھی وہیں ہوئی۔ ان کی قبر کے کتبے پر ان کا یہ شعر کندہ ہے:

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

میر کو ''خدائے سخن'' کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی تمام تر مروّجہ اصنافِ سخن قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، واسوخت اور غزل میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر ان کی پہچان غزل گوئی ہے۔ میر کے ذاتی تجربات ان کے گرد و پیش اور خاندان میں جاری صوفیانہ روایت نے ان کی غزل کی بنیاد رکھی۔ میر کی غزل میں احساس کی شدت، مشاہدے کی وسعت، سادگیِ بیان، بے ساختگی، رمزوایمائیت، موسیقیت و ترنم، تجربے کی گہرائی اور ندرتِ ادا کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میر کی عظمت کو ان کے بعد میں آنے والے تمام شعرا نے تسلیم کیا ہے جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے:

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

میر کی تصانیف میں چھے دیوان (اردو)، ایک دیوان (فارسی)، اردو شاعروں کا ایک تذکرہ نِکات الشعرا، ان کی خود نوشت ''ذکرِ میر'' اور چند متفرق رسائل شامل ہیں۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

پتا پتا بوٹا بوٹا ، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

حلِ لغت بوٹا (پودا) گل (پھول)

مفہوم دنیا کا ہر شخص ہماری حالتِ زار سے واقف ہے لیکن ایک صرف محبوب ہی ہماری حالت سے واقف نہیں۔

تشریح

میر تقی میر کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میر کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود ندرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میر کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت

کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر نے تشبیہ اور استعارے کے پردے میں محبوب کی بے رخی اور بے اعتنائی کا شکوہ کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی اور ہجر و فراق میں ہماری حالتِ زار، بے قراری اور تڑپ تمام دنیا کو معلوم ہے، ہر شخص ہمارے حال سے واقف ہے، ہم پر ترس کھاتا ہے اور ہمدردی کرنے کو تیار ہے لیکن جس محبوب کی وجہ سے ہماری یہ حالت ہے وہی انجان بنا ہوا ہے۔ وہی ہماری حالتِ زار، بے قراری اور تڑپ سے بے خبر ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کی بے رخی اور بے پروائی کی وجہ سے ہمارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ بقول مومن:

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

شاعر دنیا کو چمن اور اس کی مناسبت سے پتوں کو اہلِ دنیا قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چمن میں محض ایک گل یعنی محبوب ہی ہے جو میرے حال سے واقف نہیں ہے۔ ورنہ چمن کا ایک ایک پیڑ، پودا اور پتا میرے حال سے واقف ہے۔ یعنی دنیا کا کوئی شخص ایسا نہیں جسے میری حالت کی خبر نہ ہو سوائے محبوب کے۔ شاعر کو محبوب کے تغافل اور لاپروائی پر شکوہ ہے۔ بقول مرزا غالب:

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اور بقول میر تقی میر:

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

محبوب پھول کی مانند خوب صورت ہے اور وہ بس اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔ اسے اردگرد کی کچھ خبر نہیں۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ کوئی اس کی محبت میں دیوانہ ہو چکا ہے اور محبوب کی بے رخی نے اس کی کیا حالت کر دی ہے۔ اس کی کیفیت اور حالت سے سبھی واقف ہیں، لیکن صرف وہ واقف نہیں، جسے واقف ہونا چاہیے تھا۔ بقول مصحفی:

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے، کدھر ہوتا ہے

انسانی نفسیات ہے کہ جب وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس شخص کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے جسے وہ عزیز رکھتا ہو، یا جو اس کا پسندیدہ ہو۔ اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا من پسند شخص، اس کا محبوب اس کے پاس آئے اور اس کا حال پوچھے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر چاہے دنیا کے سب لوگ اس کا حال کیوں نہ پوچھیں، اس کے زخموں پر مرہم کیوں نہ رکھیں، اسے سکون نہیں ملتا۔ اسے اسی شخص کی ضرورت اور طلب رہتی ہے جو اس کے دل کے قریب ہو۔ چناں چہ شاعر محبوب کے اس رویے پر غم زدہ ہے اور شکوہ کناں ہے کہ میری حالت سے میرے گرد و نواح کی ہر چیز تو واقف ہے اور مجھ سے ہمدردی بھی کرتی ہے لیکن صرف محبوب ہی میری حالت سے بے خبر ہے، حالاں کہ اسے ہی سب سے زیادہ باخبر ہونا چاہیے۔ بقول میر تقی میر:

جھوٹے سے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر
انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو مان کر

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں ''پتا پتا'' اور ''بوٹا بوٹا'' کے الفاظ میں تکرار ہے۔ جس سے شعر کا لفظی اور صوتی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ اسی طرح ''پتا'' کا لفظ شروع میں لا کر اس کی مناسبت سے دیگر الفاظ ''بوٹا، گل، باغ'' وغیرہ لائے گئے ہیں جو صنعت مراعات النظیر ہے۔ اس کے علاوہ ''جانے نہ جانے'' کے الفاظ متضاد ہیں جو صنعتِ تضاد کا بہترین استعمال ہے۔ مصرع ثانی میں ''گل'' کا استعارہ محبوب کے لیے استعمال ہوا ہے اور ''باغ'' کا استعارہ دنیا کے لیے۔ علاوہ ازیں شعر موسیقیت اور تغزّل سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 2

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

حلِ لغت گوہرِ گوش (کان کے موتی، موتی جیسے کان) بالے (کان کا زیور، بڑی بالیاں) فلک (آسمان) چشمِ مہ وخور (چاند اور سورج کی آنکھ) خور (خورشید کا مخفف، سورج) پتلی (آنکھ کا گول سیاہ حصہ)

مفہوم اگر آسمان کے بس میں ہو تو محبوب کے گوہر جیسے نفیس کانوں کو بالے تک نہ لگنے دے کیوں کہ آسمان کی نظر میں محبوب کے کان چاند سورج کی آنکھ کا تارا ہیں۔ جنھیں کسی اضافی تکلف کی ضرورت نہیں۔

تشریح

میر تقی میر کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میر کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود نُدرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میر کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں محبوب کے کانوں کی تعریف کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے کان اتنے خوب صورت ہیں کہ گویا کان نہیں بلکہ کانوں کی جگہ گوہر لگے ہیں۔ محبوب کے کان کسی موتی کی طرح حسین ہیں۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ آسمان بھی ان کی خوب صورتی اور نزاکت کا قائل ہے۔ اگر آسمان کے بس میں ہو تو محبوب کے گوہر جیسے نفیس کانوں کو کان کے زیور بالے تک مَس نہ ہونے دے کیوں کہ آسمان کی نگاہ میں بھی محبوب کے کان چاند سورج کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ آسمان پر سب سے خوب صورت اجسام چاند سورج اور ستارے ہیں۔ آسمان کے لیے محبوب کے کان چاند سورج کی خوب صورتی سے بھی بڑھ کر ہیں۔ کانوں کا زیور بھی کانوں کی نفاست اور نزاکت پر گراں گزرتا ہے۔ ایک اور جگہ میر کہتے ہیں:

تاثیر کیا کرے سخن میر یار میں — جب دیکھو لگ رہا ہے کوئی اس کے کان سے

لفظ ''بالے'' کان کے ایک زیور کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں خواتین کان میں بڑی بڑی بالیاں پہنتی تھیں جنھیں ان کی بڑی جسامت کی وجہ سے بالے کہا جاتا تھا۔ بعض اوقات بالے کافی وزنی ہوتے تھے اور طویل عرصہ کانوں میں پہننے کی وجہ سے کانوں کے سوراخ کافی پھیل جاتے تھے۔ جو ظاہر ہے کہ عیب کا باعث بنتے تھے۔ چناں چہ شاعر کو محبوب کے خوب صورت کانوں سے بالوں کا لگنا بھی گراں گزرتا ہے۔ اردو شعری روایت میں یہ مضمون عام ملتا ہے کہ عاشق کو یہ بات بھی ناگوار لگتی ہے کہ محبوب کے حسین چہرے سے زلف ٹکرائے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتے ہیں:

تم نے زلفوں کو بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے — چوم لیتی ہے لٹک کر کبھی لب کبھی رخسار

خواتین کان میں زیور کانوں کی خوب صورتی بڑھانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے کان پہلے ہی اتنے حسین ہیں کہ گویا گوہرِ نایاب ہیں۔ انھیں کسی اضافی تکلف کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اگر میرے بس میں ہو تو محبوب کے کانوں کو بالوں کے بھی مکلّف نہ ہونے دوں۔ جو چیز قدرتی طور پر حسین اور دل کش ہو اسے کسی آرائش، بناوٹ اور مصنوعی چیزوں سے سجانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بقول شاعر:

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی — کہ دیکھو چاند کیسا خوش نما لگتا ہے بن گہنے
(مبارک شاہ آرزو)

اردو شعری روایت میں محبوب کے مختلف اعضا کی تعریف کرنا معروف ہے۔ محبوب کے لب و رخسار، آنکھوں، زلفوں اور دانتوں کی تعریف تو بہت عام ہے۔ میر تقی میر نے اس شعر میں محبوب کے کانوں کی تعریف کی ہے اور کانوں کے حسن کو اجاگر کیا ہے۔ میر کہتے ہیں:

گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے — مل گیا جو صبح کو گوہر کسی کے کان کا
لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے — شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے
دیکھی تھی تیرے کان کے موتی کی اک جھلک — جاتی نہیں ہے اشک کی رخسار کے ڈھلک

میر تقی میر نے اپنے اشعار میں ایسے مضمون لکھے ہیں جو ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی نے نہیں لکھے۔ ان اشعار میں معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے بہترین نمونے ہیں۔ الفاظ، استعارے، روزمرہ، محاورے اور ہندی، فارسی اور عربی تراکیب کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ہر شعر کثیر المعنی ہے۔

شعر میں ''گوہرِ گوش'' خوب صورت تشبیہ ہے۔ ''گوہر'' اور ''گوش'' کے الفاظ میں حرف ''گ'' کی تکرار نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ''چشمِ مہ وخور کی پتلی کا تارا'' کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں۔

شعر نمبر 3

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

حلِ لغت جی (دل) زیاں (نقصان) وارا (فائدہ)

مفہوم عاشق جیسا سادہ لوح اور معصوم بھی کوئی نہیں ہے کہ جو عشق میں اپنی جان کے نقصان کو بھی فائدہ سمجھتا ہے۔

تشریح

میر تقی میر کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میر کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میر کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود نُدرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میر کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر عاشق کی سادگی بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عاشق محبوب کے عشق میں بھولا بھالا اور سادہ ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے نفع و نقصان کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ وہ محبوب کی محبت میں اتنا دیوانہ ہوتا ہے کہ اسے اپنا نقصان بھی فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ عشق میں سب سے بڑا نقصان ''جی کے زیاں'' کا ہوتا ہے۔ یعنی دل کا نقصان ہو جاتا ہے۔ مراد یہ کہ دل عاشق کے قابو میں نہیں رہتا، اسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہتا۔ اس کا دِل بے اختیار اسے بار بار محبوب کے در پر کھینچ لے جاتا ہے۔ محبوب کی بے رخی، سرد مہری، طعن و تشنیع اور برا بھلا کہنے پر بھی اس کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوتی۔ الغرض عاشق کی اپنی کوئی خواہش، انا اور خودداری باقی نہیں رہتی۔ عاشق اسے اپنے عشق کی صداقت کی علامت سمجھتا ہے کہ محبوب کی خاطر اس نے دل کی یہ قربانی دی ہے۔ جب کہ محبوب کو اس کی کسی قربانی کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ بقول شاعر:

تو بھی سادہ ہے کبھی چال بدلتا ہی نہیں — ہم بھی سادہ ہیں اسی چال میں آجاتے ہیں
(افضل خان)

چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ عاشق سا سادہ بھی کوئی دنیا میں ہوگا کہ محبت میں دل کی بازی ہار جاتا ہے۔ دل کے اس نقصان کو بھی وہ اپنا فائدہ خیال کرتا ہے۔ محبت میں دل سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، تکلیفیں برداشت کرتا ہے لیکن مایوس نہیں ہوتا بلکہ اسی میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔ بقول میر درد:

درد جو کرے ہے جی کا زیاں — فائدہ اس زیاں میں کچھ ہے

اور بقول یامین غوری:

نقصان ہوا کیا مجھے اس کارِ وفا میں　　میں عشق میں کھویا، مرا حاصل بھی وہی ہے

''جی کا زیاں'' سے مراد جان کا نقصان یعنی جان قربان کرنا ہے۔ عاشق محبوب کی محبت میں ہر قربانی دیتا ہے۔ وہ ہر تکلیف اور بھوک پیاس برداشت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک یہ جانا بھی نقصان نہیں بلکہ ایک طرح کا فائدہ ہے۔ بقول شاعر:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا　　(مرزا غالبؔ)

جان قربان کرنے سے اس کے عشق کی صداقت ثابت ہوجاتی ہے اور عاشق محبوب کی نظروں میں سرخرو ہوجاتا ہے۔ عاشق کے لیے یہ ایک بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ محبوب کی نظروں میں اس کے عشق کی صداقت ثابت ہوجائے۔ اس کے لیے محبوب کی رضا اور خوش نودی اپنی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ جان کے نقصان کو بھی اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔ بقول شاعر:

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے　　(مرزا غالبؔ)

شاعر کو عاشق کے حال پر ترس آرہا ہے کہ عاشق جیسا سادہ دل اور بھولا بھالا دنیا میں کوئی انسان نہیں۔ عشق میں وہ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتا ہے لیکن پھر بھی محبوب کو بُرا بھلا نہیں کہتا بلکہ محبوب کی جانب سے ملنے والے ہر زخم کو خوشی خوشی قبول کرتا ہے اور اسے اپنے عشق کی صداقت سمجھتا ہے۔ گویا اپنے نقصان کو بھی فائدہ سمجھتا ہے۔

شعر میں لفظ عاشق کی تکرار ہے۔ شاعر نے ''سادہ''، ''زیاں'' اور ''وارا'' جیسے الفاظ استعمال کر کے عاشق کی سادگی اور عشق کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ زیاں (فارسی) کے مقابل وارا (ہندی) لفظ کو متضاد کے طور پر لایا گیا ہے۔ میر نے فارسی اور ہندی متضاد الفاظ لا کر صنعتِ تضاد کا کیا خوب استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ سے شعر میں ایک خاص تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ یہ شعر محبت کی گہرائی اور عاشق کی معصومیت کی عکاسی کرتا ہے۔

شعر نمبر 4

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

حلِ لغت چارہ گری (علاج کرنا، تدبیر کرنا) بیماریِ دل (دل کی بیماری، عشق کا روگ) رسمِ شہرِ حسن (حسین لوگوں کے شہر کا طور طریقہ، مراد محبوب کا شیوہ) دلبرِ ناداں (نادان محبوب) چارہ (علاج)

مفہوم دل کا علاج حسن والوں کا شیوہ ہی نہیں ہے ورنہ ناسمجھ محبوب بھی عشق کے درد کا علاج جانتا ہے۔

تشریح

میر تقی میرؔ کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میرؔ کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میرؔ کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود ندرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میرؔ کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریحِ طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ دل کی بیماری یعنی عشق کے روگ کا علاج ہر محبوب کو معلوم ہوتا ہے۔ محبوب کی ایک نظرِ کرم، اس کا محبت کا ایک بول عاشق کے دل کے روگ کا علاج ہے۔ لیکن محبوب عاشق پر نظرِ کرم نہیں ڈالتا۔ وہ اپنے غرور اور انا میں مگن رہتا ہے۔ اس پر عاشق کی کسی آہ وزاری اور فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ دل کی بیماری کا علاج یعنی عاشق

پر کرم کرنا حسن والوں کا شیوہ ہی نہیں ہے۔ ورنہ نادان سے نادان محبوب بھی اس درد کا علاج جانتا ہے۔ بقول شاعر:

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے　　(غالبؔ)

محبوب کے عشق میں دل بہت بے چین رہتا ہے۔ عاشق اس کے ہجر و فراق میں ہر لمحہ مضطرب اور بے قرار رہتا ہے۔ اگر محبوب چاہے تو عاشق کے دل کا علاج بہت آسان ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ محبوب محبت بھری نظر سے دیکھ لے یا اس کی حالت کے بارے میں صرف دریافت ہی کرلے۔ عاشق کے لیے یہ بھی بہت خوشی کی بات ہے۔ یہ علاج اتنا آسان ہے کہ ایک ناسمجھ اور نادان محبوب بھی اس سے واقف ہے۔ لیکن اہلِ حسن یعنی محبوب کے شہر میں ایسا کوئی رواج نہیں کہ عاشق پر رحم کیا جائے اور اس کی حالتِ زار کے بارے میں اس سے دریافت کیا جائے۔ بقول فیض احمد فیضؔ:

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا　　ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے
(فیض احمد فیضؔ)

اور بقول عزیز قیسی:

اک تمھیں ہم سے کھچے ہو ورنہ　　چاہنے والوں کو سبھی چاہتے ہیں

''رسمِ حسنِ شہر'' کا مطلب ہے حسن کے شہر کا رواج اور روایت۔ اس سے مراد حسن والوں کی عادت اور مزاج ہے۔ یعنی محبوب عاشق کے کسی دکھ، درد کو اہمیت نہیں دیتا۔ محبوب اس سے بے نیاز اور لاپروا ہوتا ہے۔ حسن و جمال کی دنیا میں دل کے درد کا علاج کرنا معمول نہیں ہوتا۔ یہ نہ وہاں کی رسم ہے نہ ریت۔ شاعر نے عاشق کی روایتی آہ و زاری کا تذکرہ کیا ہے۔ عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ محبوب بھی محبت کا جواب محبت سے دے۔ لیکن عاشق کی یہ مراد کبھی پوری نہیں ہوتی۔ چاہے وہ محبوب کے لیے کتنی ہی قربانیاں دے، لیکن محبوب اس کے زخموں پر مرہم نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ سرد مہری، سنگ دلی اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ گویا اس کے مزاج ہی میں نہیں کہ وہ عاشق کے زخموں پر مرہم رکھے۔ بقول شاعر:

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
(مومن خان مومنؔ)

شعر میں لفظ ''چارہ گری، بیمارئ دل، درد اور چارہ'' جیسے الفاظ ایک ہی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ صنعت مراعات النظیر کا خوب صورت استعمال ہے۔ ''بیمارئ دل'' اور ''رسمِ شہرِ حسن'' نہایت بلیغ تراکیب ہیں۔ اسی طرح ''دلبرِ ناداں'' کی ترکیب محبوب کی لاپروائی کو ظاہر کرتی ہے۔

شعر نمبر 5

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

حلِ لغت مہر و وفا (محبت اور وفاداری) لطف و عنایت (مہربانی اور کرم) واقف (جاننا) طنز (طعنہ، چبھتی ہوئی بات کہنا) کنایہ (پوشیدہ بات، مبہم بات) رمز (اشارہ، آنکھوں یا بھنوؤں سے اشارہ کرنا)

مفہوم محبوب طنز و طعنہ سے تو واقف ہے لیکن محبت و الفت اور لطف و کرم سے واقف نہیں ہے۔

تشریح

میر تقی میرؔ کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میرؔ کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میرؔ کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود ندرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے

معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میرؔ کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب دل جلانے اور تڑپانے کا ہر فن جانتا ہے۔ لیکن دل کو سکون پہنچانے اور اسے تسلی دینے سے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ بات بات پر طنز تو کرتا ہے، طعنہ دیتا ہے، اشارے کنائے میں دل پر نشتر چبھوتا ہے، لیکن وہ محبت و مروت، لطف و کرم اور عنایت جیسی صفات سے ایسا بے خبر ہے جیسے وہ انھیں جانتا ہی نہیں۔ وہ محبت کے جذبات سے عاری ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ محبت و مہربانی اور وفاداری کسے کہتے ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے۔

؎ آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی
(وزیر علی صبا لکھنوی)

شاعر کو محبوب سے توقع ہے کہ کبھی وہ بھی اس کے ساتھ محبت و الفت سے پیش آئے اور حسنِ اخلاق سے اس کے ساتھ گفت گو کرے۔ اس پر مہربانی اور لطف و عنایت کرے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا، محبوب شاعر کی توقعات پر پورا نہیں اترتا۔ مہر و محبت کے برعکس محبوب ہر بات پر طنز کرتا ہے، طعنہ دیتا ہے، اشارے کنائے میں برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ عاشق کی سرزنش کرتا ہے۔ اس کے جذبات مجروح کرتا ہے۔ گویا وہ ان سب چیزوں سے اچھی طرح واقف ہے جن سے عاشق کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اگر واقف نہیں تو عاشق کے دل کی خوشی اور آرام و سکون سے واقف نہیں۔ چناں چہ محبوب نے وہی کچھ کرنا ہے جس سے وہ اچھی واقف ہے اور جس فن میں وہ ماہر ہے۔ بقول احمد فراز:

؎ دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اور بقول وسیم بریلوی:

؎ دکھ اپنا اگر ہم کو بتانا نہیں آتا تم کو بھی تو اندازہ لگانا نہیں آتا

کلاسیکی شاعری میں محبوب کو ظالم، بے وفا، سرد مہر اور بے پروا دکھایا جاتا ہے، جو عاشق کی کسی بات پر کان نہیں دھرتا۔ عاشق کی آہ و فریاد اس پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ وہ محبت و الفت اور مہربانی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ عاشق کی وفاداری اور قربانیوں کا اسے کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ عاشق بے چارہ مظلوم بنا محبوب کی ایک نظرِ کرم، ایک توجہ اور ایک میٹھے بول کی چاہ میں در در بھٹکتا رہتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ جس سے وہ محبت کرتا ہے اس سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی محبت کی قدر کرے، اور محبت کا جواب محبت سے دے۔ ورنہ کم از کم ایسا رویہ اختیار نہ کرے جس سے عاشق کے جذبات مجروح ہوں۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ محبوب زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے طنز و طعنہ سے عاشق کے دل کو مزید چھلنی کر دیتا ہے۔ بقول شاعر:

؎ اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
(میر درد)

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں شاعر نے ''مہر و وفا، لطف و عنایت'' جیسی چار اعلیٰ صفات کو نہایت سلیقے سے لڑی میں پرو دیا ہے۔ ان کا تعلق محبت اور انسانیت سے ہے۔ مصرع ثانی میں ''طنز و کنایہ، رمز و اشارہ'' جیسی چار منفی صفات کو سلیقے سے باندھا گیا ہے جو انسانی تعلقات خراب کرتی ہیں۔ اس طرح شاعر نے شعر کے لفظی حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ شعر میں بلا کی روانی، سلاست اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔

شعر نمبر 6

تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کی آب گوارا جانے ہے

حل لغت تشنہ خوں (خون کا پیاسا) ناداں (بے وقوف، معصوم) تلخی کش (مصیبتیں برداشت کرنے والا) دم دار (تیز دھار) آب تیغ (چمک دار تلوار) آب (پانی) گوارا (برداشت کرنا، سہنا)

مفہوم میرؔ بھی کتنا نادان ہے کہ خود ہی اپنا دشمن بن کر خود کو مصیبتوں میں مبتلا کر لیتا ہے۔ وہ محبوب کے ہاتھ میں چمک دار تیز دھار تلوار کو بھی پانی کی طرح گوارا کرتا ہے۔

تشریح

میر تقی میرؔ کی شاعری زندگی کے انقلابات کی ترجمان رہی ہے۔ میرؔ کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ میرؔ کا اُسلوبِ بیان سادہ اور سلیس ہونے کے باوجود ندرت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے معاصرین نے کیا ہے، بلکہ اب تک کے تمام مستند ناقدین اور غزل کے معتبر شعرا نے میرؔ کے کلام کی ہمہ گیریت، نشتریت اور افادیت کو کھلے دل سے تسلیم کیا ہے۔ اُن کے عہد کو اُردو شاعری کے زریں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تشریح طلب شعر غزل کا مقطع ہے۔ اس شعر میں شاعر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میرؔ بہت ہی ناسمجھ اور نادان ہے کہ خود ہی اپنے آپ کو مصیبتوں اور تکلیفوں میں گرفتار کر لیتا ہے۔ گویا وہ اپنا دشمن آپ ہو گیا ہے اور اپنے ہی خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں خود کو تکلیفوں میں مبتلا کر کے اپنے عشق کی صداقت ثابت کرتا رہتا ہوں۔ محبوب کے ہاتھ میں چمک دار اور تیز دھار تلوار کو بھی پانی کی طرح سہہ جاتا ہوں۔ جس طرح پانی کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تلوار کتنی تیز ہے، وہ تلوار کی ہر ضرب کو سہہ جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی محبوب کے ہر ستم اور ہر ظلم کو برداشت کر لیتا ہوں۔ گویا تکلیف میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی غم زدہ نہیں ہوتا اور واویلا نہیں کرتا۔ محبوب کے ہاتھوں ہر ظلم و ستم خوشی خوشی برداشت کر لیتا ہوں۔

؎ زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

دراصل عاشق کے لیے محبوب کی خاطر تکلیف اُٹھانا اور راہِ عشق میں آنے والی ہر مصیبت کو خوشی خوشی برداشت کرنا، اس کے عشق کی صداقت کی علامت ہوتا ہے۔ اس طرح محبوب پر اس کے عشق کی سچائی واضح ہو جاتی ہے اور وہ محبوب کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ ایک عاشق کے لیے یہی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ محبوب اس کی محبت کی صداقت کو تسلیم کر لے۔ چناں چہ عاشق راہِ عشق کی ہر تکلیف اور ہر زخم کو پھول سمجھتا ہے۔ شاعر کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ وہ تکلیفوں اور مصیبتوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور پھر تکلیف اور مصیبت میں ہوتے ہوئے بھی دکھی نہیں ہوتا۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تلوار کتنی تیز ہے۔ وہ تلوار کی ہر ضرب کو آسانی سے سہہ جاتا ہے۔ بقول میر درد:

؎ ادھر آ ستم گر ہنر آزمائیں تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں (میر درد)

دوسرا یہ کہ جب انسان شدتِ غم میں مبتلا ہو تو ایسی چیزوں کی طلب کرتا ہے جو اسے مزید نقصان پہنچا سکتی ہوں۔ یہاں شاعر بتانا چاہتا ہے کہ تلخی اور درد انسان کو اس قدر نادان بنا دیتے ہیں کہ وہ خون جیسی چیز کو بھی فائدہ مند سمجھنے لگتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ میر الہام کے ذریعے ہی شعر کہتے تھے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ:

''شاعر میں قوتِ ایجاد اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک اس کو الہام نہ ہو اور وہ ہوش و حواس سے عاری نہ ہو اور اس کے ذہن نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا ہو۔''

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں ''تلخی کش'' کا لفظ شاعر نے نہایت مؤثر طریقے سے استعمال کیا ہے جو اپنے اندر بلاغت رکھتا ہے۔ مصرع ثانی میں ''آبِ تیغ'' اور ''آب گوارا'' کے الفاظ میں آب کی تکرار ایک خاص صوتی حسن پیدا کرتی ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ جب کہ دونوں تراکیب میں آب کا معنی مختلف ہے یہ صنعتِ تجنیس ہے۔ علاوہ ازیں ''تشنہ خوں'' اور ''آبِ تیغ'' جیسے استعاروں سے شاعر نے جذبات کی شدت کو نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے۔

مشقی سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) میر کے نزدیک کون اس کے حال سے واقف نہیں؟

جواب: میر کے نزدیک اس کا محبوب اس کے حال سے واقف نہیں ہے۔ جب کہ اس کے گردونواح کی ہر چیز اس کے حال سے واقف ہے

(ب) شہرِ حسن کی رسم کیا نہیں ہے؟

جواب: بیماریٔ دل کی چارہ گری کرنا شہرِ حسن کی رسم نہیں ہے۔

(ج) اس غزل کی ردیف لکھیں اور قوافی کی نشان دہی کریں۔

جواب: ردیف: جانے ہے

قوافی: ہمارا، سارا، تارا، وارا، چارہ، اشارہ، گوارا

(د) ''اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے'' کے مصرعے میں طنز و کنایہ اور رمز و اشارہ کی وضاحت کریں۔

جواب: طنز کا مطلب چبھنے والی بات کہنا، طعنہ دینا، کنایہ کا مطلب اشارے میں کوئی بات کہنا، رمز کا مطلب پوشیدہ معنی میں کوئی بات کہنا، اشارہ کا مطلب اپنی حرکات و سکنات سے کوئی بات کہنا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب محبت و وفاداری کی باتیں تو نہیں جانتا لیکن دل دکھانے والی، طعنہ دینے والی باتیں، چال بازی اور مکر و فریب میں ماہر ہے۔

(ہ) میر کے خون کا پیاسا کون ہے اور میر ''آبِ تیغ'' کو ''آبِ گوارا'' کیوں سمجھتا ہے؟

جواب: میر کے خون کا پیاسا خود میر ہے۔ وہ محبوب کی آبِ تیغ (چمک دار تلوار) کو آبِ گوارا سمجھتا ہے کیوں کہ وہ محبت میں نادان اور تلخی کش ہو چکا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے ہی خون کا پیاسا ہو گیا ہوں۔ خود کو تکلیفوں میں مبتلا کر کے اپنے عشق کی صداقت ثابت کرتا رہتا ہوں۔ محبوب کے ہاتھ میں چمک دار اور تیز دھار تلوار کو بھی پانی کی طرح سہہ جاتا ہوں۔ جس طرح پانی کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تلوار کتنی تیز ہے، وہ تلوار کی ہر ضرب کو سہہ جاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی محبوب کے ہر ستم اور ہر ظلم کو برداشت کر لیتا ہوں۔

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔۔۔۔۔تو سارا جانے ہے

(ب) چارہ گری بیماریٔ دل کی۔۔۔۔۔۔نہیں

(ج) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایک سے واقف ان میں نہیں

(د) اس کے فلک چشم مہ و خور کی۔۔۔۔۔کا تارا جانے ہے

(ہ) تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں۔۔۔۔۔۔۔۔

جواب:

(الف) جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے۔۔۔باغ۔۔۔تو سارا جانے ہے

(ب) چارہ گری بیماریٔ دل کی۔۔۔۔رسمِ شہرِ حسن۔۔ ۔۔۔۔۔نہیں

(ج) ۔۔۔مہر و وفا و لطف و عنایت۔۔۔۔۔۔ایک سے واقف ان میں نہیں

(د) اس کو فلک چشم مہ و خور کی۔۔۔۔۔پتلی۔۔۔۔۔۔کا تارا جانے ہے

(ہ) تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں۔۔۔تلخی کش۔۔۔۔۔۔۔

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) عاشق سا تو کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں:

(الف) پاگل (ب) دیوانہ (ج) ہوشیار (د) سادہ

(ب) جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے:

(الف) گلستاں تو سارا جانے ہے (ب) باغباں تو ہمارا جانے ہے

(ج) باغ تو سارا جانے ہے (د) گل چیں تو تمھارا جانے ہے

(ج) رسم شہرِ حسن نہیں:

(الف) چارہ گری کرنا (ب) مرہم رکھنا (ج) نظرِ کرم کرنا (د) التفات کرنا

(د) ''پتا، بوٹا، گل اور باغ'' کے الفاظ علم بیان کی رو سے ہیں:

(الف) مجازِ مرسل (ب) کنایہ (ج) مراعات النظیر (د) صنعتِ تکرار

(ہ) تلخی کش سے مراد ہے:

(الف) تلخ بات کہنے والا (ب) کڑوی دوا پینے والا

(ج) تلخی کو ناپسند کرنے والا (د) تلخی برداشت کرنے والا

۴۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

جواب:

تلفظ	اعراب	تلفظ	اعراب	تلفظ	اعراب
تیغ	تیْغ	رسم	رَسم	زیاں	زِیاں
تشنہ	تِشنہ	چشم	چَشم	دم دار	دَم دار

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معانی لکھیں۔

چارہ گری رسمِ شہرِ حسن لطف و عنایت تشنہ خوں آبِ تیغ

رمز و اشارہ آبِ گوارا مہ و خور تلخی کش مہر و وفا

جواب:

تراکیب	معانی
چارہ گری	علاج
رسمِ شہرِ حسن	حسینوں کے شہر کی رسم
لطف و عنایت	مہربانی اور رحم
رمز و اشارا	اشارے کنائے میں بات کہنا
آبِ گوارا	خوش گوار پانی، خوش ذائقہ پانی
مہ و خور	چاند اور سورج

۶۔ میر کی شاملِ کتاب غزل کو درست تلفظ، لحن اور آہنگ سے باآواز بلند پڑھیں۔

۷۔ درج ذیل شعر کی تشریح فکری اور فنی حوالے سے کریں:

لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پُتلی کا تارا جانے ہے

جواب: دیکھیے تشریح اشعار

۸۔ آپ نے میر تقی میر کی غزل پڑھی، آپ کو اس غزل میں سے کون سا شعر پسند آیا ہے؟ پسندیدگی کی وجہ بھی بتائیے۔

۹۔ میر تقی میر کی اس غزل میں سے ایسے شعر کی نشان دہی کریں جس میں ''صنعت تکرار'' کو برتا گیا ہو۔

جواب:

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مصرع: مصرع بامعنی الفاظ پر مشتمل وہ سطر ہے کہ اگر نثر میں ہو تو جملہ یا فقرہ کہلائے گا اور نظم یا غزل میں ہو تو مصرع۔ مصرع کے لیے موزوں ہونا ضروری ہے۔ شعر کے پہلے مصرع کو مصرع اولیٰ اور دوسرے کو مصرع ثانی کہتے ہیں۔ مثلاً:

ع یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا

شعر: دو مصرعے، جو ایک ہی وزن کے ہوں اور ایک خیال کو ظاہر کریں، شعر یا بیت کہلاتے ہیں۔ مثلاً:

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی، یہ بھی ہیں جستجو کرتے

قافیہ: ہر شعر کے آخر میں ردیف سے پہلے آنے والے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً: غالب نے اپنی ایک غزل میں قوافی باندھے ہیں۔

ہوا، دوا، ماجرا، مدعا، خدا، وفا، دعا، صدا وغیرہ۔

ردیف: اصطلاحِ شعر میں قافیے کے بعد آنے والے وہ لفظ یا ایسے الفاظ جو جوں کے توں بار بار دہرائے جائیں، ردیف کہلاتے ہیں۔ جیسے:

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے

احمد ندیم قاسمی کے اس شعر میں ''جائے'' کا لفظ بطور ردیف استعمال ہوا ہے۔

۱۰۔ میر کی اس غزل سے مطلع، مقطع، قافیہ اور ردیف کی مثالیں تلاش کریں۔

جواب:

مطلع:

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مقطع:

تشنہ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کے آبِ گوارا جانے ہے

قافیہ: ہمارا، سارا، تارا، وارا، چارا، اشارا، گوارا

ردیف: جانے ہے

سبق: ۱۹ سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

شاعر
فراق گورکھ پوری
(1896-1982)

شاعر کا تعارف

اصلی نام رگھو پتی سہائے جب کہ فراقؔ تخلص تھا۔ گورکھ پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد ایک تعلیم یافتہ شخص تھے اور ان کا پیشہ وکالت تھا۔ وہ شعر و شاعری میں بھی خاصا شغف رکھتے تھے۔ عبرتؔ ان کا تخلص تھا۔ فراقؔ کی شاعری میں دل چسپی کی بڑی وجہ ان کا گھریلو ماحول بھی کہا جا سکتا ہے جس میں پرورش پا کر انھوں نے شعر و سخن کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

فراقؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں انگریزی ادب میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بعد میں شعبہ تدریس کا انتخاب کیا اور پھر تمام عمر اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ غزل کے ساتھ ان کے تنقیدی مضامین اور خطوط نے بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ بھارت اور سوویت یونین کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر انھیں اعزازات سے نوازا گیا۔

فراقؔ ایک وسیع المطالعہ شاعر تھے اور ان کی مشرقی و مغربی ادب پر گہری نظر تھی، اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں ان دونوں تہذیبوں سے بھرپور خوشہ چینی کی ہے۔ مزید برآں انھیں آریائی اور دیومالائی کلچر ورثہ میں ملا تھا۔ چناں چہ اس تجسس اور ذوق نے انھیں مغربی، ایرانی اور ہندوستانی کلچر کا محرم بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی اور فارسی زبانوں اور تہذیبوں کے ملے جلے اثرات نے ان کے ذہن و دل کی گہرائیوں میں اتر کر نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔

فراقؔ نے غزل میں نئے موضوعات متعارف کرائے اور غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ فراقؔ گورکھ پوری کی تصانیف میں ''پچھلی رات''، ''چراغاں''، ''گل نغمہ''، ''شعلہ ساز''، ''روح کائنات''، ''غزلستان''، ''شبنمستان''، ''آرزو کی عشقیہ شاعری'' اور ''اردو غزل گوئی'' شامل ہیں۔ ان کا تمام کلام ''کلیاتِ فراق'' کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

حل لغت: سودا (شوق، جنون، عشق) تمنا (آرزو، خواہش) ترکِ محبت (محبت کو چھوڑنا، محبت ختم کرنا) بھروسا (یقین، اعتماد)

مفہوم: میرے سر میں عشق کی دیوانگی باقی نہیں رہی اور دل میں تیری آرزو بھی نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے محبت ترک کر دی لیکن خود پر بھروسا نہیں کہ یہ جذبہ کب بیدار ہو جائے؟

تشریح:

فراقؔ گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

''اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر اپنے منفرد انداز میں جذبۂ محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ میں نے عشق میں کچھ ایسے زخم کھائے ہیں کہ اب اس عشق کا بھوت میرے سر سے اتر گیا ہے۔ اب میرے سر میں وہ پہلے کی سی عشق کی دیوانگی باقی نہیں رہی اور دل میں محبوب کو حاصل کرنے کی خواہش بھی باقی نہیں رہی۔ تاہم مجھے محبت کرنے کا کچھ اعتبار بھی نہیں کہ کب پھر سے محبت شروع کر دوں، اگر چہ میں نے محبت ترک کر دی ہے لیکن اس ترکِ محبت کا کچھ بھروسا نہیں ہے۔ جب سے میں نے محبوب سے لاتعلقی کا اعلان کیا ہے میرے دماغ میں موجود عشق و محبت کا جنوں سرد پڑ چکا ہے۔ میرے اندر عشق نے انگڑائیاں لینا چھوڑ دی ہیں۔ میری بے قراریاں دم توڑ چکی ہیں۔ مجھے اب اپنے محبوب سے کوئی سروکار نہیں، نہ مجھے اب اس سے کوئی رابطہ رکھنا ہے اور نہ اس کی محبت میں مارا مارا پھرنا ہے۔ بقول شاعر:

لاکھ ہو دل مصر مگر انجم ان سے اب رابطہ نہیں کرنا

''سودا'' کا مطلب عشق کا جنون اور دیوانگی ہے۔ عشق کا جنون باقی نہ رہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اس مقام پر ہے جہاں وہ جذباتی طور پر بے حد تھک چکا ہے اور اس کے دل میں محبت کے لیے پہلی سی شدت اور جوش و خروش نہیں رہا۔ اس معاملے میں وہ بے نیاز اور بے حس ہو چکا ہے۔ ''دل میں تمنا بھی نہیں'' سے مراد ہے کہ اب میرے دل میں کسی کی خواہش اور آرزو کی جگہ بھی نہیں رہی۔ یعنی شاعر اب محبت یا کسی بھی دوسری چیز کی طلب سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس کے دل میں اب کوئی امید اور خواہش نہیں۔ اس کی تمام خواہشیں مر چکی ہیں۔ یہ بے حسی کی کیفیت کی عکاسی ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
(علامہ اقبال)

چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ میرا دل تمناؤں سے خالی ہو گیا ہے اور خوشیاں اس سے رخصت ہو گئی ہیں۔ امیدیں اس گھر کی باسی نہیں رہیں، آرزوئیں بھی اب وادیِ دل میں نہیں آتیں۔

دوسرے مصرع میں عشق کے اختیارات کی بات کرتے ہیں کہ عشق پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ جس من میں سوار ہو جائے وہاں سے واپس نہیں پلٹتا۔ ایک بار جو دل میں سما جائے وہ کبھی نہیں نکل سکتا۔ عشق کے جذبے کے متعلق غالب کیا خوب کہتے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے، یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے
(مرزا غالبؔ)

اصل میں شاعر یہ کہتے ہیں کہ میں نے ترکِ محبت کا اعلان تو کر دیا ہے لیکن مجھے اپنے آپ پر بھروسا نہیں ہے کہ یہ جذبۂ عشق نہ جانے کب پھر سے بیدار ہو جائے۔ شاعر زبان سے تو انکارِ عشق کرتا ہے لیکن دل مسلسل اقرارِ عشق کر رہا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں کہہ تو رہا ہوں کہ میرے سر میں عشق کا جنون اب باقی نہیں رہا اور میرے دل میں کوئی خواہش نہیں رہی لیکن مجھے خود بھی اپنی اس بات پر بھروسا نہیں ہے۔ محبت کا جذبہ نہ جانے کب پھر سے بیدار ہو جائے۔ یہ ایک متضاد کیفیت ہے۔ بظاہر شاعر اس کی زبان اور اس کا دماغ تو یہ بات کہہ رہے ہیں لیکن اندرونی طور پر وہ اس بات پر یقین نہیں کر پا رہا۔ کیوں کہ محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے دماغ سے نہیں۔ بقول شاعر:

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں
(مولانا حالیؔ)

اور بقول مومنؔ:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
(مومن خان مومنؔ)

اس شعر کا مضمون نیا نہیں ہے لیکن سلاستِ الفاظ اور سادگیِ بیان اور محبت کی ایک خاص کیفیت موجود ہے۔ ایسے سہل ممتنع انداز میں بیان کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس شعر کی جان اسی میں ہے کہ سننے والا فوراً متاثر ہو جاتا ہے۔ اُردو شاعری کا ذوق فراقؔ کو وراثت میں ملا ہے لیکن اُن کا مخصوص رنگِ سخن خود اُن کی ذاتی چیز ہے۔ ایک اور جگہ فراقؔ نے یُوں کہا ہے:

ہاں بتا دے مجھے اے رابطہ ترکِ طلب جس سے آ جائے مجھے تیری تمنا کرنا

تشریح طلب شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ مصرع اولیٰ میں شاعر ''سودا'' کے مقابل ''تمنا'' کا لفظ لایا ہے، یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ بھی ہیں، جس سے شعر کا صوتی آہنگ خوب صورت ہو جاتا ہے۔ شعر میں لفظ ''نہیں'' کی تکرار نہایت بھلی لگتی ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ علاوہ ازیں شعر متضاد اور ملی جلی کیفیات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ روانی، سلاست اور موسیقیت سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 2

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

حلِ لغت دل کی گنتی (دل کا شمار) یگانوں (اپنوں، دوستوں)، بیگانوں (غیروں، اجنبیوں) جلوہ گہِ ناز (محبوب کی محفلِ حسن، محبوب کا حسین چہرہ)، دل اٹھنا (دل ہٹنا، جدا ہونا، اکتا جانا)

مفہوم محبوب کی نظروں میں میرا شمار اپنوں میں ہے نہ غیروں میں لیکن میرا دل پھر بھی محبوب کی محفلِ حسن سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔

تشریح

فراقؔ گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

''اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی محفل میں میری حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ محبوب مجھے نہ تو اپنے دوستوں اور چاہنے والوں میں شمار کرتا ہے اور نہ وہ مجھے غیروں اور اجنبیوں میں شمار کرتا ہے۔ محبوب نے ایک عجیب بے التفاتی روا رکھی ہے۔ اسے میری محبت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ مجھے کسی حیثیت میں شمار نہیں کرتا۔ یہ سب وہ اپنے ناز اور نخرے کے سبب کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل محبوب کے ناز و ادا اٹھاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ کبھی نہ کبھی محبوب میری طرف نظرِ کرم فرمائے گا۔ میرا دل محبوب کی جلوہ گاہِ حسن و ادا سے بے زار نہیں ہوتا۔

میں شاد کام دید بھی محرومِ دید بھی ہوتا ہے جب وہ سامنے کچھ سوجھتا نہیں (فراقؔ)

میرے دل کو نہ محبوب کی محبت اور توجہ حاصل ہے اور نہ مکمل طور پر لاتعلقی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں شاعر نہ تو محبوب کی قربت کا لطف اٹھا سکتا ہے اور نہ اس سے الگ ہو سکتا ہے۔ گویا وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو کسی واضح حیثیت میں نہیں دیکھتا۔ لیکن پھر بھی اس کا دل محبوب کے حسن کی محفل سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ یہ ایک ایسا بار ہے جو نہ تو چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ محبوب کی محفل میں دل بے حیثیت ہو کر بھی محبوب کے سحر سے نکلنے کو تیار نہیں۔ بقول شاعر:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
(مرزا غالبؔ)

شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ مجھے دوستوں اور چاہنے والوں میں شمار کرتا تو میں اپنی قسمت پر ناز کرتا اور میری خوشی کی انتہا نہ رہتی کہ میرے دل کی مراد بر آتی۔ لیکن محبوب کی جانب سے ایسا کوئی رویہ سامنے نہیں آیا جس سے میں جان سکوں کہ وہ مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک عجب معاملہ یہ بھی ہے کہ وہ مجھے غیر بھی نہیں سمجھتا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ غیر دل اور اجنبیوں والا بھی نہیں ہے۔ ایک ملا جُلا سا رویہ محبوب نے روا رکھا ہوا ہے۔ گویا:

ع صاف قائل بھی نہیں، صاف مکرتا بھی نہیں

محبوب کے اس رویے نے مجھے الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر وہ مجھے غیروں میں شمار کرتا اور میرے ساتھ اجنبیوں والا رویہ رکھتا تو کم از کم دل کو تسلی تو ہو جاتی کہ محبوب کی نگاہ میں میری کیا حیثیت ہے۔ لیکن اب مجھ پر مکمل صورت حال واضح نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے میرا دل بے قرار ہے اور محبوب کی تغافل نازسے نہ دور ہوتا ہے اور نہ بے زار۔

جب کبھی خود کو یہ سمجھاؤں کہ تو میرا نہیں — مجھ میں کوئی چیخ اٹھتا ہے، نہیں، ایسا نہیں
کب لگتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد — اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں

(خورشید رضوی)

دل کا محبوب کی تغافل حسن و ناز سے بے زار نہ ہونا اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ شاعر کا اپنے دل پر اختیار نہیں ہے۔ دل محبوب کے ہر روکھے رویے، سرد لہجے اور سفاکانہ عمل کے باوجود اس کی چاہ میں بے قرار رہتا ہے۔ محبوب کے کسی بھی قسم کے رویے کے باوجود دل میں محبوب کے لیے محبت میں کمی نہیں ہوتی۔ ''جلوہ گاہِ ناز'' ایک بلیغ ترکیب ہے۔ اس سے مراد محبوب کی تغافل ہے جہاں محبوب اپنے حسن کے جلوے دکھاتا ہے۔ ان جلوؤں میں ناز، نخرہ اور ادا ہوتی ہے۔ محبوب کی یہی ادائیں اور ناز اور جلوے شاعر کے دل کو اس کے در سے ہٹنے نہیں دیتے۔ انھی جلووں کی چاہ میں وہ محبوب کے ہر ناگوار رویے پر بھی دل برداشتہ نہیں ہوتا۔

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی — ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر

(میر تقی میر)

شعر میں ''یگانوں'' اور ''بیگانوں'' متضاد الفاظ آئے ہیں۔ یہ صنعتِ تضاد ہے۔ ''جلوہ گہِ ناز'' نہایت بلیغ ترکیب ہے۔ شعر سادگی، سلاست اور روانی سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 3

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

حل لغت مہربانی (رحم دلی، نرمی، شفقت) محبت (دل کا گہرا لگاؤ، شدت سے چاہنا) آہ (کلمۂ افسوس) رنجشِ بے جا (بے وجہ ناراض ہونا)

مفہوم اے محبوب مہربانی کرنے کو محبت نہیں کہتے۔ افسوس اب تم مجھ سے بے وجہ ناراض بھی نہیں ہوتے۔

تشریح

فراق گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

''اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر نے محبت اور احساسات کی گہرائی کو بیان کیا ہے۔ شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

اے محبوب! محبت اور مہربانی میں بہت فرق ہے۔ کسی کی حالتِ زار پر رحم کر کے اس پر کچھ مہربانی کر دینا، محبت نہیں ہوتی، محبت ایک الگ چیز ہے۔ اے محبوب میری خستہ حالی کو دیکھ کر تمھارا دل پگھل گیا، اور تم نے ترس کھاتے ہوئے میرے ساتھ جو نرم رویہ رکھا ہے اور جو کرم نوازی کی ہے میں جانتا ہوں کہ وہ محبت نہیں ہے۔

مہربانی اور ترس وقتی جذبہ ہے جو تھوڑی دیر کے لیے دل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہ محبت ایک مستقل جذبہ ہے جو ہمیشہ دل میں زندہ رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بعض اوقات کسی حساس شخص پر مہربانی کرنے اور ترس کھانے سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہو سکتی ہے۔ جب کہ محبت میں سب سے پہلے عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا ہے اور برابری کا رویہ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ میں محبت کا طلب گار ہوں، مہربانی اور رحم دلی اور ترس کا نہیں۔ بقول شاعر:

اہلِ دنیا کو غوری یہ پیغام دو — عزتِ نفس میری نہ پامال ہو
ترس کھاؤ نہ مجھ پر، محبت کرو — ہاتھ میں ہاتھ دو، تم مرا ساتھ دو

(یامین غوری)

مصرعِ ثانی میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! مجھے تو تمھارا مجھ سے بے وجہ ناراض ہونا بھی گوارا تھا۔ تم بات بات پر ناراض ہو جاتے تھے اور میں تمھیں منایا کرتا تھا۔ اس روٹھنے اور منانے میں بھی ایک محبت کا احساس اور جھلک نظر آتی تھی لیکن افسوس کہ اب وہ تمھارا بلاوجہ ناراض ہونا اور بے جا غصہ بھی ہم پر باقی نہیں رہا۔ گویا رحم محبت کی علامت نہیں بلکہ گلہ، شکوہ، غصہ اور شکایتیں محبت کے احساس کو بیدار رکھتی ہیں۔ شاعر کی کیفیت اب اس حد تک بدل چکی ہے کہ محبوب کی بے وجہ ناراضی اور خفگی بھی اسے ناگوار محسوس نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ جان چکا ہے کہ یہ بھی محبت کا ایک پہلو ہے۔ وہ ہر حال میں محبت کے برتاؤ کو برداشت کرنے کو تیار ہے۔ بقول شاعر:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا — اگر گلے نہیں ملتا، تو ہاتھ بھی نہ ملا (بشیر بدر)

شاعر محبوب کو آگاہ کرتا ہے کہ محض ہمدردی کرنا اور نرم رویہ رکھنا محبت کے زمرے میں نہیں آتا۔ محبت ایک الگ ہی جذبہ ہے جو خلوص اور سچائی پر مبنی ہوتا ہے۔ محض ترس کھانے اور مہربانی برتنے سے محبت کا اظہار نہیں ہوتا۔ محبوب یہ سمجھتا ہے کہ مہربانی کرنا ہی محبت کرنا ہے۔ محبت میں صرف نرمی اور مہربانی کافی نہیں بلکہ اصل چیز اخلاص اور وابستگی ہے۔ اگر محبت میں خلوص نہ ہو تو چاہے کیسا ہی رویہ رکھا جائے، اس کا اعتبار نہیں رہتا۔

اس شعر میں مومن کا خالص رنگ نظر آتا ہے۔ شعر میں کمال خوب صورتی سے مہربانی اور محبت کے فرق کو بیان کیا گیا ہے اور پھر دوسرے مصرعے میں رنجشِ بے جا کو لا کر فراق نے شاعری کو کمال درجے پر پہنچا دیا ہے۔ یہ شعر فراق کے نیرنگیٔ ذوق کی زبردست شہادت ہے۔ ایک اور شعر میں فراق کہتے ہیں۔

نیرنگیٔ اُمیدِ کرم اُن سے پوچھیے — جن کو جفائے یار کا بھی آسرا نہیں

تشریح طلب شعر سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ ''مہربانی'' اور ''محبت'' کے الفاظ میں حرف ''م'' کی تکرار یہاں نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جس سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔

شعر نمبر 4

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

حل لغت مدت (عرصہ، وقت) یاد (خیال، سوچ) بھول گئے (یاد نہ رہا) ایسا بھی نہیں (ایسی بات نہیں)

مفہوم اے محبوب! ایک مدت گزر گئی لیکن تمھارا تذکرہ نہ ہوا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تجھے بھول گئے ہیں۔

تشریح

فراق گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

"اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔"

تشریح طلب شعر میں شاعر ہر عاشق کی فطرت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں کہ دنیوی مصائب و مسائل میں گھر جانے کے سبب محبوب بھی یادوں سے محو ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ گردشِ حالات نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ دیارِ محبوب کو بھی چھوڑنا پڑا۔ روزگار کی تلاش میں اس قدر مگن ہوئے کہ ایک عرصہ تک محبوب کی یاد بھی نہ آئی۔ زندگی کی مصروفیات اور حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے شاعر کو محبوب کی یاد نہیں آئی۔ ایسی ہی کیفیت کا اظہار مشہور شاعر حسرت موہانی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی — مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

(حسرت موہانی)

دوسرے مصرع میں شاعر محبوب سے مخاطب ہیں اور اسے یقین دلانے کے انداز میں کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے زندگی کی مصروفیات نے ہمیں تم سے غافل رکھا اور ہم نے تجھے یاد نہیں کیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم تجھے بالکل ہی بھول گئے ہوں۔ بقول پروین شاکر:

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب — وہ مجھے یاد تو آتا ہے، مگر کام کے بعد

(پروین شاکر)

دراصل شاعر کہنا چاہتے ہیں کہ جب وہ دنیا کے کاموں میں مشغول ہوتے ہیں تو کئی کئی مہینے گزر جاتے ہیں اور محبوب کی یاد تک نہیں آتی۔ بعض اوقات زندگی کی مشکلات اور مصروفیات دل و دماغ پر اتنی غالب آ جاتی ہیں کہ کسی اور چیز کا ہوش نہیں رہتا لیکن جب کبھی محبوب کا تذکرہ چھڑ جائے یا کسی بھی طرح ایک بار محبوب کی یاد تازہ ہو جائے تو پھر وہ دنیا کی ہر چیز کو بھلا دیتی ہے اور کچھ دیر کے لیے شاعر ہر چیز سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر:

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

ایک اور شعر میں فراق نے یوں بیان کیا ہے:

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

شاعر نے بظاہر یہاں دو متضاد کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ دراصل بھولنا اور یاد نہ آنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ بعض اوقات کوئی چیز وقت اور حالات کی بنا پر یاد نہیں آتی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مکمل طور پر بھول چکی ہو۔ بظاہر وقت گزرنے کے ساتھ اپنے پیاروں کی یادیں ماند پڑ جاتی ہیں لیکن وہ دل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ موجود اور زندہ ہوتی ہیں۔ جس وقت وہ ابھرتی ہیں تو پھر ابھرتی چلی جاتی ہیں۔ محبت بھری یادیں وقت کی دھند میں چھپ تو سکتی ہیں لیکن مکمل طور پر مٹ نہیں سکتیں۔ محبوب کی یاد دل کی گہرائیوں میں ہمیشہ موجود رہتی ہے لیکن وہ وقت اور حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے ظاہری طور پر سامنے نہیں آتی۔ الغرض محبوب کی محبت اور اس کی یاد دل میں پیوست رہتی ہے خواہ وہ ظاہر ہو یا نہ ہو۔

دوسرے مصرع کے بے ساختہ پن، ردیف اور قافیے کے خوب صورت استعمال نے شعر کے مفہوم کو حد درجہ دِل نشین بنا دیا ہے۔ نئے زاویۂ بیان نے شعر میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ شعر کے رنگ میں مومن کا رنگ نظر آتا ہے۔

شعر متضاد کیفیات کا حامل ہے۔ انتہائی سادہ اور سہل ہے۔ سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر نے بڑی سادگی سے انسانی نفسیات کی عکاسی کی ہے۔

شعر نمبر 5

یوں تو ہنگامے اٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست! کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

حلِ لغت ہنگامے (شور مچانا، اودھم مچانا) دیوانۂ عشق (عشق میں دیوانے ہونے والے) ایسوں کا (ایسے عاشقوں کا) ٹھکانہ (مراد اعتبار، بھروسا)

مفہوم سچے عاشق زبان پر شکوے نہیں لایا کرتے لیکن دیوانگی میں آہ و فغاں کرنے والوں کا کچھ بھروسا بھی نہیں۔

تشریح

فراق گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

"اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔"

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتے ہیں کہ اگرچہ عشق میں دیوانے لوگ محبت کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ہنگامہ آرائی سے گریز کرتے ہیں اور محبوب کے سامنے عجز و انکساری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ دیوانگی میں اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں اور عموماً اس کی شدت کا اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے من کی دنیا میں مست اور مگن رہتے ہیں۔ وہ محبوب کی محبت میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ انھیں محبوب کے سوا کسی کی خبر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسا شخص جو خود اپنی ذات سے بھی بے گانہ ہو عموماً ہنگامہ آرائی نہیں کرتا۔ لیکن ایسے دیوانوں کا کچھ بھروسا بھی نہیں کہ یہ شوریدہ سر کب طوفان برپا کر دیں۔ ان کی خاموشی کب کسی طوفان کا پیش خیمہ بن جائے اس کا کچھ بھروسا نہیں۔ اپنی محبت کی خاطر اور محبوب کو حاصل کرنے کے لیے یہ سر پھرے دیوانے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ چوں کہ عشق ایک وجدی سی کیفیت کا نام ہے۔ اس لیے ایسے دیوانوں کا کچھ بھروسا نہیں کہ کب کیا کر گزریں۔ بقول شاعر:

پھر مشکل کیا آسان کیا — جب ٹھان لیا تو ٹھان لیا

اور بقول یوسف تقی:

حال کچھ اب کے جدا ہے ترے دیوانوں کا — شہر میں ڈھیر نہ لگ جائے گریبانوں کا

شعر کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ عاشق کو اعلیٰ ظرف ہونا چاہیے۔ عاشق دلی احساسات کو نوکِ زباں پر نہیں لاتے۔ زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو راہِ عشق کی ناکامیاں برداشت نہیں کر پاتے اور محبوب کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ میدانِ عشق میں قدم رکھنے والوں کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ محبوب کی طرف سے ملنے والے ظلم و ستم کو کمالِ صبر سے برداشت کرنا ہوگا۔ بقول جگر مُرادآبادی:

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

دوسرے مصرع میں شاعر ناکام عاشقوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ دنیا میں ایسے بہت سے ناکام عاشق بھی پائے جاتے ہیں جو عشق کی آزمائش برداشت نہیں کر پاتے۔ وہ دل کے سارے راز زمانے والوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ ذرا بھی ندامت محسوس نہیں کرتے۔ وہ راہِ عشق کو پھولوں کی سیج سمجھ لیتے ہیں لیکن جب انھیں کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے تو سارے ضبط توڑ

دیتے ہیں۔ عشق کی سنگلاخ سرزمین پر چلتے چلتے پاؤں آبلہ پائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناکام عاشقوں کے لیے پیغامِ عشق ہے کہ

انھی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ　　مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
(مصطفیٰ زیدی)

''ٹھکانہ بھی نہیں'' کا ایک مطلب گھر نہ ہونا ہے۔ یعنی ایسے دیوانوں کا کوئی گھر نہیں ہوتا، یہ بے ٹھکانہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف محبوب کی محبت اور اس کی رضا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کو بھول جاتے ہیں۔ کسی شے اور مقام کی پروا نہیں کرتے۔ عشق کی دیوانگی میں صحراؤں اور بستیوں کی جانب نکل جاتے ہیں۔

شعر میں شاعر نے متضاد کیفیات کا ذکر کیا ہے۔ شعر انتہائی سادہ اور سہل ہے۔ سہلِ ممتنع کی ایک مثال اور روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 6

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

حل لغت صیاد (شکاری) گل (پھول)

مفہوم اے صیاد پھول بھی ہم ہیں اور بلبل بھی ہم ہی ہیں۔ افسوس تو نے کچھ سنا نہ دیکھا۔

تشریح

فراق گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

''اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ اے صیاد وہ خوب صورت اور خوش رنگ پھول ہم ہی ہیں جس کی خوش بو سے تمام ماحول معطر ہے۔ جس کی رعنائی کے چرچے پورے عالم میں ہیں۔ وہ بلبل بھی ہم ہی ہیں جس کے نغمے اور زمزمے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ بقول قتیل شفائی:

جو ہم نہ ہوں تو زمانے کی سانس رک جائے　　قتیلؔ وقت کے سینے میں ہم دھڑکتے ہیں

لیکن افسوس تو ایسا بے ذوق اور کوتاہ نظر نکلا کہ تو نے نہ وہ پھول دیکھا نہ اس کی خوش بو سونگھی اور نہ رعنائی دیکھی۔ نہ ہی بلبل دیکھی اور نہ اس کے وہ رس بھرے نغمے سنے۔ بلکہ ایک آن میں پھول کو بھی تو نے توڑ ڈالا اور بلبل کو بھی شکار کر لیا۔

''صیاد'' کا استعارہ ایسے شخص کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو محبت کرنے والوں کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ یہ شکاری جسمانی اور جذباتی دونوں طرح سے محبت کرنے والوں کو قید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ''گل اور بلبل محبوب اور عاشق کی علامات ہیں۔ پھول کی خوب صورتی اور بلبل کے نغمے محبت کی گہرائی کو بیان کرتے ہیں۔ جہاں پھول ہو وہاں بلبل کا ہونا لازمی امر ہے۔ گل و بلبل کا ساتھ فطری ہے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو　　(علامہ اقبالؒ)

شاعر کہتا ہے کہ ہمیں گل ہیں اور ہمیں بلبل ہیں۔ یہ محبت اور عشق کی یک جائی کو بیان کرتا ہے۔ جس طرح گل و بلبل ساتھ فطری ہے اور انھیں جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح محبت اور عشق کا ساتھ فطری ہے، انھیں بھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صیاد ان کے

راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔ افسوس کہ صیاد نے نہ محبت کو سنا اور نہ محبت کو دیکھا۔ وہ ان فطری اور خوب صورت جذبات سے عاری ہے۔ وہ بے حس اور بے پروا ہے۔ صیاد کی بے حسی محبت کرنے والوں کی راہ میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔

شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ ''صیاد'' سے مراد انگریز حکمران ہیں، جنھوں نے برصغیر پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1857ء کے بعد دہلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کی خوب صورتی اور رعنائی کو خاک میں ملا دیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر جو مشہور شاعر بھی تھے، انھیں جلاوطن کر دیا۔ الغرض انگریزوں کو اپنے مفاد سے غرض تھی ہندوستان کی خوب صورتی و رعنائی سے انھیں کچھ سروکار نہ تھا۔

بلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گلہ　　قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں　　(بہادر شاہ ظفر)

شعر فنی محاسن سے بھرپور ہے۔ شاعر نے شعر کی ابتدا میں صیاد کا ذکر کر کے اس سے متعلقہ اشیا گل اور بلبل کا ذکر کیا ہے۔ جو صنعت مراعات النظیر کی عمدہ مثال ہے۔ شعر میں لفظ ''ہمیں'' کی تکرار شعر کے حسن کو بڑھا دیتی ہے۔ مصرع ثانی میں ''سنا'' اور ''دیکھا'' کا صوتی آہنگ نہایت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

شعر نمبر 7

مُنھ سے ہم اپنے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
ہے ترا دوست ، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

حل لغت منہ سے (زبان سے) برا کہنا (برائی بیان کرنا) فراقؔ (شاعر کا تخلص، جدائی) دوست (قریبی ساتھی) آدمی اچھا نہیں (اچھے اخلاق کا حامل نہیں)

مفہوم اے فراقؔ! ہم تیرے دوست کے بارے میں بری رائے نہیں رکھتے۔ لیکن اتنا ضرور بتا دیتے ہیں کہ وہ اخلاقی لحاظ سے اچھا آدمی نہیں ہے۔

تشریح

فراقؔ گورکھ پوری کا شمار اُن شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اُردو غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ ان کے لہجے میں کلاسیکی آہنگ اور نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے غزل میں نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔ اپنے مخصوص انداز اور طرزِ احساس کے باعث آج ان کی غزل اُردو غزل کی دنیا پر چھا چکی ہے۔ بقول حسن عسکری:

''اب جو غزلیں لکھی جا رہی ہیں ان میں فراق کا دیا ہوا طرزِ احساس گونجتا ہے۔''

شاعر غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ اے میرے محبوب! ہم فراقؔ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن ہمارے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ اسے سربازار برا کہہ سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھارا تعلق اس کے ساتھ ہے اور محبوب سے وابستہ ہر چیز قابلِ توقیر قرار پاتی ہے۔ محبوب کے ساتھ تھوڑی سی نسبت بھی معمولی چیز کو نادر و نایاب بنا دیتی ہے اور کوئی بھی شخص اس پر انگلی اٹھانے سے گریز کرتا ہے بقول شاعر:

ہوگئی ہو آپ سے نسبت جسے اے دل ربا　　میری کیا طاقت کہ اس کو میں برا کہتا پھروں

دوسرے مصرع میں شاعر اپنی جرات آمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سچی بات زبان پر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے دوست! وہ شخص تیرا دوست ضرور ہے لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ برے اخلاق کا حامل ہے۔ اچھا آدمی نہیں ہے۔ زبان کا برا ہے۔ اخلاقی برائیوں کا حامل ہے۔ ہم تو سچی بات نوکِ زبان پر لے آئے ہیں۔ اب یہ بات تم پر منحصر ہے، اب تمھارا فرض ہے کہ تم اس کی اصلاح کیسے کرتے ہو۔ اسے خوش اخلاق کیسے بناتے ہو۔ اس کو راہِ راست پر کیسے لاتے ہو۔ کیوں کہ کہا جاتا ہے:

''دوست ہی دوست کے لیے بہت بڑا مصلح ثابت ہوتا ہے''

اصل میں شاعر یہ بھی کہنا چاہتا ہے کہ ہر انسان بندۂ خدا بھی ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کے بارے میں رائے دینے سے پہلے ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ اس کا خدا کے ساتھ جو تعلق ہے اس کے افعال کی جزا اور سزا کا اختیار بھی اللہ کے پاس ہے۔ اس لیے ہمیں کسی کی برائی کو اچھالنے کی بجائے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے کیوں کہ:

"خاموشی عین عبادت ہے اور ہمیں بہت سی پریشانیوں سے بچا لیتی ہے"

اور بقول یعقوب انجم:

مانا میں مجرم تھا لیکن تم تو میرا نام نہ لیتے

شعر میں "تم" اور "اچھا" متضاد الفاظ ہیں۔ جو صنعت تضاد کا خوب صورت استعمال ہے۔ شعر روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔

مشقی سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) **شاعر کو ترک محبت کا بھروسا کیوں نہیں؟**

جواب: شاعر کو خود پر اعتبار نہیں ہے کہ اس کے دل میں کسی بھی وقت محبت کا جذبہ پھر سے بیدار ہو سکتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ میں نے محبت تو ترک کر دی لیکن ابھی مکمل بھروسا نہیں ہے۔ کیوں کہ محبت کا تعلق دل سے ہوتا ہے دماغ سے نہیں۔

(ب) **دیوانۂ عشق کیا کچھ کر سکتا ہے؟**

جواب: شاعر کہتا ہے کہ دیوانۂ عشق یوں تو ہنگامہ برپا نہیں کرتا لیکن اس کا کچھ بھروسا بھی نہیں ہے۔ کب اس کے خاموش جذبات طوفان میں ڈھل جائیں۔

(ج) **"جلوہ گہ ناز" سے کیا مراد ہے؟**

جواب: جلوہ گہ ناز سے مراد محبوب کی محفل حسن ہے جہاں وہ اپنے حسن اور ناز و انداز کے جلوے دکھاتا ہے۔

(د) **شاعر صیاد سے مخاطب ہو کر کیا کہتا ہے؟**

جواب: شاعر صیاد سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے صیاد! پھول بھی ہم ہیں اور بلبل بھی ہم ہی ہیں۔ افسوس تو نے کچھ سنا نہ دیکھا۔

(ہ) **مقطع میں شاعر نے اپنے بارے میں کیا رائے دی ہے؟**

جواب: شاعر کہتا ہے کہ فراقؔ ہم منہ سے برا تو نہیں کہتے کہ تیرا دوست ہے لیکن وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

۲۔ **مصرعے مکمل کریں:**

(الف) سر میں۔۔۔۔ بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

(ب) دل کی گنتی نہ۔۔۔۔ میں، نہ بیگانوں میں

(ج) شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس۔۔۔۔ سے جو

(د) مہربانی کو۔۔۔۔ نہیں کہتے اے دوست!

(ہ) ہے ترا دوست مگر۔۔۔۔ اچھا بھی نہیں

جواب:

(الف) سر میں۔۔سودا۔۔ بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

(ب) دل کی گنتی نہ۔۔یگانوں۔۔ میں، نہ بیگانوں میں

(ج) شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس۔۔شوخ۔۔ سے جو (یہ مصرع شامل نصاب غزل میں موجود نہیں ہے)

(د) مہربانی کو۔۔محبت۔۔ نہیں کہتے اے دوست!

(ہ) ہے ترا دوست مگر۔۔آدمی۔۔ اچھا بھی نہیں

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں:

(الف) مقطع (ب) مطلع (ج) حسن مطلع (د) مطلع ثانی

(ب) ترک محبت کا نہیں ہے:

(الف) کوئی انجام (ب) بھروسا (ج) فائدہ (د) اعتبار

(ج) "یگانوں" سے مراد ہے:

(الف) بیگانے لوگ (ب) اپنے لوگ (ج) تنہا لوگ (د) منفرد لوگ

(د) ۔۔۔۔ کو محبت نہیں کہتے اے دوست!

(الف) ارزانی (ب) عداوت (ج) شفقت (د) مہربانی

(ہ) مقطع میں صنعت استعمال ہوئی ہے۔

(الف) صنعت مبالغہ (ب) صنعت تکرار (ج) صنعت تضاد (د) صنعت مراعات النظیر

۴۔ غزل کو تحت اللفظ کے انداز میں پڑھیں کہ غزل کا رچاؤ اور معنی آفرینی آپ پر کھل جائے۔

۵۔ درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

جواب:

الفاظ	جملوں میں استعمال
سودا	اس کے سر سے محبوب کا سودا اتر گیا۔
تمنا	خدا آپ کی ہر تمنا پوری کرے۔
بھروسا	کسی اجنبی شخص پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔
ہنگامہ	استاد کی غیر موجودگی میں طلبہ نے کلاس میں ہنگامہ برپا کر دیا۔
شوخ	لائبہ ایک شوخ لڑکی ہے۔

۶۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں:

جواب:

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
سودا	سَوْدَا	تمنا	تَمَنَّا	عشق	عِشْق
جلوہ گہ ناز	جَلْوَہ گَہِ نَاز	صیاد	صَیَّاد	رنجش	رَنْجِش

مطلع: کسی قصیدے، غزل یا قصیدہ نما نظم کے پہلے شعر کو جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہم ردیف ہوں، مطلع کہتے ہیں۔

حسن مطلع: مطلع کے بعد اگر ایک اور مطلع آ جائے تو اسے حسن مطلع کہتے ہیں۔ مثلاً شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ایک غزل کا حسن مطلع ملاحظہ ہو:

دنیا میں جب تلک کہ میں اندوہ گیس رہا
دل غم سے اور دل سے مرے غم قریں رہا
رونے سے کام بس کہ شب اے ہم نشیں رہا
آنکھوں پہ کھینچتا میں سر آستیں رہا

مقطع: کسی غزل کے آخری شعر کو جس میں شاعر اپنا تخلص بھی لاتا ہے، مقطع کہتے ہیں اور اگر شاعر نے تخلص استعمال نہیں کیا ہو پھر اسے مقطع نہیں بلکہ محض غزل کا آخری شعر کہیں گے۔ مثلاً: میرزا داغ کی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:

نہیں کھیل اے داغؔ! یاروں سے کہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

۷۔ فراق کی اس غزل میں مطلع اور مقطع کی نشان دہی کریں۔

جواب:

مطلع:

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مقطع:

منہ سے ہم اپنے برا تو نہیں کہتے کہ فراقؔ
ہے ترا دوست مگر آدمی اچھا بھی نہیں

سبق: ۲۰ بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا

شاعر
منیر نیازی
(1928-2006)

شاعر کا تعارف

ممتاز اردو شاعر منیر نیازی کا پورا نام محمد منیر خان تھا۔ وہ خان پور، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ صرف دو ماہ کے تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ ان کے چچاؤں نے ہی ان کی پرورش کی ذمہ داری نبھائی۔ سات سال کی عمر تک خان پور میں ہی رہے اور پھر خاندان کے ہم راہ خان پور چھوڑ کر ساہیوال چلے آئے۔

منیر نیازی نے پرائمری تعلیم ساہیوال میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول ساہیوال میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ فوج میں بھرتی ہوئے اور وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

آخر تعلیم کی طرف واپسی ممکن ہوئی اور بہاول پور سے ایف۔ اے پاس کر کے دیال سنگھ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ قیامِ پاکستان کے پُر آشوب حالات میں تعلیمی سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ پھر جڑ نہ سکا۔ ساہیوال میں ایک اشاعتی ادارے ''ارژنگ پبلشرز'' کی بنیاد رکھی لیکن مالی معاملات کی وجہ سے ادارہ بند ہو گیا۔ شہر میں مجید امجد، انجم رومانی اور صدیق کلیم جیسے شعرا و ادبا سے روابط قائم ہوئے۔ مجید امجد نے ان پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کیے۔ لاہور میں آئے تو ان کی شاعری کی خوش بو پھیلتی چلی گئی۔ وہ حلقہ اربابِ ذوق کے سیکرٹری بھی رہے۔ لاہور میں ایک اشاعتی ادارہ ''المثال'' قائم کیا لیکن چند کتابیں شائع کر کے بند کرنا پڑا۔

انھوں نے تا عمر شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ کچھ فلموں کے گیت بھی لکھے۔ ان کے گیارہ اردو اور تین پنجابی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ان کے شعری مجموعوں میں ''تیز ہوا اور تنہا پھول''، ''جنگل میں دھنک''، ''دشمنوں کے درمیان شام''، ''آغازِ زمستاں میں دوبارہ''، ''اس بے وفا کا شہر'' شامل ہیں جب کہ تمام کلام ''کلیاتِ منیر نیازی'' کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں پنجابی شاعری میں ''سفر دی رات''، ''رستہ دسن والے تارے''، ''چار چپ چیزاں'' شامل ہیں۔

انھیں ۱۹۹۲ء صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور کمال فن ایوارڈ سے نوازا گیا جب کہ ۲۰۰۵ء میں انھیں ستارۂ امتیاز کا اعزاز دیا گیا۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

بے چین بہت پھرنا ، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی ، دہکائے ہوئے رہنا

حل لغت بے چین (بے قرار، سکون نہ ہونا) دہکانا (بھڑکانا، روشن کرنا) جذبے: (داخلی کیفیات، احساسات)

مفہوم میں ہر وقت بہت بے چین اور گھبرایا ہوا رہتا ہوں، میرے دل میں جذبات کا ایک الاؤ روشن رہتا ہے۔

تشریح

منیر نیازی دورِ جدید کے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ہیں۔ منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اپنی شاعری میں منیر نیازی جن جذبات و احساسات کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ تشبیہات

بہت امید رکھنا اور پھر بے آس ہونا بھی — بشر کو مار دیتا ہے بہت حساس ہونا بھی

شعر انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ مصرع اولیٰ میں "پھرنا" اور "رہنا" الفاظ ہم آواز ہیں جو شعر کا صوتی حسن بڑھاتے ہیں۔ مصرع ثانی میں شاعر نے جذبات کی شدت کو آگ کے دہکانے سے تشبیہ دی ہے، جو نہایت بلیغ تشبیہ ہے۔

شعر نمبر 9

چھلکائے ہوئے چلنا ، خوش بو لب لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے ، مہکائے ہوئے رہنا

حل لغت چھلکائے (لبالب بھر کر، کسی چیز کو اتنا بھرنا کہ مائع لبریز ہو کر گرنے لگے) لب لعلیں (سرخ ہونٹ) مہکانا (خوش بو بکھیرنا)

مفہوم محبوب اپنے ہونٹوں سے خوش بو بکھیرتے ہوئے چلتا ہے گویا وہ ہمہ وقت ایک باغ اپنے ساتھ مہکائے رکھتا ہے۔

تشریح

منیر نیازی دورِ جدید کے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ہیں۔ منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اپنی شاعری میں منیر نیازی جن جذبات و احساسات کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں کے ذریعے ان کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں کہ:

"منیر نے بات کی اور ختم کی، سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک ایک نقطہ، ایک ایک حرف ذہن کے جلو میں قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا۔"

تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کے سرخ ہونٹوں اور اس کی دل نشیں گفت گو کی تعریف کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے سرخ ہونٹ جو لعل کی مانند ہیں، ان سے خوش بو بکھرتی رہتی ہے۔ "چھلکائے ہوئے چلنا" کا مطلب ہے کہ محبوب کے لبوں کے جام خوش بو سے اس طرح بھرے ہوئے ہیں کہ ہر قدم پر چھلک جاتے ہیں۔ یعنی ایک تو محبوب کے ہونٹ لعل کی مانند خوب صورت ہیں دوسرا محبوب کے ہونٹوں سے نکلنے والی گفت گو بہت دل نشین ہے۔ اس کے خوش بو جیسے الفاظ دل کو چھو جاتے ہیں۔ جب وہ بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے خوش بو بکھر رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں سے الفاظ کی بجائے پھول جھڑتے ہیں۔ بقول احمد فراز:

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں — یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں (احمد فراز)

محبوب کا اندازِ گفت گو، ہر لفظ اور ہر جملہ دل میں گھر کر لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوب اپنے ساتھ پھولوں کا ایک باغ مہکائے ہوئے چلتا ہے۔ جس سے خوش بو نکل کر ماحول کو معطر کر رہی ہے۔ محبوب کی شخصیت باغ کی طرح خوش بو دار ہے۔ اس کی موجودگی میں سارا ماحول مہک اٹھتا ہے۔

سنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے — کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں
رُکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں — چلے تو اس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں
(احمد فراز)

انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنا محبوب دنیا کا سب سے حسین شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ہر ادا دل نشین معلوم ہوتی ہے۔ شعرا محبوب کے مختلف اعضا، انداز اور اداؤں کو مختلف اشیا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی وہ محبوب کے ہونٹوں کو پھول سے تشبیہ دیتے ہیں تو کبھی اس کے چہرے کو چاند سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی اس کی گفت گو کو خوش بو سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کبھی اس کی نزاکت کو شیشے سے تشبیہ دیتے ہیں تو کبھی پھول کی پنکھڑی سے۔ جیسا کہ میر تقی میر کہتے ہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (میر تقی میر)

اور استعاروں کے ذریعے ان کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں کہ:

"منیر نے بات کی اور ختم کی، سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک نقطہ ایک ایک حرف ذہن کے جلو میں قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا۔"

تشریح طلب شعر میں شاعر اپنے قلبی احساس کو بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں ہر وقت، بہت بے چین اور بے سکون رہتا ہوں۔ ہر وقت میرے دل میں ایک گھبراہٹ سی رہتی ہے۔ میں اپنے دل میں ہمہ وقت جذبات کی آگ کا ایک الاؤ سا روشن رکھتا ہوں۔ جذبات کی یہ آگ مجھے ہر وقت بے چین رکھتی ہے۔ شاعر نے جذبات کی شدت اور ان کی گرمی کو "آگ کے دہکانے" سے تشبیہ دی ہے۔ "بے چین بہت پھرنا" کا مطلب یہ ہے کہ دل میں کسی طور قرار نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا۔ "گھبرائے ہوئے رہنا" کا مطلب ہے کہ ایک خوف اور اندیشے کی کیفیت میں ہمیشہ مبتلا رہنا۔

لیے پھرا جو مجھے در بدر زمانے میں — خیال مجھ کو دلِ بے قرار کس کا تھا
(صہبا لاری)

انسانی فطرت ہے کہ کوئی بھی جذبہ ہو، محبت ہو یا نفرت، غم ہو یا غصہ، جب کوئی جذبہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو انسان کے اندر ایک بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ اسے کسی ایک جگہ قرار نہیں آتا۔ آگ کی طرح یہ جذبات بھی جلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جذبات کی یہ آگ دل کو جلاتی ہے اور اسے بے چین کرتی ہے۔ جذبات کی شدت اور بے چینی یہ دونوں کیفیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ بے چینی دل کو مضطرب کرتی ہے اور جذبات کی آگ دل کو جلا کر مزید بے چین کرتی ہے۔

چشمِ نم تیری روانی سے الگ رہتا ہوں — آگ ہی آگ ہوں پانی سے الگ رہتا ہوں
تو مرے تذکرۂ عشق میں کیوں آتا ہے — میں تو خود اپنی کہانی سے الگ رہتا ہوں
(قمر رضا شہزاد)

دھڑکتے دلوں میں جذبات و احساسات کا پیدا ہونا بالکل فطری امر ہے۔ صرف مردہ دل جذبات و احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ جو بھی شخص دل رکھتا ہے اور عقل و شعور رکھتا ہے اس کے دل میں بہت سی خواہشات اور جذبات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ہر زندہ دل انسان میں ہزاروں اُمنگیں ہوتی ہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے ہزاروں خواب دیکھتا ہے اور انھیں پورا کرنے کے لیے محنت مشقت اور تگ و دو کرتا ہے۔ انسان کے جذبات اور اس کی خواہشات ہی اسے مسلسل عمل پر اُکساتی ہیں۔ جب تک اسے مطلوبہ چیز یا اپنا مقصد حاصل نہیں ہو جاتا وہ مسلسل ایک بے چینی اور اضطراب کی سی کیفیت میں رہتا ہے۔

امنگوں نے مرے دل کو عجب الجھن میں ڈالا ہے — سمجھتا ہے کہ جو بھی کام ہے وہ کرنے والا ہے
(میراجی)

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جب اردگرد کے لوگ انسان کے جذبات اور احساسات کو نہ سمجھیں اور انسان کے جذبات کو سطح پر اہمیت نہ ملے تو اس کا دل بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اس کا دل بہت سے کام کرنے کو چاہتا ہے۔ اس کے دل میں بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو زبان تک آنا چاہتی ہیں لیکن باہر کوئی اسے سننے والا نہیں ہوتا ہے۔ بقول مولانا حالی:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
(مولانا حالی)

مرے سینے میں بھی تو دل ہے دھڑکتا — کوئی مجھ سے پوچھے میں کیا چاہتا ہوں
(یامین غوری)

شاعر ایک حساس انسان ہے۔ جس کے دل میں محبت کے جذبات اور احساسات کا الاؤ روشن ہے۔ ان جذبات نے اس کے دل کو ایک عجیب اضطراب اور بے قراری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا محبوب ان جذبات اور احساسات کو سمجھنے سے قاصر ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ جس کی وجہ سے شاعر کا دل ہر وقت بے چین رہتا ہے۔ بقول شاعر:

یہاں شاعر نے محبوب کے ہونٹوں کو لب لعلیں کہا ہے یعنی محبوب کے ہونٹ لعل کی مانند سرخ ہیں جن سے خوش بو مہک رہی ہے۔ اسی طرح محبوب کی دل نشیں گفت گو اور شخصیت کو خوش بو اور باغ سے تشبیہ دی ہے۔ محبوب کی گفت گو دل پر اثر کرتی ہے اس کی سحر انگیز شخصیت دل موہ لیتی ہے۔ جس طرح باغ رنگا رنگ پھولوں اور پھلوں سے بھرا ہوتا ہے، اسی طرح محبوب کی شخصیت مُرنگا رنگ پہلو ہیں جو اثر انگیز اور راحت فزا ہیں۔ محبوب جہاں سے گزرتا ہے اس کی شخصیت کی خوش بو سے سارا ماحول مہک جاتا ہے۔

شعر حسنِ تغزل سے بھرپور ہے۔ ''لبِ لعلیں'' محبوب کے ہونٹوں کے لیے عمدہ تشبیہ ہے۔ اسی طرح محبوب کی موجودگی اور اس کی شخصیت کو ''باغ'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں ''چھلکائے ہوئے چلنا'' اور مصرعِ ثانی میں ''مہکائے ہوئے رہنا'' کے الفاظ کا صوتی آہنگ نہایت دل نشین ہے۔ شعر سادگی، سلاست اور روانی سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 3

اس حسن کا شیوہ ہے ، جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا ، شرمائے ہوئے رہنا

حلِ لغت شیوہ (عادت)

مفہوم محبوب کی عادت ہے کہ عاشق کو دیکھ کر وہ شرماتے ہوئے پردہ میں چلا جاتا ہے۔

تشریح

منیر نیازی دورِ جدید کے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ہیں۔ منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اپنی شاعری میں منیر نیازی جن جذبات و احساسات کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں کے ذریعے ان کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں کہ:

''منیر نے بات کی اور ختم کی، سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک ایک نقطہ، ایک ایک حرف ذہن کے جلو میں قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کی حیاداری کی تعریف کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب اتنا حیادار اور شرمیلا ہے کہ اس کی عادت ہے جب اسے معلوم ہو کہ کوئی عاشق اسے دیکھ رہا ہے تو وہ شرم و حیا کے مارے پردے میں چلا جاتا ہے۔ وہ عاشق کے سامنے شرمائے ہوئے رہتا ہے۔ محبوب کا اس طرح شرمانا اور گریز کرنا اس کے حسن میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اس طرح عاشق کی تڑپ مزید بڑھ جاتی ہے۔ بقول مصحفی:

دیکھ کر ہم کو نہ پردے میں تو چھپ جایا کر — ہم تو اپنے ہیں میاں غیر سے شرمایا کر

اور بقول منیر نیازی:

چھپاتے ہیں بہت وہ گرمیِ دل کو مگر میں بھی — گل رخ پر اڑی رنگت کے چھینٹے دیکھ لیتا ہوں

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا ہمیشہ سے یہی شیوہ رہا ہے کہ عاشق کو دیکھتے ہی پردے میں چلا جاتا ہے اور شرمائے ہوئے رہتا ہے۔ یہ عاشق کو عشق میں مزید تڑپانے اور بے قرار کرنے کا ایک حربہ بھی ہو سکتا ہے اور محبوب کی ادا بھی۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

حیا سے سر جھکا لینا، ادا سے مسکرا دینا — حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

''شیوہ'' کا مطلب عادت اور طرزِ عمل ہے۔ ''جب عشق نظر آئے'' کا مطلب ہے کہ جب محبت کا اظہار کیا جائے یا کسی کی جانب سے محبت عیاں ہو۔ مراد یہ ہے کہ جب عشق سامنے آتا ہے یا جب محبت کا اظہار کیا جاتا ہے تو حسن ایک مخصوص رویہ اختیار کرتا ہے۔ گویا حسن اور عشق ایک جان دار اور مجسم کردار ہیں۔ حسن انتہائی حساس ہے جو محبت کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔ ''پردے میں چلے

جانا'' شرم و حیا اور نزاکت کی علامت ہے۔ حسن کی خوبی ہے کہ وہ محبت کے اظہار پر شرما جاتا ہے اور پردے میں چلا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ صرف مجھ سے شرماتا ہو، غیروں سے ہنس ہنس کے بات کرتا ہو۔ یہ مضمون بھی منیر نیازی نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

مجھ سے محبت بھی ہے اس کو لیکن یہ دستور ہے اس کا — غیر سے ملتا ہے ہنس ہنس مجھ سے ہی شرماتا ہے (منیر نیازی)

یہاں شاعر نے حسن کی مشرقی روایات کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ شرم و حیا اور پردہ داری ہماری معاشرتی روایت کا حصہ ہیں۔ شاعر کا محبوب مشرقی روایت کا امین ہے۔ اس لیے جب وہ شاعر کی جانب دیکھتا ہے تو شرم و حیا کے باعث پردے میں چھپ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی ادا اور نزاکت ہے۔ دوسرا یہ کہ محبوب عاشق کی نگاہوں کی تپش کی تاب نہ لاتے ہوئے پردے میں چلا جاتا ہے اور دیر تک شرمائے رہتا ہے۔ گویا عاشق کی نگاہوں کا اثر دیر تک اسے بے چین رکھتا ہے۔

شعر سادگی، سلاست اور روانی سے بھرپور ہے۔ شاعر نے عام فہم اور سادہ الفاظ کے ذریعے حسن کی نزاکت کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ شعر کا لفظی اور صوتی حسن بہت کمال ہے۔

شعر نمبر 4

اک شام سی کر رکھنا ، کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

حلِ لغت کاجل (سرمہ) کرشمے (معجزہ، انوکھی بات) چمکانا (روشن کرنا)

مفہوم محبوب کا جل کے کرشمے سے ایک شام طاری کر دیتا ہے اور اپنی آنکھوں میں ایک چاند سا روشن رکھتا ہے۔

تشریح

منیر نیازی دورِ جدید کے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ہیں۔ منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اپنی شاعری میں منیر نیازی جن جذبات و احساسات کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں کے ذریعے ان کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں کہ:

''منیر نے بات کی اور ختم کی، سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک ایک نقطہ، ایک ایک حرف ذہن کے جلو میں قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کے کاجل اور اس کی آنکھوں کی تعریف کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی عادت ہے کہ آنکھوں میں کاجل لگا کر شام کا سا ماحول بنا لیتا ہے۔ گویا محبوب کے کاجل کے کرشمے سے شام کی تاریکی چھا جاتی ہے۔ محبوب کی آنکھوں میں سیاہ کاجل کی خوب صورتی کے سامنے دنیا کی سب رونقیں اور تمام نظارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ ہر چیز پر تاریکی چھا جاتی ہے گویا رات کا سماں بندھ جاتا ہے۔ یہ سب محبوب کی آنکھوں میں لگے خوب صورت کاجل کا کرشمہ ہے۔ بقول شاعر:

چھپ گئے سارے نظارے کیا بات ہو گئی — تو نے کاجل لگایا دن میں رات ہو گئی

یہاں شاعر نے صنعت حسنِ تعلیل کا نہایت عمدہ استعمال کیا ہے۔ کسی امر کی ایسی علت (وجہ) بیان کرنا جو حقیقت نہ ہو لیکن سننے میں خوب صورت لگے، حسنِ تعلیل کہلاتی ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد شام کا ہونا ایک لازمی امر ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ شام کا ہونا دراصل محبوب کے کاجل کا کرشمہ ہے۔ محبوب آنکھوں میں کاجل لگاتا ہے تو ہر سمت شام سی چھا جاتی ہے۔ شام کے وقت میں ایک کشش اور پُراسراریت ہوتی ہے اسی طرح محبوب کی آنکھوں میں کاجل بھی ایک کشش اور پُراسراریت پیدا کرتا ہے۔

شعر کے پہلے مصرع میں منیر نے شام کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ اُن کی غزلوں میں یہ استعارہ کئی طرح سے استعمال ہوا ہے۔

شامِ فراق آئی تو دل ڈوبنے لگا — ہم کو بھی اپنے آپ پہ کتنا غرور تھا (منیر نیازی)

ایک اور شعر میں منیر نیازی کہتے ہیں کہ:

دن بھر جو سورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں — شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آجاتے ہیں

مصرعِ ثانی میں شاعر نے محبوب کی آنکھوں کی چمک اور خوب صورتی کو چاند کی چمک سے تشبیہ دی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی آنکھیں اس قدر روشن اور چمک دار ہیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے محبوب اپنی آنکھوں میں ہمہ وقت چاند چمکائے رکھتا ہے۔ جس طرح چاند رات کی تاریکی میں چمکتا ہے اسی طرح محبوب کی آنکھوں کے کاجل سے بیرونی ماحول پر رات کی تاریکی چھا جاتی ہے اور اس تاریکی میں محبوب کی آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکتا محسوس ہوتا ہے۔

دوسرے مصرع میں چاند کا استعارہ ہے۔ چاند کا انسانی کیفیات سے زمانہ قدیم سے گہرا تعلق رہا ہے۔ جدید سائنسی انکشافات اور انسان کی چاند تک رسائی کے باوجود چاند نے استعاراتی معنوں میں اپنی معنویت کو برقرار رکھا ہے۔ چاند منیر نیازی کو بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ وہ چاند سے وابستہ جمالیاتی امکانات کھنگالتے ہیں اور بڑے منفرد انداز میں اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں اور ہر پیش کش میں کوئی نہ کوئی انوکھا پہلو لانے کی کوشش کی ہے۔

چاند نکلا ہے سرِ قریۂ ظلمت دیکھو — ہو گئی ہیں کیسی یہ خانوں کی رنگت دیکھو (منیر نیازی)

ایک اور شعر میں منیر نیازی کہتے ہیں:

اپنی ہی تیغِ ادا سے آپ گھائل ہو گیا — چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہو گیا

''اک شام سی کر رکھنا'' کا مطلب ہے آنکھوں کو شام کی طرح پُرکشش اور خوب صورت بنانا۔ ''کاجل کے کرشمے سے'' کا مطلب ہے کہ آنکھوں کی یہ دل کشی اور خوب صورتی کاجل لگانے کی وجہ سے ہے۔ محبوب نے کاجل اس خوب صورتی سے لگایا ہے کہ آنکھوں کی دل کشی بڑھ گئی ہے۔ بقول شاعر:

تمھارا کام اتنا ہے فقط کاجل لگا لینا — تمھاری آنکھ کی خاطر نظارے میں بناؤں گا (خالد ندیم شانی)

شعر حسنِ تغزل سے بھرپور ہے۔ شاعر نے محبوب کی آنکھوں کی خوب صورتی کو اجاگر کرنے کے لیے مظاہرِ فطرت سے نہایت عمدہ تشبیہات استعمال کی ہیں۔ مصرعِ اولیٰ میں شام سے تشبیہ دی ہے اور مصرعِ ثانی میں چاند سے تشبیہ دی ہے۔ مصرعِ اولیٰ میں ''کاجل کے کرشمے'' کے الفاظ میں حرف ''ک'' کی تکرار جب کہ مصرعِ ثانی میں ''چاند چمکائے'' کے الفاظ میں ''چ'' کی تکرار نہایت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے شعر کا لفظی اور صوتی حسن بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح ''رکھنا'' اور ''رہنا'' میں بھی ایک صوتی آہنگ ہے۔ شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

شعر نمبر 5

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا ، اکتائے ہوئے رہنا

حلِ لغت اکتائے ہوئے رہنا (بے زار رہنا، کسی چیز سے دل بھر جانا)

مفہوم اے منیرؔ تم نے تو عادت ہی بنالی ہے کہ جس بھی شہر میں رہتے ہو بے زار رہتے ہو۔

تشریح

منیر نیازی دورِ جدید کے اُردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ہیں۔ منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تحیر اور سادگی کا عنصر نمایاں ہے۔ اپنی شاعری میں منیر نیازی جن جذبات و احساسات کو اپنی گرفت میں لاتے ہیں۔ تشبیہات

اور استعاروں کے ذریعے ان کیفیات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے بارے میں اشفاق احمد کہتے ہیں کہ:

''منیر نے بات کی اور ختم کی، سننے والے سوچنے پر مجبور ہو گئے اور پھر ایک ایک نقطہ، ایک ایک حرف ذہن کے جلو میں قطرہ قطرہ ہو کر ٹپکنے لگا۔''

تشریح طلب شعر غزل کا مقطع ہے۔ اس میں شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے منیر تم نے تو اب یہی عادت اپنالی ہے کہ جس بھی شہر میں رہتے ہو اکتائے اکتائے اور بے زار بے زار سے رہتے ہو۔ کسی بھی شہر میں خوش نہیں رہتے۔ شاعر نے یہاں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اپنی بے زاری اور اکتاہٹ کی وجہ بیان نہیں کی۔ شاعر کی بے زاری کی وجہ اس کے قلبی جذبات اور احساسات بھی ہو سکتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں جذبات کا الاؤ روشن ہوتا ہے تو اس کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جب اس کے ان جذبات و احساسات کو کسی بھی سطح پر اہمیت نہیں ملتی تو یہ بات اس کی مایوسی میں اضافہ کر دیتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل اکتاہٹ اور بے زاری کا باعث بن جاتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کا دل اداس ہوتا ہے تو باہر کی خوشیاں، رونقیں اور نظارے اسے مزید اداس کر دیتے ہیں۔ اسے دوسروں کی خوشیاں دیکھ کر اکتاہٹ اور بے زاری ہونے لگتی ہے۔ بقول شاعر:

دل چپ ہو تو باہر کی فضا کچھ نہیں کہتی — ہو لاکھ کوئی شور مچاتا ہوا موسم

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شہر کے لوگ شاعر کے مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ وہ بے حس، خود غرض اور مفاد پرست لوگ ہیں۔ اس لیے شاعر ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے اس کے ہم مزاج لوگ نہیں مل رہے، جس کی وجہ سے اس کی مایوسی اور بے زاری میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بقول ناصر کاظمی:

جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی — بھری دنیا میں جی نہیں لگتا (ناصر کاظمی)

شاعر اپنے جذبات کی ناقدری کے سبب اکتایا ہوا رہتا ہے۔ جب اس کے ان جذبات و احساسات کو کسی بھی سطح پر اہمیت نہیں ملتی تو یہ بات اس کی مایوسی میں اضافہ کر دیتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل اکتاہٹ اور بے زاری کا باعث بن جاتی ہے۔

''شہر'' منیر نیازی کی شاعری میں خوابوں کا شہر ہے۔ یہ شہر کبھی خان پور کی یاد دلاتا ہے اور کبھی ساہی وال کی اور پھر لاہور میں ڈھل جاتا ہے۔ اس شہر میں سب کچھ ہے۔ شکستِ ذات بھی ہے، تخریب بھی ہے، تعمیر بھی ہے، ڈر بھی ہے، وحشت بھی ہے، دہشت بھی ہے، ویرانی بھی ہے اور تنہائی بھی۔ منیر نیازی کہتے ہیں:

آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو — بکھرے ہیں مثلِ موج ہوا شہر شہر میں

وہ جن کی یادوں کی دل کے اندر جلن ہے اتنی — ہزاروں میلوں پہ رہ گئے ہیں وہ شہر سارے

جیسے جیسے شہر پھیلتے جاتے ہیں اُن کی آبادی بڑھتی جاتی ہے۔ اس میں آباد لوگوں کی تنہائی اور کرب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ روشنیوں سے چمکتے ہوئے جدید شہروں میں یہ بیگانگی مزید نمایاں ہوتی ہے۔ اجنبی لوگوں کی موجودگی میں شہر کی گلیاں سونی معلوم ہوتی ہیں۔ بقول منیر نیازی:

گو ذرا فاصلے پر گھر کی ہر راحت بھی تھی — اجنبی شہروں میں رہتے عمر ساری کٹ گئی

شعر سادگی، سلاست اور روانی سے بھرپور ہے۔ مصرعِ ثانی میں ''رہنا'' کی تکرار ایک خاص لفظی حسن پیدا کرتی ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال ہے۔ شاعر نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے ایک گہری اور نفسیاتی کیفیت کو بیان کیا ہے۔

ا۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر کی بے چینی، گھبراہٹ اور جذبوں کی آگ دہکانے کی کیفیت کا سبب کیا ہے؟

جواب: شاعر ایک حساس انسان ہے۔ اس کے دل میں محبت کے جذبات اور احساسات کا الاؤ روشن ہے۔ ان جذبات نے اس

کے دل کو ایک عجیب اضطراب اور بے قراری میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس کا محبوب ان جذبات اور احساسات کو سمجھنے سے قاصر ہے یا پھر وہ جان بوجھ کر انھیں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ جس کی وجہ سے شاعر کا دل ہر وقت بے چین رہتا ہے۔

(ب) منیر نیازی نے خوش بو کے ساتھ تعلق و وابستگی کو کس طرح بیان کیا ہے؟

جواب: منیر نیازی کہتے ہیں کہ محبوب کے لب لعلیں سے خوش بوئیں چھلکتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک پورا باغ مہکائے ہوئے چلتا ہے۔

(ج) شیوۂ حسن کیا ہے؟

جواب: شاعر کہتے ہیں کہ شیوۂ حسن یہ ہے کہ جب عشق نظر آتا ہے تو حسن شرما کر پردے میں چلا جاتا ہے۔

(د) چوتھے شعر میں شاعر نے حسنِ تعلیل کو برتا ہے، وضاحت کریں۔

جواب: چوتھے شعر میں شاعر نے صنعت حسنِ تعلیل کا نہایت عمدہ استعمال کیا ہے۔ کسی امر کی ایسی علت (وجہ) بیان کرنا جو حقیقت نہ ہو لیکن سننے میں خوب صورت لگے، حسنِ تعلیل کہلاتی ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد شام کا ہونا ایک لازمی امر ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ شام کا ہونا دراصل محبوب کے کاجل کا کرشمہ ہے۔ محبوب آنکھوں میں کاجل لگاتا ہے تو ہر سمت شام سی چھا جاتی ہے۔

(و) شاعر نے کس عادت کو اپنا لیا ہے؟ اس جذبے کو تخلیقی سطح پر بیان کریں۔

جواب: شاعر نے بے زاری کی عادت کو اپنا لیا ہے۔ وہ جس شہر میں بھی رہتا ہے ہمیشہ بے زار رہتا ہے۔ شاعر کی بے زاری کی وجہ اس کے قلبی جذبات اور احساسات ہیں۔ جب انسان کے دل میں جذبات کا الاؤ روشن ہوتا ہے تو اس کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کے ان جذبات و احساسات کو کسی سطح پر اہمیت نہیں ملتی تو یہ بات اس کی مایوسی میں اضافہ کر دیتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل اکتاہٹ اور بے زاری کا باعث بن جاتی ہے۔ شاعر اپنے جذبات کی ناقدری کے سبب اکتایا ہوا رہتا ہے۔

۲۔ مصرعے مکمل کریں۔

(الف) اک آگ سی ۔۔۔ کی دہکائے ہوئے رہنا

(ب) چھلکائے ہوئے چلنا خوش بو۔۔۔۔ کی

(ج) اس ۔۔۔۔۔ کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے

(د) اک شام سی کر رکھنا۔۔۔۔ کے کرشمے سے

(و) جس شہر میں بھی رہنا، ۔۔۔۔۔ ہوئے رہنا

جواب:

(الف) اک آگ سی۔ جذبوں۔۔ کی دہکائے ہوئے رہنا

(ب) چھلکائے ہوئے چلنا خوش بو۔۔ لبِ لعلیں۔۔۔ کی

(ج) اس۔۔۔ حسن۔۔۔ کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے

(د) اک شام سی کر رکھنا۔۔ کاجل۔۔۔ کے کرشمے سے

(و) جس شہر میں بھی رہنا، ۔۔۔ اکتائے ۔۔۔ ہوئے رہنا

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(الف) شاعر آگ دہکائے ہوئے رہتا ہے:

(الف) احساسات کی (ب) جذبوں کی (ج) آہوں کی (د) نالوں کی

(ب) لب لعلین کا مطلب ہے:

(الف) موتی کا کنارا (ب) خوب صورت رخسار (ج) پتلے ہونٹ (د) سرخ ہونٹ

(ج) شاعر کا محبوب ہے:

(الف) شرمیلا (ب) غصیلا (ج) جوشیلا (د) جھگڑالو

(د) ''اک شام سی'' اور ''اک چاند سا'' میں ''سی'' اور ''سا'' قواعد کی رو سے ہیں:

(الف) استعارہ (ب) مجاز مرسل (ج) حروفِ تشبیہ (د) مشبہ بہ

(و) اس غزل کا آخری شعر قواعد کے لحاظ سے کہلاتا ہے:

(الف) مطلع (ب) بیت الغزل (ج) مقطع (د) حسن مطلع

۴۔ درج ذیل محاورات کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں:

اللے تللے کرنا، پتا پانی ہونا، کاغذ کھولنا، فیل مچانا، نو دو گیارہ ہونا

جواب:

محاورات	معانی	جملے
اَللّے تللّے کرنا	عیش و آرام کرنا، خوب مزے اُڑانا	باپ کی کمائی پر احمد نے خوب اللے تللے کیے۔
پتا پانی ہونا	خوف یا صدمے سے حوصلہ نہ رہنا	سانپ کو دیکھ کر حماد کا پتا پانی ہو گیا۔
کاغذ کھولنا	عیب فاش کرنا	اپنی زبان بند رکھو اگر تمھارے کاغذ کھول دیے تو منھ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔
فیل مچانا	شور مچانا	استاد کے جانے کے بعد بچوں نے خوب فیل مچایا۔
نو دو گیارہ ہونا	بھاگ جانا	پولیس کو دیکھتے ہی چور نو دو گیارہ ہو گیا۔

۵۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں:

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی، دہکائے ہوئے رہنا
اک شام سی کر رکھنا، کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں، چمکائے ہوئے رہنا

۶۔ منیر نیازی کی غزل کے قوافی بالترتیب لکھیں۔

غزل کے قوافی درج ذیل ہیں:

گھبرائے، دہکائے، مہکائے، شرمائے، چمکائے، اُکتائے

تشبیہ:

جب کسی چیز کو کسی مشترکہ صفت کی بنا پر اس کی کیفیت اور صورتِ حال کو مزید پُر تاثیر اور کیف آور بنانے کے لیے کسی دوسری چیز کے مانند قرار دیا جاتا ہے تو اسے علمِ بیان کی اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔ جس چیز کو تشبیہ دیں اسے مشبہ، جس چیز کے ساتھ تشبیہ دیں اسے مشبہ بہ، وہ صفت جس کی بنا پر تشبیہ دی جائے اسے وجہ شبہ اور وہ کلمہ یا حرف جو مشبہ اور مشبہ بہ کو ملاتا ہے، اسے حرفِ تشبیہ کہتے ہیں۔ اس طرح تشبیہ کے چار ارکان ہوئے:

۱۔ مشبہ ۲۔ مشبہ بہ ۳۔ حرفِ تشبیہ ۴۔ وجہ شبہ

مثلاً یہ کاغذ دودھ کی طرح سفید ہے۔

اس مثال میں ارکانِ تشبیہ اس طرح ہوں گے:

مشبہ	مشبہ بہ	حرفِ تشبیہ	وجہِ شبہ
کاغذ	دودھ	کی طرح	سفید

محاورے اور ضرب الامثال کی طرح تشبیہ کو بھی زبان کا زیور سمجھا جاتا ہے اور اس کے استعمال سے کلام میں حسن اور خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً: یہ تشبیہات دیکھیے:

پتھر کی طرح سخت، چٹان کے مانند مضبوط، شہد جیسا میٹھا، شیر کی طرح بہادر، ریشم کی مثل نرم، دن کی طرح روشن، رات کی طرح تاریک، تلوار کی طرح تیز، خون کی طرح سرخ، کوئلے کی طرح سیاہ، برف کی طرح ٹھنڈا، تیر کی طرح سیدھا، سمندر کی طرح گہرا وغیرہ ہو۔

طرفین تشبیہ: مشبہ اور مشبہ بہ کو طرفین تشبیہ کہا جاتا ہے۔

استعارہ: استعارہ کے لغوی معنی عاریتاً یا ادھار لینا کے ہیں مگر اصطلاح میں جب ہم کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کریں کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔

استعارہ کے تین ارکان ہوتے ہیں:

(۱) مستعار لہٗ (جس کے لیے استعارہ کیا جائے)

(۲) مستعار منہٗ (جس سے استعارہ لیا جائے)

(۳) وجہِ جامع (مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ میں مشترک صفت)

استعارے میں مستعار لہٗ کا ذکر نہیں ہوتا، یہ اس کا امتیاز ہے۔ اسی طرح مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ میں مشترک صفت کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ مثالیں:

(۱) کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے — رَن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

(۲) ماں کہتی ہے: میرا چاند آیا۔

دوسری مثال میں:

بیٹا — مستعار لہٗ (ذکر نہیں ہے)

چاند — مستعار منہٗ

خوب صورتی — وجہِ جامع (ذکر نہیں ہے)

پہلی مثال میں جرأت و ہمت کے باعث حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو شیر کہا گیا ہے لیکن شعر میں ان کا ذکر نہیں ہوا۔ اسی طرح دوسری مثال میں ماں اپنے خوب صورت بیٹے کو چاند کہتی ہے اور بیٹے کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔ یہ دونوں مثالیں استعارہ کی ہیں۔

۷۔ منیر نیازی کی غزل کے احتسابی پہلوؤں پر گفت گو کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

☆ منیر نیازی کی یہ غزل زبانی یاد کریں اور غزل گوئی کے مقابلے میں حصہ لیں۔

☆ اس غزل کے اشعار صحتِ تلفظ، دُرست آہنگ اور حرکات و سکنات و اشارات کے ساتھ پڑھیں۔

☆ منیر منیر نیازی کی شخصیت اور فنی حوالے سے کسی نامور محقق اور نقاد کی تصنیف کا مطالعہ کریں اور اہم باتوں سے دوستوں کو آگاہ کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام:

☆ طلبہ کو بتائیں کہ منیر نیازی اپنے معاصرین سے کس طرح منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

☆ منیر نیازی کا کلام سننے کے لیے طلبہ کو کسی مشاعرہ کا لنک بتائیں تاکہ طلبہ کا شعری ذوق بلند ہو۔

سبق: ۲۱ سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے

شاعر
احمد فراز
(1931-2008)

شاعر کا تعارف

پاکستان کے نام ور رومانوی شاعر احمد فراز کا اصل نام سید احمد شاہ اور تخلص فراز تھا۔ صوبہ خیبر پختون خوا کے شہر نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد شاہ جو برق تخلص کرتے تھے وہ بھی فارسی زبان کے ممتاز شاعر تھے۔ احمد فراز ایڈورڈ کالج پشاور میں طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شعرا سے بہت متاثر تھے۔

احمد فراز کی شاعری میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں بہ یک وقت ملتے ہیں۔ وہ سماجی ناانصافیوں کے خلاف ہر دور میں بغاوت کا عَلَم بلند کرتے رہے۔ اس کی پاداش میں انھوں نے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

احمد فراز مختلف اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے۔ وہ ادارہ اکادمی ادبیات کے بانی ڈائریکٹر جنرل تھے اور بعد ازاں اس کے چیئرمین بھی رہے۔ اس کے علاوہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے بھی چیئرمین رہے۔

احمد فراز نے شعر و ادب میں بہت کام کیا اور خوب نام کمایا۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''تنہا تنہا''، ''جاناں جاناں''، ''دردِ آشوب''، ''خوابِ گل پریشاں ہے''، ''نایافت''، ''شب خون'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا تمام کلام ''کلیاتِ احمد فراز'' کی شکل میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

احمد فراز کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے متعدد اعزازات سے نوازا گیا، جن میں آدم جی ادبی انعام، کمالِ فن ایوارڈ، ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز شامل ہیں۔ احمد فراز 23 اگست 2008 میں گردے فیل ہونے کی وجہ سے اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر ۱

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

حلِ لغت مراسم (روابط)

مفہوم محبوب رخصت ہوتے وقت ملاقات کے تمام راستے بند کر گیا ورنہ وہ چاہتا تو کچھ حد تک رابطہ رکھا جا سکتا تھا۔

تشریح

احمد فراز ہر دل عزیز اور مقبول عام ترقی پسند اور انقلابی سوچ کے حامل شاعر تھے۔ احمد فراز نے اپنی شاعری کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا۔ انھیں اپنی شاعری کے تیکھے پن اور کاٹ دار لب و لہجے کے باعث کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ نغمگی، موسیقیت، تغزل، روانی اور رومانویت ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ فراق گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کی بے رخی اور بے حسی کا تذکرہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ محبوب قطع تعلق کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن مجھے امید تھی کہ ماضی میں ہمارے جو اچھے مراسم رہے ہیں محبوب ان کا ضرور پاس رکھے گا اور وہ تعلق بالکل منقطع کرنے کی

بجائے آنے جانے اور دعا سلام کی حد تک تو رابطہ بحال رکھے ہی گا۔ لیکن افسوس کہ محبوب نے ماضی کے اچھے روابط کا بھی لحاظ نہ رکھا۔ محبوب رخصت ہوتے وقت میرے ساتھ تمام تعلقات توڑ کر چلا گیا۔ حالاں کہ ہمارے تعلقات ایسے نہ تھے کہ ایک دم توڑ دیے جاتے اور ملاقات کے تمام سلسلے منقطع کر دیے جاتے۔ بقول ندا فاضلی:

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ　　　　دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

"سلسلے توڑ گیا" کا مطلب ہے کہ بھی رشتے ناتے اور تعلقات ختم کر گیا۔ "جاتے جاتے" کے الفاظ سے عیاں ہے کہ یہ فیصلہ الوداع کہتے وقت جلد بازی میں اور بے سوچے سمجھے کیا گیا۔ ایک جگہ احمد فراز یوں کہتے ہیں:

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے　　　　وہ اک شخص ہے منھ پھیر کے جانے والا

شاعر جہاں محبوب کے ساتھ تعلقات منقطع ہونے کی بات کر رہا ہے وہیں وہ ماضی میں محبوب کے ساتھ اپنے مضبوط مراسم اور تعلقات کا ذکر بھی کر رہا ہے۔ اس میں شکوہ بھی ہے کہ محبوب کو تعلقات ختم کرتے وقت اتنا سوچ لینا چاہیے تھا کہ ماضی میں ہمارا ایک دوستانہ تعلق رہا ہے۔ ہم ایک عرصہ تعلق میں رہے ہیں، اس پر اتنا تو حق بنتا ہے کہ کبھی کبھار رابطے یا بات چیت کا کوئی ذریعہ برقرار رکھا جاتا۔ اتنا تو ہونا چاہیے تھا کہ ہمارا آنا جانا رہتا۔ رابطہ مضبوط نہ سہی کمزور ہی سہی لیکن کچھ نہ کچھ رہتا تو ضرور۔ محبوب نے ماضی کے تعلقات اور روابط کا ذرا بھی بھرم نہیں رکھا۔

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں　　　　ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی　　(وزیر علی صبا لکھنوی)

شعر اپنے اندر گہری جذباتیت اور دکھ لیے ہوئے ہے۔ "جاتے جاتے" کے الفاظ کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال ہے۔ "آتے جاتے" کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں، یہ معمول کے تعلقات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا صوتی آہنگ نہایت خوب صورت ہے۔ شعر سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ سہلِ ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔

شعر نمبر 2

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

حلِ لغت شکوہ (گلہ، شکایت) ظلمتِ شب (رات کی تاریکی)

مفہوم رات کے اندھیرے کو برا بھلا کہنے سے بہتر تھا ہر شخص اپنے حصے کی کوئی شمع جلا دیتا۔

تشریح

احمد فراز ہر دل عزیز اور مقبولِ عام ترقی پسند اور انقلابی سوچ کے حامل شاعر تھے۔ احمد فراز نے اپنی شاعری کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا۔ انھیں اپنی شاعری کے تیکھے پن اور کاٹ دار لب و لہجے کے باعث کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ نغمگی، موسیقیت، تغزل، روانی اور رومانویت ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ فراق گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

"احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔"

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہر شخص رات کی ظلمت پر شکایت تو کرتا ہے لیکن اسے دور کرنے کے لیے شمع کوئی نہیں جلاتا۔ جب کہ بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق ظلمت کو دور کرنے کی سعی کرے۔ "ظلمتِ شب" علامت ہے زمانے کی خرابی، جہالت، ظلم و ستم اور بدامنی کی۔ جب کہ شمع علامت ہے تعمیری کوششوں کی، علم و فن، امن و آشتی اور ترقی و خوش حالی کی۔ شاعر کہتا ہے کہ زمانے کی خرابی کا شکوہ شکایت کرتے رہنے کی بجائے ہر شخص کو انفرادی سطح پر کوئی نہ کوئی تعمیری کام کرنا چاہیے۔

تا کہ زمانے کی وہ خرابی دور ہو سکے۔ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جب ہر فرد پوری ایمان داری سے اپنی ذمہ داری ادا کرے گا تو پورے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ بقول علامہ اقبال:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ
(علامہ اقبال)

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو ہمیشہ زمانے کی خرابی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں اور اس خرابی کا ذمہ دار کبھی معاشرے کو اور کبھی حکومت کو ٹھہراتے ہیں۔ جب کہ اپنی ذمہ داریوں سے وہ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہوتے ہیں جو خرابیوں کا شکوہ کرنے کی بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ ان خرابیوں کو درست کرنے کے لیے ہم کیا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ذمہ داری بھرپور طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل　　　　ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا　　(جگر مراد آبادی)

شاعر کے ارد گرد زیادہ تر پہلی قسم کے لوگ ہیں جو ظلمتِ شب پر شکوہ کناں تو ہیں لیکن اسے دور کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتے یہاں تک کہ معمولی سی شمع بھی روشن کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ چناں چہ ایسے میں شاعر کہتا ہے کہ ظلمتِ شب کا شکوہ کرنے سے کہیں بہتر تھا کہ ہر شخص اپنے حصے کی کوئی شمع ہی روشن کر دیتا تا کہ رات کی تاریکی کچھ تو کم ہوتی۔ دنیا میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ ہر شخص اپنے حصے کا چراغ جلا کر کسی حد تک روشنی کر سکتا ہے۔ یہ بات اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم خرابیوں اور خامیوں پر محض باتیں کرتے رہیں۔ ہر شخص اپنی ہمت اور صلاحیت کے مطابق تعمیری جذبے سے کام لے۔ ایک نہ ایک دن یہ تاریکی ضرور ختم ہو جائے گی۔ بقول ساحر لدھیانوی:

کچھ اور بڑھ گئے ہیں اندھیرے تو کیا ہوا　　　　مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

"شمع جلاتے جاتے" کے الفاظ میں اشارہ ہے کہ خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی، چاہے وہ معمولی سی ہی کوشش کیوں نہ ہو۔ یہ معمولی سی کوشش چاہے زندگی کے اختتام پر ہی کیوں نہ کرنی پڑے، ضرور کرتے جانا چاہیے تا کہ آنے والوں کو اس سے فائدہ ہو اور وہ اس میں مزید اضافہ کرتے رہیں۔

شعر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو سوچنے سمجھنے اور عمل کی جانب راغب کرتا ہے۔ "ظلمتِ شب" کے الفاظ شروع میں لا کر اس سے متعلقہ الفاظ "شمع جلاتے" لائے گئے ہیں۔ یہ صنعت مراعات النظیر ہے۔ تشبیہ اور استعارہ کو خوب استعمال کیا ہے۔ شعر کے قافیہ اور ردیف میں صوتی آہنگ نہایت خوب صورت ہے۔

شعر نمبر 3

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی ، جان سے جاتے جاتے

حلِ لغت ہجر (جدائی) جاناں (محبوب) جان سے جانا (مراد مرنا)

مفہوم اے محبوب تیری جدائی میں مر جانا بہت آسان تھا مگر پھر بھی مرنے میں ایک عمر لگ گئی۔

تشریح

احمد فراز ہر دل عزیز اور مقبولِ عام ترقی پسند اور انقلابی سوچ کے حامل شاعر تھے۔ احمد فراز نے اپنی شاعری کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا۔ انھیں اپنی شاعری کے تیکھے پن اور کاٹ دار لب و لہجے کے باعث کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ نغمگی، موسیقیت، تغزل، روانی اور رومانویت ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ فراق

گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر محبوب کے ہجر و فراق میں ملنے والی تکالیف کا تذکرہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہم نے سوچا تھا کہ تم سے اگر جدا ہوئے تو مر جائیں گے، اس وقت یہ بات کہنا بہت آسان لگتا تھا۔ لیکن در حقیقت یہ بہت مشکل کام ہے۔ تیری جدائی اور فراق کو سہتے سہتے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ بقول اکبرالہٰ آبادی:

آئی ہو گی کسی کو ہجر میں موت — مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی

اے محبوب تیرے فراق اور ہجر میں موت بہت آسان تھی مگر مجھے جان سے جانے میں ایک عرصہ لگا۔ بظاہر یہ آسان لگتا ہے کہ انسان کسی کی جدائی میں مر جائے گا لیکن در حقیقت یہ مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ موت نجات ہے مگر نجات کی گھڑی اچانک نہیں آجاتی، بلکہ اس کے لیے بھی ایک طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ مشہور عربی مقولہ ہے:

الانتظار اشد من الموت — انتظار موت سے بھی سخت ہوتا ہے

موت کی تکلیف تو ایک بار سہنا پڑتی ہے اور انسان اس تکلیف سے نجات پالیتا ہے جب کہ ہجر کی اذیت میں انسان پل پل مرتا ہے اور پل پل جیتا ہے۔ وہ نہ زندوں میں ہوتا ہے نہ مردوں میں۔ محبوب کی جدائی میں وقت گزارنا موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چناں چہ شاعر کو ہجر کی اذیت کی نسبت موت کی سختی اور تکلیف زیادہ آسان لگتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت بھی نہیں آتی۔ بقول شاعر:

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے (داغ دہلوی)

شاعر نے راہِ محبت کی مشکلات کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ راہِ محبت میں موت بھی آسان نہیں ہوتی۔ موت کی وجہ سے محبوب کے ہجر و فراق میں تڑپنے کی اذیت سے نجات مل سکتی ہے لیکن عاشق کو مرتے مرتے بھی ایک عرصہ لگتا ہے۔ بقول غالب:

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

اور بقول احمد ندیم قاسمی:

تیرا ایمانِ وفا راہ کی دیوار بنا — ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا
(احمد ندیم قاسمی)

فراق گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

احمد فراز بنیادی طور پر رومانوی شاعر ہیں لیکن ان کی رومانیت میں حقیقت پسندی کا عنصر شامل ہے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کے ساتھ عصری شعور میں مکمل ادراک موجود ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا برتاؤ اس طرح ملتا ہے کہ صوری اور معنوی تاثر قاری کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

تشریح طلب شعر میں انتہائی سادگی سے گہرا فلسفہ بیان ہوا ہے۔ شاعر نے محبوب سے جدائی کی شدت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف کو خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ شعر میں ''جاتے جاتے'' کے الفاظ میں تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا عمدہ استعمال ہے۔ ''اکِ عمر لگی'' اور ''جان سے جانا'' محاورات ہیں جو نہایت برمحل استعمال ہوئے ہیں۔

شعر نمبر 4

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

حلِ لغت جشنِ مقتل (قتل گاہ کا جشن) برپا ہونا (منعقد ہونا) پابجولاں (پاؤں میں بیڑیاں)

مفہوم قتل گاہ میں کوئی جشن منعقد نہ ہوا اور نہ ہم بھی زنجیر میں جکڑے ہوئے خوشی سے قربان ہونے جاتے۔

تشریح

احمد فراز ہر دل عزیز اور مقبولِ عام ترقی پسند اور انقلابی سوچ کے حامل شاعر تھے۔ احمد فراز نے اپنی شاعری کو غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا۔ انھیں اپنی شاعری کے تیکھے پن اور کاٹ دار لب و لہجے کے باعث کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ نغمگی، موسیقیت، تغزل، روانی اور رومانویت ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ فراق گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر اپنی ہمت، بہادری اور جرأت کا تذکرہ کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ لوگ عموماً موت سے ڈرتے ہیں، موت کو شکست سمجھتے ہیں، موت کے نام پر ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن عاشقِ صادق کے لیے محبوب کی خاطر جان قربان کرنا سب سے بڑی سعادت ہوتی ہے۔ بقول شاعر:

عشق جب قتل گاہ کو جاتا ہے — یہ بھی روزِ سعید ہوتا ہے

دراصل یہ عاشق کے عشق کی صداقت کی علامت ہوتی ہے۔ جان قربان کرنے سے عاشق محبوب کی نظروں میں سرخرو ہو جاتا ہے۔ جان کی قربانی عشق کی صداقت کا سب سے بڑا امتحان ہوتا ہے۔ غالب کے بقول جب تلوار عاشق کا سر قلم کرنے کے لیے نیام سے باہر نکلتی ہے تو عاشق کے لیے وہ عید کے چاند کی مانند ہوتی ہے۔ بقول غالب:

ع — عید نظارا ہے شمشیر کا عریاں ہونا

چناں چہ شاعر کہتا ہے کہ قتل گاہ میں ہی کوئی جشن منعقد نہ ہوا اگر ہوتا تو ہم بھی خوشی خوشی جان قربان کرنے آتے، اگر چہ ہمارے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، مگر ہم اس حال میں بھی ضرور جاتے، کیوں کہ ہم اپنے عشق میں صادق ہیں۔ لیکن افسوس کہ قتل گاہ میں عاشقوں کی آزمائش کے لیے ایسا کوئی امتحان ہی نہ ہوا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
(بسمل عظیم آبادی)

شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہادر لوگ کسی بھی عظیم مقصد کے لیے جان کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، چاہے اس کے لیے انھیں سر ہی کیوں نہ کٹوانا پڑے۔ احمد فراز نے ساری زندگی جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیے رکھا۔ ان کی شاعری میں معاشرتی ناہمواریوں، سماجی ناانصافیوں اور حکومتِ وقت کے ظالمانہ فیصلوں کے خلاف شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔ چناں چہ شاعر نے یہاں اپنے عزم و حوصلے اور ہمت کا ذکر کیا ہے کہ میں ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اور اس کے عوض قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرتا ہوں۔ پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود میرے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ میں نے سنا تھا کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں قتل گاہ میں ایسا کوئی منظر نظر نہیں آیا ورنہ میں پابجولاں ہوتے ہوئے بھی بخوشی تختہ دار کی جانب جان قربان کرنے کے لیے چلا آتا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے بہادر لوگ جس حوصلے اور شان سے تختہ دار یا قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں وہ انھیں زندہ و جاوید اور امر کر دیتی ہے۔ بقول فیض احمد فیض:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے — یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
(فیض احمد فیض)

شعر روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ ''ناچتے، گاتے، جاتے'' کے الفاظ میں ''تے'' کی تکرار نہایت دل کش ہے۔ ان الفاظ سے شاعر کا عزم اور حوصلہ جھلکتا نظر آتا ہے جو مشکلات کے باوجود برقرار رہتا ہے۔

شعر نمبر 5

اُس کی وہ جانے اسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فرازؔ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

حل لغت پاس وفا (وفا کا لحاظ) نبھانا (وفاداری کرنا)

مفہوم اسے وفا کا لحاظ تھا یا نہیں مگر اے فرازؔ تم تو وفاداری نبھاتے۔

تشریح

احمد فرازؔ ہر دل عزیز اور مقبول عام ترقی پسند اور انقلابی سوچ کے حامل شاعر تھے۔ احمد فرازؔ نے اپنی شاعری کو غم دوراں اور غم جاناں کا ایک حسین امتزاج بنا کر پیش کیا۔ انھیں اپنی شاعری کے تیکھے پن اور کاٹ دار لب و لہجے کے باعث کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ نغمگی، موسیقیت، تغزل، روانی اور رومانویت ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ فراقؔ گورکھ پوری احمد فراز کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں۔

''احمد فراز کی شاعری اُردو میں ایک نئی اور توانا آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔''

تشریح طلب شعر میں شاعر اپنے آپ پر تنقید کرتا ہے کہ محبوب وفاداری کا لحاظ کرتا یا نہیں کرتا یہ اس کا فعل تھا لیکن تم تو وفاداری نبھاتے جاتے۔ تمھیں اپنے فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہیے بلکہ انھیں ہر حال میں ادا کرتے رہنا چاہیے تھا۔ محبوب کا اپنا ظرف ہے اور تمھارا اپنا ظرف ہے۔ اس شعر میں خود احتسابی کا انداز موجود ہے لیکن ساتھ ساتھ محبوب کی بے رخی کی جانب بھی اشارہ ہے۔ شاعر نے در پردہ محبوب کو بے وفا کہا ہے۔ لیکن ساتھ خود پر تنقید بھی کی ہے کہ محبوب نے وفا کی یا نہیں کی یہ اس کا معاملہ تھا لیکن تمھیں تو وفا کرنی چاہیے تھی۔ شاعر نے محبوب کے رویے پر شک ظاہر کرتے ہوئے خود سے پاس داری وفا کا مطالبہ کیا ہے۔

محبوب تو بے وفائی کیا ہی کرتے ہیں لیکن عاشق وفا نبھاتے ہیں اور اس کے لیے جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔ لہٰذا محبوب کے رویے پر نالاں ہونے کی بجائے اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے اور اس کی اصلاح کرنی چاہیے۔

شعر سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ ''تھا کہ نہ تھا'' میں لفظ ''تھا'' کی تکرار ہے اور تضاد بھی ہے۔ ''پاسِ وفا'' اور ''نبھاتے جاتے'' جیسے الفاظ نہایت خوب صورتی سے استعمال ہوئے ہیں جو محبت و وفاداری کی علامت ہیں۔

مشقی سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) احمد فرازؔ سلسلۂ دوستی ختم ہونے کے باوجود مراسم رکھنے کی خواہش کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟

جواب: احمد فرازؔ سلسلۂ دوستی ختم ہونے کے باوجود مراسم رکھنے کی خواہش اس بنا پر کر رہے ہیں کہ ماضی میں محبوب کے ساتھ ان کے اچھے اور مضبوط تعلقات رہے ہیں۔ محبوب کو ماضی کے ان تعلقات کا ضرور پاس رکھنا چاہیے اور سلسلۂ دوستی بالکل منقطع کرنے کی بجائے معمول کے مراسم یعنی آنے جانے اور دعا سلام کی حد تک تو رابطہ بحال رکھنا چاہیے۔

(ب) دوسرے شعر سے ہمیں کون سا اخلاقی سبق ملتا ہے؟

جواب: دوسرے شعر میں شاعر نے پیغام دیا ہے کہ رات کی تاریکی کا شکوہ کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ معمولی سی شمع جلا کر اپنے حصے کا تعمیری کام کیا جائے۔ یعنی برے حالات پر رونے دھونے کی بجائے ہر شخص انفرادی سطح پر حالات درست کرنے کی سعی کرے اور اپنی ذمہ داری نبھائے۔

(ج) شاعر کو ہجر میں مرنا بہ یک وقت آسان اور مشکل کیوں لگتا ہے؟

جواب: شاعر کو ہجر میں مرنا آسان لگتا تھا کیوں کہ اسے ہجر کی اذیت اور تکلیف موت کی تکلیف اور سختی کی نسبت آسان لگتی تھی۔ ہجر میں پل پل مرنا پڑتا ہے جب کہ موت ایک بار ہی خاتمہ کر دیتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ موت پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا۔ موت اپنے وقت پر آتی ہے۔ اس لیے شاعر کو بظاہر ہجر میں مرنا آسان لگتا تھا لیکن اس مرنے میں بھی اسے ایک عمر لگی۔

(د) احمد فرازؔ کا چوتھا شعر انقلابی اور مزاحمتی نوعیت کا ہے اس کی وضاحت کریں۔

جواب: احمد فرازؔ کا چوتھا شعر انقلابی اور مزاحمتی نوعیت کا ہے۔ اس میں پیغام ہے کہ بہادر لوگ کسی بھی عظیم مقصد کے لیے جان کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، چاہے اس کے لیے انھیں سر ہی کیوں نہ کٹوانا پڑے۔ وہ خوشی خوشی ناچتے گاتے سر کٹانے کو تیار ہوتے ہیں۔ احمد فرازؔ نے ساری زندگی جاگیرداروں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے رکھا۔ ان کی شاعری میں معاشرتی ناہمواریوں، سماجی ناانصافیوں اور حکومتِ وقت کے ظالمانہ فیصلوں کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔

چناں چہ انھوں نے یہاں اپنے عزم و حوصلے اور ہمت کا ذکر کیا ہے کہ میں ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کی ہمت رکھتا ہوں اور اس کے عوض قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتا ہوں۔ پاؤں میں بیڑیاں ہونے کے باوجود میرے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ میں نے سنا تھا کہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے لیکن یہاں قتل گاہ میں ایسا کوئی منظر نظر نہیں آیا ورنہ میں پابجولاں ہوتے ہوئے بھی بخوشی تختہ دار کی جانب جان قربان کرنے کے لیے چلا آتا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہے بہادر لوگ جس حوصلے اور شان سے تختہ دار یا قتل گاہ کی طرف جاتے ہیں وہ انھیں زندہ و جاوید اور امر کر دیتی ہے۔

(ہ) آپ کے خیال میں کیا یک طرفہ طور پر وفا کا رشتہ نبھایا جا سکتا ہے؟

جواب: یک طرفہ طور پر وفا کا رشتہ نبھایا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار خود ہے۔ کسی دوسرے کی بے وفائی ہماری بے وفائی کا جواز فراہم نہیں کرتی۔ اگر ہمیں پاسِ وفا ہے تو وفا نبھاتے رہنا چاہیے۔

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) شکوۂ ۔۔۔۔۔ سے تو کہیں بہتر تھا

(ب) پھر بھی اک ۔۔۔۔۔ جان سے جاتے جاتے

(ج) ورنہ اتنے تو ۔۔۔۔۔ تھے کہ آتے جاتے

(د) جشن مقتل ہی نہ ۔۔۔۔۔ ہوا ورنہ ہم بھی

(ہ) تم ۔۔۔۔۔ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

جواب:

(الف) شکوۂ ۔۔۔۔۔ ظلمتِ شب ۔۔۔ سے تو کہیں بہتر تھا

(ب) پھر بھی اک ۔۔۔ عمر لگی ۔۔۔ جان سے جاتے جاتے

(ج) ورنہ اتنے تو۔۔۔۔مراسم۔۔۔۔تھے کہ آتے جاتے

(د) جشنِ مقتل ہی نہ۔۔۔۔برپا۔۔۔ہوا ورنہ ہم بھی

(ہ) تم۔۔۔فرازؔ۔۔۔۔اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) جاتے جاتے توڑ گیا:

(الف) تعلقات (ب) راہ و رسم (ج) مراسم (د) سلسلے

(ب) اپنے حصے کی جلاتے:

(الف) آگ (ب) موم بتی (ج) اگربتی (د) شمع

(ج) شاعر نے حوصلہ شکنی کی ہے:

(الف) مایوسی کی (ب) اداسی کی (ج) تنہائی کی (د) شکوہ شکایت کی

(د) اگر جشنِ مقتل برپا ہوتا تو شاعر جاتا:

(الف) ناچتے ہوئے (ب) گاتے ہوئے (ج) گریہ وزاری کرتے ہوئے (د) ناچتے گاتے ہوئے

(ہ) فرازؔ غزل کے مقطع میں بے وفائی کے بدلے بات کر رہے ہیں:

(الف) بدلہ لینے کی (ب) وفا کرنے کی (ج) بے وفائی کی (د) تعلق منقطع کرنے کی

۴۔ احمد فرازؔ کی اس غزل کا کون سا شعر آپ کو زیادہ پسند ہے؟ وجہ بھی بیان کریں۔

جواب: مجھے احمد فرازؔ کی اس غزل کا درج ذیل شعر بہت پسند آیا:

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

اس شعر میں شاعر نے تلقین کی ہے کہ برے حالات کا شکوہ کرنے سے بہتر ہے کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق حالات کو بہتر کرنے کی سعی کرے۔ زمانے کی خرابی کا شکوہ شکایت کرتے رہنے کی بجائے ہر شخص کو انفرادی سطح پر کوئی نہ کوئی تعمیری کام کرنا چاہیے تاکہ زمانے کی وہ خرابی دور ہو سکے۔ معاشرہ افراد ہی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جب ہر فرد پوری ایمان داری سے اپنی ذمہ داری ادا کرے گا تو پورے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کے جملے بنائیں۔

مراسم ظلمتِ شب جشنِ مقتل پابجولاں پاسِ وفا

جواب:

الفاظ و تراکیب	جملے
مراسم	ہمسایوں کے ساتھ ہمارے بہت اچھے مراسم ہیں۔
ظلمتِ شب	ظلمتِ شب کا شکوہ کرنے سے بہتر ہے کوئی شمع جلائی جائے۔
جشنِ مقتل	جب جشنِ مقتل برپا ہوتا ہے تو سرفروشوں کے دل میں سرفروشی کی تمنا بڑھ جاتی ہے۔
پابجولاں	قیدی کو پابجولاں عدالت میں لایا گیا۔
پاسِ وفا	اگر تمھیں ذرا بھی پاسِ وفا ہوتا تو آخری دم تک محبت نبھاتے۔

۶۔ اس غزل کے قوافی اور ردیف کی پہچان کرتے ہوئے اپنی کاپیوں میں درج کریں۔

جواب:

قوافی: جاتے، آتے، جلاتے، گاتے، نبھاتے

ردیف: جاتے

۷۔ مندرجہ ذیل اشعار کی فکری و فنی حوالوں سے تشریح کریں:

(الف) شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

(ب) جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

صنعت مراعات النظیر:

وہ صنعت جس کے ذریعے سے شعر میں کچھ ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جو ایک ہی رعایت یا ایک ہی قبیلے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً: اقبالؔ کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

اس شعر میں ناخدا (کشتی کے ملاح)، بحر، کشتی اور ساحل کے الفاظ جمع ہو جانے سے مراعات النظیر کی شرائط پوری ہو گئی ہیں۔

۸۔ احمد فرازؔ کی اس غزل میں ایسے شعر کی شناخت کریں جس میں آپ سمجھتے ہیں کہ صنعت مراعات النظیر استعمال ہوئی ہے۔

جواب:

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

اس شعر میں "ظلمتِ شب" کے الفاظ ابتدا میں لا کر اس سے متعلقہ الفاظ "شمع جلاتے" استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ صنعت مراعات النظیر ہے۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

۱۔ احمد فراز کی یہ غزل زبانی یاد کریں اور دوستوں کو سنائیں۔

۲۔ احمد فراز کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں اور اشعار کا برمحل استعمال کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

۱۔ طلبہ کو مردف اور غیر مردف غزل کا فرق سمجھائیں۔

۲۔ طلبہ کو شعری محاسن سے روشناس کرائیں۔

۳۔ طلبہ کو غزل کی دیگر شعری اصناف سخن سے انفرادیت کے بارے میں بتائیں۔

سبق: ۲۲ بادباں کھلنے سے پہلے اشارہ دیکھنا

شاعرہ
پروین شاکر
(1952-1994)

شاعرہ کا تعارف

بیسویں صدی کی ممتاز اردو شاعرہ کا پورا نام سیدہ پروین شاکر تھا۔ ابتدا میں ان کا تخلص ''بینا'' تھا۔ کراچی میں پیدا ہوئیں لیکن ان کا آبائی وطن حسین آباد ضلع شیخوپورہ بہار تھا۔ پروین شاکر نے رضویہ کالونی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور سرسید کالج کے شعبۂ فنون میں داخلہ لیا۔ انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے انگریزی ادب اور لسانیات میں ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۸۲ء میں انھوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا اور یوں کسٹم اینڈ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر کسٹم کے عہدے پر فائز ہوگئیں۔ اس سے پہلے وہ نو سال تک درس و تدریس کے شعبے سے بھی وابستہ رہیں۔

ادبی زندگی میں ان کی سرگرمیاں ۱۹۶۶ء میں اس وقت شروع ہوئیں جب سرسید کالج کی بزمِ ادب نے ایک مقابلہ بیت بازی منعقد کروایا۔ یہ پہلا پروگرام تھا جس میں پروین شاکر کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوا۔ انھیں گولڈ میڈل دیا گیا۔ پروین شاکر نے بہت چھوٹی عمر میں شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔ اردو اخبارات میں مضامین بھی شائع ہوئے۔ پروین شاکر کی شادی اپنے کزن ڈاکٹر نصیر سے ہوئی جو بعد میں علیحدگی پر منتج ہوئی۔

شاعری کے پہلے مجموعے ''خوشبو'' کو زبردست پذیرائی ملی۔ ''صدبرگ''، ''خودکلامی''، ''انکار''، اور ''کفِ آئینہ'' کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے کالموں کا مجموعہ ''گوشۂ چشم'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعدازاں ان کی شاعری کلیات ''ماہِ تمام'' کی صورت میں سامنے آئی۔ پروین شاکر نے غزل کے ساتھ ساتھ آزاد نظم میں طبع آزمائی کی۔ ان کے نمایاں موضوعات محبت، نسوانیت پسندی اور سماجی ذلتیں ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں محبت، حسن اور ان کے تضادات کو نئے زاویوں سے پرکھتی اور استعاروں، تشبیہات وغیرہ کا عمدہ استعمال کرتی ہیں۔

تتلی، بادل، خوشبو، بارش اور آندھی وغیرہ ان کے معروف استعارے اور علامتیں ہیں۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے انھیں تمغائے حسنِ کارکردگی دیا گیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو پروین شاکر کی کار اسلام آباد میں ایک بس سے ٹکرائی جس کے باعث ان کا انتقال ہوا۔ جس سڑک پر یہ حادثہ ہوا اس کا نام پروین شاکر کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

اشعار کی تشریح

شعر نمبر 1

بادباں کھلنے سے پہلے کا اِشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا

حلِ لغت بادباں (وہ پردہ جو بحری جہاز کا رخ بدلنے یا اسے ہوا کے زور پر چلانے کے لیے لگایا جاتا ہے)

مفہوم آغازِ سفر کے وقت بادبان کھلنے سے پہلے اشارہ دیکھتے رہنا، میں سمندر پر نظر رکھتی ہوں اور تم ساحل پر نظر رکھو۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ اندازِ بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

تشریحِ طلب شعر میں شاعرہ کہتی ہے کہ اے محبوب سفر کے آغاز میں تم قدرت کے اشاروں کو سمجھنا، میں زمانے کی مشکلات اور مصائب پر نظر رکھتی ہوں تم منزل کو دھیان میں رکھنا۔ جس طرح ایک عقل مند ملاح بحری سفر کے آغاز کے وقت ہوا کا رخ اور سمت دیکھتے ہوئے بادبان کھولتا ہے اور اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اس کی نظر سمندر کی لہروں پر ہوتی ہے کہ کہیں کوئی طوفانی موج بحری جہاز کو نقصان نہ پہنچا دے۔ ایک تجربہ کار ملاح ہی جہاز کو طوفانی لہروں اور بھنور سے نکال سکتا ہے ورنہ جہاز مسافروں سمیت ڈوب جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملاح کی نظر ساحل پر بھی ہوتی ہے کہ جو اس کی منزل ہے۔

کشتیوں کا تو نام ہوتا ہے　　شوق کو بادبان ملتے ہیں　　(عرفان صدیقی)

اسی طرح شاعرہ بھی محبت کے سفر کے آغاز سے پہلے اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے آگاہ ہے۔ اس لیے وہ محبوب سے کہتی ہے کہ اس سفر کی ابتدا سے پہلے قدرت کے اشارات کو مدِ نظر رکھنا۔ زمانے کی اونچ نیچ کا لحاظ رکھنا۔ میں زمانے کی مشکلات اور مصائب کو برداشت کروں گی مگر تم منزل پر دھیان رکھنا۔

پوچھو سمندروں سے کبھی خاک کا پتہ　　دیکھو ہوا کا نقش کبھی بادبان پر　　(شکیب جلالی)

''بادباں'' اس پردے کو کہتے ہیں جو بحری جہازوں میں ہوا کی قوت استعمال کرتے ہوئے جہازوں کی سمت تبدیل کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ ''بادباں کھلنے سے پہلے'' کا لمحہ نئے سفر، نئی محبت اور نئے آغاز کی علامت ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب سب کچھ تیار ہوتا ہے لیکن ابھی سفر شروع نہیں ہوا ہوتا۔ اس لمحے ہوا کی سمت، سمندر کی لہریں اور موسم کے آثار دیکھے جاتے ہیں۔ اس لمحے کے اشارے کو سمجھنا نہایت اہم ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سفر کیسا رہے گا۔ ہوا کی تیزی اور طوفان کی وجہ سے اگر جہاز کا رخ تبدیل ہونے لگے تو ملاح بادباں کھول دیتا ہے تاکہ جہاز درست سمت پر رہے۔ یہ تمام تر ذمہ داری ملاح کی ہوتی ہے کہ وہ بادبان کے کھلنے کے اشارے سمجھے اور کنارے پر بھی نظر رکھے کہ منزل کتنی دور ہے۔

چناں چہ شاعرہ کہتی ہے کہ محبت کے سفر کی ابتدا سے پہلے اس راہ کی مشکلات کے اشارات کو ضرور دیکھنا کہ درپیش چیلنجز سے کیسے نمٹنا ہے۔ حالات کے نشیب و فراز اور زندگی میں آنے والے طوفانوں اور بحرانوں کا سامنا کیسے کرنا ہے۔ میں سمندر دیکھتی ہوں اور تم کنارہ دیکھتے رہنا۔ یہاں سمندر زندگی کا استعارہ ہے اور کنارہ منزلِ مقصود کا استعارہ ہے۔ یعنی میں زندگی کی مشکلات پر نظر رکھتی ہوں اور تم منزلِ مقصود پر نظر رکھو۔

کنارہ ڈھونڈنے کی چاہ تک مجھ میں نہیں ہوگی　　میں اپنے گرد اک ایسا سمندر دیکھ سکتی ہوں　　(پروین شاکر)

یہ شعر زندگی کے خوابوں اور ارادوں کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔ بعض لوگ زندگی میں بڑے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کچھ بڑا اور خاص ہو۔ وہ عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ وہ توانائی سے بھرپور اور اپنے ارادوں میں بلند ہوتے ہیں، اپنے ارادوں کی تکمیل میں وہ راستے کی مشکلات سے بھی نہیں گھبراتے۔ وہ بھرپور طریقے سے زندگی جینا چاہتے ہیں۔ ان کا عزم و حوصلہ ہر طوفان سے ٹکرانے کو تیار ہوتا ہے۔ زمانے کے سمندر میں وہ غوطہ زن ہو کر مرادوں کے موتی تلاش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔

جان کا نذرانہ دینے سے ہی ملتی ہے مُراد　　کچھ نہیں ہاتھ آتا خاک و خون میں لتھڑے بغیر

دوسری طرف کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ وہ مشکلات میں نہیں پڑنا چاہتے، وہ ہمیشہ آسان اور محفوظ راستوں پر چلنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے سے ڈرتے ہیں اور زمانے کے سمندر میں وہ لہروں کا مقابلہ کرنے کی بجائے کنارے پر کھڑے رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس شعر میں شاعرہ کہتی ہے کہ میں بلند حوصلہ اور پرعزم ہوں اس لیے میں بڑے خواب دیکھ رہی ہوں۔ زمانے کے سمندر میں میری نظر لہروں پر ہے۔ میں سمندر دیکھتی ہوں اور

اس کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب کہ تم خطرات کا مقابلہ کرنے سے گھبراتے ہوئے صرف کنارہ دیکھتے ہو لہٰذا ہم دونوں اپنے اپنے مقاصد اور عزائم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ میں سمندر دیکھتی ہوں اور تم چھوٹے مقاصد پر خوش رہتے ہوئے کنارہ دیکھتے رہنا کیوں کہ لہروں کے تھپیڑے سہنا کم ہمت لوگوں کا کام نہیں۔

شعر کی ابتدا میں ''بادباں'' کا لفظ لا کر اس سے متعلقہ الفاظ ''سمندر'' اور ''کنارہ'' لائے گئے ہیں جو صنعتِ مراعاۃ النظیر ہے۔ استعارے اور علامت کے پردے میں شاعرہ نے زندگی کے گہرے مفاہیم کو بیان کیا ہے۔

شعر نمبر 2

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا

حل لغت بچھڑنا (جدا ہونا)

مفہوم محبوب سے جدا ہونا ہی میرے لیے آسان نہ تھا لیکن وقتِ رخصت اس کا پلٹ کر دیکھنا مزید تکلیف دہ ثابت ہوا۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ اندازِ بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

یہ شعر بچھڑنے کے لمحے کی اذیت کو بیان کرتا ہے۔ بچھڑنا صرف ایک عمل نہیں بلکہ شاعرہ کے لیے ایک ایسا کرب تھا جس میں دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی کیفیت چھپی تھی۔ عاشقوں کی تمام عمر اس امید میں بسر ہوتی ہے کہ شاید کسی دن محبوب کی محبت میسر آجائے۔ لیکن عموماً یہ امید بَر نہیں آتی اور محبوب سے جدائی ہو جاتی ہے۔ عاشق وصل کی تمنا کرتا ہے لیکن اسے فراق کا دکھ سہنا پڑتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے اس کی ہر خواہش کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ بقول آتش:

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش — برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

محبوب سے جدائی کا لمحہ بہت المناک ہوتا ہے۔ شاعرہ محبوب سے جدائی کے لمحے کی اذیت بیان کر رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ محبوب سے بچھڑنا کوئی آسان مرحلہ نہیں تھا۔ یہ آرزوؤں کے ٹوٹنے کا لمحہ تھا۔ یہ انتہائی بے بسی اور دل کی شکست و ریخت کا لمحہ تھا۔ اس کٹھن مرحلے کی اذیت میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب محبوب نے جدا ہوتے ہوئے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ جدائی کے لمحے محبوب کا پلٹ کر دیکھنا ایسا تکلیف دہ عمل تھا جس کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عشق کا راستہ مشکلات سے بھرا ہوا ہے۔ عشق کرنا، آگ کا دریا عبور کرنا ہے۔ بقول شاعر:

یہ عشق نہیں آساں، اتنا ہی سمجھ لیجے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

عشق کے راستے پر چلتے ہوئے اک ایسا موڑ بھی آتا ہے جب محبوب سے جدا ہونا پڑتا ہے۔ جدائی کا لمحہ سب سے کٹھن ہوتا ہے۔ بعض اوقات بچھڑنے کا لمحہ محض ظاہری جدا ہونے کا نام نہیں بلکہ دلوں کے درمیان بھی ایک طویل جدائی کا آغاز ہوتا ہے۔

اس شعر میں ''مڑ کر دوبارہ دیکھنا'' خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جدائی کے وقت پلٹ کر دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ جدائی کا سارا درد، ساری محبت اور بچھڑنے کی بے بسی کی جھلک ''مڑ کر دوبارہ دیکھنے'' سے عیاں ہوتی ہے۔ شاعرہ کی زندگی میں یہ ایسا منظر تھا جیسے لمحہ تھم گیا ہو اور سارا درد دل کی دھڑکن میں سمٹ آیا ہو، پلٹ کر دیکھنا اس بات کا اشارہ تھا کہ دل کے کسی گوشے میں تعلق اب بھی باقی ہے، رشتہ ابھی مکمل ٹوٹا نہیں، امید کی لَو ابھی ختم نہیں ہوئی لیکن درد بھی تھمنے والا نہیں۔

ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت — تارا سا اک خیال تری چشمِ تر پہ تھا

جدائی کا غم سہنا آسان نہیں۔ بچھڑتے وقت محبوب کا مڑ کر دیکھنا اس درد کو اور بڑھا دیتا ہے۔ بقول شاعر:

جاتے جاتے ان کا رکنا اور مڑ کر دیکھنا — جاگ اٹھا آہ میرا درد تنہائی بہت (لطیف ہارونی)

محبت میں بچھڑنے کے باوجود دل کا جھکاؤ، پلٹ کر دیکھنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ وہ خاموش اقرار ہوتا ہے جسے زبان تو ادا نہیں کر پاتی مگر آنکھیں سب کچھ کہہ دیتی ہیں۔

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ — آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

جدائی کے وقت ''مڑ کر دیکھنا'' گویا ایک ''خاموش بات'' تھی۔ یہ ایک ایسا خاموش پیغام تھا جس میں کہا جا رہا تھا کہ چاہنے کے باوجود حالات نے راستے جدا کر دیے مگر دل کی گہرائی میں محبت اب بھی زندہ ہے۔ بقول وصی شاہ:

ہزاروں دکھ پڑیں سہنا محبت مر نہیں سکتی — ہے تم سے بس یہی کہنا محبت مر نہیں سکتی

شاعرہ کہتی ہیں کہ محبوب سے بچھڑنا آسان نہ تھا۔ محبوب زندگی کا محور و مرکز تھا۔ محبت کی شدت میں دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑتی رہتی ہے۔ محبوب کی قربت زندگی کی سب سے بڑی نعمت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے محبوب سے بچھڑتے وقت دل میں ایک خاموش چیخ بلند ہوتی ہے۔ جسم و جان میں ایک طوفان برپا ہوتا ہے اور اندر ہی اندر شکست و ریخت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چیز اپنی رعنائی کھو دیتی ہے اور وقت بوجھل لگنے لگتا ہے۔ دل میں ایک خالی پن اور محرومی کا گہرا درد چھا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر محبوب آخری بار مڑ کر دیکھ لے تو عاشق کی کیفیت اور زیادہ اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ اس لمحے امید اور مایوسی کا عجیب سا امتزاج دل کو گھیر لیتا ہے۔

شاعرہ کہتی ہیں کہ محبوب سے جدائی بذاتِ خود ایک قیامت تھی لیکن جب بچھڑتے لمحے محبوب نے مڑ کر دیکھا تو دل کی حالت ناقابلِ بیان ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کا مڑ کر دیکھنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بھی دل سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ اس لیے جب میرے محبوب نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا تو اس منظر میں ایک ہلکی سی روشنی بھی تھی۔ اس لمحے میں یہ احساس پھر سے زندہ ہو گیا کہ شاید یہ آخری لمحہ نہ ہو، شاید کوئی راستہ نکل آئے، شاید یہ کسی نئے سفر کا آغاز ہو۔

اس شعر میں بتایا گیا ہے کہ بچھڑنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ اس میں جدائی کے وقت کی پیچیدگی بیان کی گئی ہے۔ علیحدگی کا عمل دل پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ لیکن بچھڑتے وقت جب وہ شخص مڑ کر آخری بار دیکھتا ہے تو دل میں جدائی کے نقوش اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ انسان بظاہر چل پھر رہا ہوتا ہے مگر دل کے اندر سے زندگی کا رنگ جدائی کے احساس سے پھیکا پڑ جاتا ہے۔

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا — بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

شعر سادگی، روانی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ ''جاتے جاتے'' کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا عمدہ نمونہ ہے۔ دوسرا مصرع آنکھوں کے سامنے ایک منظر کھینچ دیتا ہے۔ یہ شعر جُدائی، رُخصت اور آخری منظر کا بھرپور تاثر دیتا ہے، جس میں جذبے کی شدت قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ ''مڑ کر دوبارہ دیکھنا'' محبت کے رشتے کی وہ نادیدہ ڈور ہے جو ابھی ٹوٹی نہیں۔ شعر کسی مشکل لفظ یا پیچیدہ ترکیب سے پاک ہے اور مجموعی طور پر ایک ڈرامائی تاثر پیدا کرتا ہے۔

شعر نمبر 3

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں ! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

حل لغت شباہت (ہم شکل، مشابہت) شبِ ہجراں (تنہائی کی رات) ستارہ دیکھنا (قسمت یا نصیب دیکھنا، انجام دیکھنا)

مفہوم چاند محبوب کی شباہت لیے دروازے پر آ گیا ہے۔ اے جدائی کی رات! تو اب اپنی قسمت کا ستارا دیکھ۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ انداز بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

اردو شاعری میں محبوب کے لیے چاند کا استعارہ عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ شاعری میں چاند کو محبوب کا استعارہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ یہ حسن، نور اور پاکیزگی کا پیکر ہے۔ جس طرح چاند کی چمک اندھیرے میں امید جگاتی ہے، اسی طرح محبوب کا دیدار بھی عاشق کے دل کو روشن کر دیتا ہے۔ چاند اپنی بلندی کی وجہ سے دور ہوتا ہے۔ اسی طرح محبوب بھی چاند کی طرح دسترس سے باہر ہوتا ہے۔ ٹھنڈی چاندنی کی طرح محبوب کا تصور بھی دل کو سکون دیتا ہے۔ چاند، محبوب کے لافانی حسن کی ترجمانی کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسی لیے عاشق بھی ہجر کی رات میں چاند کو تکتا اور اسی سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ وہ اس میں اپنے محبوب کی صورت دیکھتا ہے اور کبھی اسے محبوب کا چہرہ ہی سمجھ لیتا ہے۔ بقول شاعر:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا ۔۔۔ کچھ نے کہا کہ یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا (ابن انشا)

تشریح طلب شعر میں شاعرہ جدائی کی رات میں محبوب کی یاد کے حوالے سے بات کر رہی ہیں۔ محبوب سے جدائی کے لمحات بہت اذیت ناک ہوتے ہیں۔ عاشق کو شبِ ہجراں بہت طویل محسوس ہوتی ہے۔ اداسی، تنہائی، چاندنی اور محبوب سے دوری میں ایسا لگتا ہے جیسے ہجر کی رات کی سحر کبھی طلوع نہیں ہوگی۔ ایسے میں عاشق چاند سے باتیں کر کے ہجر کے دکھ کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس شعر میں شاعرہ کی کچھ ایسی ہی کیفیت ہے۔ وہ محبوب کی یاد میں چاند کو تک رہی ہے۔ اسے چاند کے حسن و جمال میں محبوب کا حسین چہرہ نظر آتا ہے۔ محبوب کی یاد میں شاعرہ چاند کے حسن و جمال میں اس قدر کھو گئی کہ اسے چاند میں محبوب کا سراپا نظر آنے لگا۔ چاند محبوب کی شباہت لیے دہلیز پر اتر آیا۔ اسے لگا کہ جدائی کے لمحے ختم ہو گئے ہیں اور شبِ ہجر، شبِ وصل میں بدل گئی ہے۔

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی ۔۔۔ درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی (فیض احمد فیض)

''کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند'' کا مطلب ہے کہ چاند جب دروازے پر چمکا تو اس میں محبوب کی شباہت کے آثار تھے۔ اس میں محبوب کے رخساروں کی تابانی، اس کی چاندنی میں محبوب کی مسکراہٹ کی تجلی اور اس کی قربت میں وہی سکون خموش تھا جو محبوب کی قربت میں ہوتا ہے۔ اس لیے شاعرہ کے دل سے محبوب کی جدائی کا اثر ختم ہونے لگا۔ اس کا دل خوش ہو گیا اور اس کی طبیعت میں تازگی بھر گئی۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہاتھ میں تیرا ہات نہیں ۔۔۔ صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں (فیض احمد فیض)

شعر کے دوسرے مصرع میں شاعرہ شبِ ہجراں سے مخاطب ہے۔ ہماری کلاسیکی شعری روایت میں شبِ ہجراں کو عاشق کے لیے طویل دردناک لمحوں کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ شبِ ہجراں سے مراد محبوب سے جدائی کی رات ہے۔ یہ رات غم، تنہائی اور بے قراری کی علامت ہے۔ شبِ ہجراں، عاشق کو محبوب کی یاد میں تڑپاتی ہے اس لیے عاشق کی نظروں میں شبِ ہجراں اس کی دشمن ہوتی ہے۔ شاعری میں اس رات کی کیفیت کو اکثر آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

چناں چہ جب شاعرہ یہ دیکھتی ہے کہ چاند اس کے محبوب کی شباہت لیے دہلیز پر اتر آیا ہے اور محبوب سے جدائی کا احساس ختم ہو گیا ہے تو وہ اپنی دشمن یعنی شبِ ہجراں کو شرمندہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ چاند کی آمد سے شبِ ہجر کی اذیتوں سے بچ گئی۔ اس نے جدائی کی رات کے تمام صدموں سے نجات پالی تو اسے اپنی قسمت کا ستارہ اوج پر محسوس ہونے لگا۔ اپنی تقدیر کے مقابلے میں اسے شبِ ہجراں کی تقدیر کم تر محسوس ہونے لگی۔ اس لیے وہ شبِ ہجراں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میری تقدیر کا ستارہ تو چمک اٹھا

ہے اب تم اپنی قسمت کا ستارہ دیکھو۔ تم مجھے رلانے آئی تھی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ تیرے افق پر چمکنے والا چاند میرے محبوب کی شباہت لے کر میرے آنگن کو روشن کر رہا ہے۔ اب تم ذرا دیکھو کہ تمھارے مقدر کا ستارہ گردش میں ہے۔ ''اپنا ستارہ دیکھنا'' سے مراد اپنی قسمت یا تقدیر کا جائزہ لینا ہے۔

ہمارے کلچر میں ستارہ دیکھنے کا تعلق قسمت اور تقدیر سے جوڑا جاتا ہے۔ قدیم زمانے سے لوگ ستاروں کی چال اور گردش کو انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا اشارہ سمجھتے آئے ہیں۔ علم نجوم میں ستاروں کی حرکت سے تقدیر کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی شاعرہ نے ''ستارہ دیکھنا'' کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

اس شعر میں سب سے نمایاں خوبی اس کی دل کش تشبیہ اور خوب صورت استعارہ ہے۔ شاعرہ نے چاند کو محبوب کی شباہت کا پیکر بنا کر دل نشین منظر پیش کیا ہے جو ایک عمدہ تشبیہ ہے۔ چاند کو محبوب کی شباہت سے جوڑنا اور دروازے پر چاند کا آنا ایک طلسماتی فضا قائم کرتا ہے۔ یہ محض ایک فطری منظر نہیں بلکہ محبوب سے روحانی وصل کا اشارہ بھی ہے۔ ''اے شبِ ہجراں'' کہہ کر رات کو جیتی جاگتی مخلوق کی طرح مخاطب کیا گیا ہے۔ ''ستارہ'' کو بھی تقدیر کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر شعر نہایت لطیف، دل نشین اور معنوی گہرائی سے بھرپور ہے۔

شعر نمبر 4

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہوئے
اُن ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

حلِ لغت قیامت ہے (مراد تباہی ہے) پسپا ہونا (شکست کھانا، ہارنا) مقابل (آمنے سامنے، مقابلے میں، مخالفت میں) صف آرا (جنگ کے لیے آمادہ)

مفہوم جن کی خاطر شکست کھائی ہو، انھی کو اپنے مقابل صف آرا دیکھنا انتہائی تکلیف دہ ہے۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ انداز بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

تشریح طلب شعر میں شاعرہ زمانے کی منافقت کا تذکرہ کرتی ہے۔ شاعرہ کہتی ہے کہ وہ لوگ جن کی خاطر ہم نے ہر میدان میں جان بوجھ کر شکست قبول کی اور حق پر ہوتے ہوئے بھی اپنے حقوق سے دست بردار ہوئے، وہی لوگ جب ہماری مخالفت پر اتر آئیں تو یہ بہت اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں پر احسان کیا جائے انھیں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ بقول یامین غوری:

انداز جسے زیست کے میں نے ہی سکھائے ۔۔۔ دیکھو کہ مرے آج مقابل بھی وہی ہے

شاعرہ کہتی ہیں کہ کبھی جن لوگوں کی خاطر اپنی عزت، اپنی انا اور اپنے خواب قربان کر دیے تھے، آج وہی لوگ محاذ پر سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ صدمہ ایک ہارے ہوئے دل کی آواز ہے۔ شاعرہ کے لیے یہ لمحہ قیامت کی طرح ہے کہ اسے محبت اور وفا کا بدلہ دشمنی کی صورت میں ملا۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے ۔۔۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے (ثاقب لکھنوی)

شاعرہ ماضی کے ان لمحوں کو یاد کر رہی ہے جب اسے اپنے لوگوں کی عظمت، رفاقت اور محبت پر فخر تھا۔ مگر اب وقت بدل چکا ہے۔ حالات نے ایسا رنگ بدلا ہے کہ وہی محبتیں اور رفاقتیں دشمنی کے ہتھیاروں میں ڈھل گئی ہیں۔ یہ وقت کی بے ثباتی اور دنیا

کی ناپائیداری کا بیان ہے۔ یہی دنیا کی حقیقت ہے کہ رشتے، تعلقات اور وعدے وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ انسان اکثر انھی سے زخم کھاتا ہے جنھیں اپنا مان کر دل کے قریب رکھا ہوتا ہے۔ جنھیں اپنوں کی صف میں شامل دیکھ کر دل کو بھروسا ہوا اور ان کے لیے جدوجہد اور قربانی کو باعثِ فخر سمجھا ہو، انھی کو دشمنوں کی صف میں دیکھ کر دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ ایسے رویے دیکھ کر لوگوں پر اعتماد نہیں رہتا۔ ایسے لوگ مدِ مقابل ہوں تو ان پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی ہزار بار سوچنا پڑتا ہے کیوں کہ کل تک وہ ہمارے ساتھ ہی تھے۔ یقیناً اپنوں کی بے وفائی دل میں ایک بے نام سی خلش چھوڑ جاتی ہے۔

شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ شاعرہ کو محبوب کے منافقانہ رویے پر شکوہ ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ محبوب کی خاطر ہم نے بے شمار قربانیاں دیں۔ اپنی خواہشات اور تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنی ضد اور اَنا کو مار دیا۔ ہم نے اپنی ہر جیتی ہوئی بازی ہار کر صرف محبوب کی خاطر اپنی شکست کو قبول کیا۔ صرف یہ سمجھ کر کہ محبوب کی جیت میں ہی ہماری جیت ہے۔ محبوب جیتا تو ہم جیتے۔ بقول شاعر:

انا مدِ مقابل ہو تو ہم پسپا نہیں ہوتے　　محبت روبرو آئے تو سب کچھ ہار جاتے ہیں

لیکن وقت پڑنے پر محبوب نے احسان فراموشی کرتے ہوئے ہماری ہی مخالفت کرنا شروع کر دی اور ہمارے ہی مدِ مقابل صف آرائی کی۔ اس نے رقیب سے یارانہ بڑھایا اور اس کے ساتھ مل کر ہمیں مزید تکالیف سے دوچار کیا۔ بقول شاعر:

وہ آج میرا نام مٹانے پہ تلا ہے　　جو شخص جواں میری دعاؤں سے ہُوا تھا　　(رضا ٹوانہ)

انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنے محسن کے سامنے سر جھکاتا ہے۔ لیکن بعض احسان فراموش اور منافقت پسند لوگ فطرت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے محسن ہی کے خلاف چلے جاتے ہیں اور اس کا احسان ماننے کی بجائے اس کے مدِ مقابل دشمنوں کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر ایک حساس دل کے حامل شخص کے لیے بہت دل شکن ہوتا ہے۔

شعر میں ''پسپا''، ''مقابل'' اور ''صف آرا'' کے الفاظ کو علامتی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی قبیل کے الفاظ ہیں، جو صنعت مراعات النظیر کی خوب صورت عکاسی کرتے ہیں۔ شعر میں جذبات کی شدت اور صدمے کی گہرائی کو خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ شعر میں خارجی منظر اور داخلی کرب کو ایک ساتھ سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ بیان میں ایسی روانی ہے کہ قاری دل کی کیفیت کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ سادگی، جذبے کی شدت اور تصویری منظر کشی اس شعر کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

شعر نمبر 5

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

حل لغت جی (دل، خواہش) زیاں (نقصان) بازی (کھیل) خسارہ (گھاٹا، نقصان)

مفہوم جس کھیل کی جیت میں بھی دل کا نقصان ہوتا ہو، ایسی بازی ہارنے میں بھی کوئی نقصان نہیں۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ اندازِ بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

تشریح طلب شعر میں شاعرہ کہتی ہے کہ عشق کا کھیل ایسا کھیل ہے جہاں جیت بھی جاؤ تو دل کا نقصان پہلے ہوتا ہے۔ یعنی محبوب حاصل کرنے سے پہلے محبوب کی محبت اختیار کرتے وقت دل کی خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور اپنے دل سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ چناں چہ شاعرہ کہتی ہے ایسی بازی ہارنے میں بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ یعنی اس کھیل میں تمھاری جان بھی

چلی گئی یا تم نے جان قربان کر دی تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے کیوں کہ اس سے محبوب کی نظروں میں تمھاری وقعت بڑھ جائے گی اور تمھاری وفاداری پر مہر ثبت ہو جائے گی۔ بقول شاعر:

اس شرط پہ کھیلوں گی میں تجھ سے پیا بازی　　جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

عموماً لوگ کوئی بھی کھیل اس لیے کھیلتے ہیں کہ وہ بازی جیت سکیں۔ عمومی رجحان یہ ہے کہ جیتنے والے کی عزت افزائی ہوتی ہے اور ہارنے والے کو بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شاعرہ کہتی ہے کہ عشق کی بازی ایسی بازی ہے جس میں ہار ہو یا جیت دونوں صورتوں میں عاشق ہی کا فائدہ ہے، اسے نقصان کا نہیں سوچنا چاہیے۔ جیت کی صورت میں محبوب کا قرب حاصل ہوتا ہے جو عاشق کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ ہار کی صورت میں عاشق کے عشق کی صداقت عیاں ہو جاتی ہے اور اس کا عشق امر ہو جاتا ہے۔ وہ محبوب کی نظروں میں سربلند ہو جاتا ہے۔ چناں چہ دونوں ہی صورتوں میں فائدہ ہے، اس لیے عاشق کو نقصان کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ بقول فیض:

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا　　گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں
(فیض احمد فیض)

شاعرہ کہتی ہے کہ اگر عشق کی بازی میں، میں ہار رہی ہوں تو مجھے اس میں کوئی نقصان نہیں کیوں کہ یہ ایسی بازی ہے کہ اس میں جیتنے کی صورت میں بھی دل کا نقصان تو گوارا کرنا ہی پڑتا ہے۔ چناں چہ اس بازی میں خسارہ نہیں دیکھنا چاہیے۔ بقول یامین غوری:

نقصان ہوا کیا مجھے اس کاروفا میں　　میں عشق میں کھویا مرا حاصل بھی وہی ہے
(یامین غوری)

عاشق کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات محبوب کے تابع کر دے اور اس کی خواہش پر قربان کر دے۔ محبت کی راہ میں ملنے والی ہر تکلیف اس کا جذبۂ عشق مزید بڑھا دیتی ہے۔ کیوں کہ محبوب کی خاطر زخم کھانا اور دنیا کی تمام تر خواہشات سے دست بردار ہونا اسے محبوب کی نظر میں سرخرو کر دیتا ہے۔ اس کی ہار بھی جیت ہوتی ہے۔ سب کچھ لُٹ جانا اور لُٹا دینا اہلِ دنیا کی نظر میں ہار ہوتی ہے، جب کہ عاشق کی نظر میں یہ ہار نہیں بلکہ جیت ہے۔ بقول شاعر:

دل ٹوٹ بھی جائے تو محبت نہیں مٹتی　　اس راہ میں لٹ کر بھی خسارا نہیں ہوتا
(مظفر وارثی)

اس شعر میں ''جی کا زیاں'' اور ''بازی'' وضاحت طلب ہیں۔ یہاں ''جی کا زیاں'' سے مراد دل و جان کی بربادی اور داخلی شکست ہے۔ اس سے مراد وہ دکھ، غم اور تھکن ہے جو دل کو اندر سے خالی کر دیتی ہے۔ یہ ایک جذباتی اور روحانی نقصان ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو محبت یا جدوجہد میں ناکامی سے پہلے ہی انسان کو گھیر لیتا ہے۔ ''بازی'' سے مراد کوئی مقابلہ، کوئی محبت، کوئی تعلق یا کوئی جدوجہد ہے، جس میں انسان اپنی پوری جان لگا دیتا ہے۔ یہاں بازی سے مراد عام کھیل نہیں بلکہ وہ گہری روحانی جنگ ہے جو محبت، خواب یا جدوجہد کے میدان میں لڑی جاتی ہے۔ شعر میں ایک اور لفظ ''خسارہ'' بھی آیا ہے جو محرومی یا نقصان کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی جب پہلے ہی دل لٹ چکا ہو تو پھر ہارنے پر مزید کچھ کھونے کا احساس باقی نہیں رہتا۔

اب اس شعر کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ کسی تعلق یا امید پر انسان اتنا انحصار کر لے کہ اپنی ساری توانائیاں اور ساری خوشیاں اسی پر صرف کر دے۔ پھر جب وہ تعلق یا امید ٹوٹنے لگے تو انسان کو محسوس ہو کہ جو بچا ہے وہ محض ایک رسمی سی لڑائی ہے۔ اب چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو اصل نقصان تو پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یہ احساس انسان کو بے حس کر دیتا ہے۔ یعنی جی ہارنے کے بعد لڑائی کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ بعض اوقات جیتنے کے باوجود دل کو جو نقصان اٹھانا پڑتا ہے وہ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ جیت بھی کسی کام کی نہیں رہتی۔

جب دل پہلے ہی دکھ، قربانی اور تھکن سے چور ہو تو ظاہری جیت محض ایک بے جان فتح بن جاتی ہے۔ اسی لیے شاعرہ کہتی ہے کہ جس کھیل یا مقابلے میں جیتنے پر بھی دل ہار جاتا ہو، وہاں ہارنے سے مزید کیا نقصان ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہری فتح بھی شکست، اندر کا خالی پن باقی رہتا ہے۔ خواب، جذبات اور امیدیں ہی دل کا اثاثہ ہوتی ہیں۔ اس اثاثے کے لٹنے کے بعد اور دل کے اجڑنے کے بعد کسی ہار کا کوئی ڈر یا افسوس باقی نہیں رہتا۔

شعر میں "جیتنے" اور "ہارنے" کے الفاظ متضاد ہیں جو صنعتِ تضاد ہے۔ "جیتنے"، "جہاں" اور "جی" کے الفاظ میں حرف "ج" کی تکرار سے شعر کا صوتی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ "زیاں"، "ہار" اور "خسارہ" کے الفاظ کے مفاہیم کو شاعرہ نے خوب نبھایا اور ان کا برمحل استعمال کیا۔

شعر نمبر 6

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمھارا دیکھنا

حل لغت آئینہ (منہ دیکھنے کا شیشہ) کیا دکھائے گا (مراد کون سی انوکھی بات ہوگی)

مفہوم میرے لیے آئینے کا سامنا کرنا ہی مشکل تھا، تمھارا یوں مسلسل مجھے دیکھنا معلوم نہیں کیا کرے گا۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احساسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ اندازِ بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

تشریح طلب شعر میں شاعرہ کہتی ہے کہ جب میں آئینے میں اپنا حسن و جمال دیکھتی ہوں اور خود کو سنوارتی ہوں تو آئینہ مجھے مسلسل دیکھتا رہتا ہے۔ آئینے کا یوں دیکھنا مجھے اضطراب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اب اس سے بڑھ کر مزید اضطراب یہ ہے کہ محبوب کا دیکھنا آئینے کے دیکھنے سے بھی بڑھ کر ہے۔ چناں چہ شاعرہ کہتی ہے کہ اے محبوب پہلے آئینے کی آنکھ کیا کم تھی جو مجھے گھورتی رہتی تھی کہ اب تمھارا یوں مسلسل دیکھنا مجھے مزید بے چین کر دیتا ہے۔ بقول شاعر:

ہم نے دیکھا ہے روبرو ان کے — آئینہ آئینہ نہیں رہتا
(ابن مفتی)

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
(حسرت موہانی)

اُردو شاعری میں حسن کا خود کو آئینے کے سامنے سنوارنا اور گھنٹوں اپنے حسن و جمال کو دیکھتے رہنے کا مضمون کثرت سے پایا جاتا ہے۔ آئینے کا محبوب کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران ہونا، ایک عام سی بات ہے۔ مثلاً:

انداز اپنا دیکھتے ہیں آئینے میں وہ — اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو
(نظام رام پوری)

کر کے سنگھار آئے وہ ایسی ادا کے ساتھ — آئینہ ان کو دیکھ کے حیران ہو گیا
(فنا بلند شہری)

لیکن حسن کا آئینے سے شرما جانا اور اس کے سامنے آنے سے گریز کرنا بہت کم پایا جاتا ہے۔ حسن اپنے ہی عکس سے شرماتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ نزاکت اور شرم و حیا کی انتہا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ محبوب کا دیکھنا اسے مزید بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ آئینے کی خصوصیت ہے کہ وہ ہمیشہ انسان کو اس کا حقیقی عکس دکھاتا ہے۔ وہ بناوٹ اور دھوکا دہی سے کام نہیں لیتا۔ آئینے کی آنکھ شاعرہ کا ظاہری عکس دکھانے کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات و احساسات کی کیفیت بھی دکھا دیتی ہے جو شاعرہ کے چہرے سے عیاں ہو رہی ہوتی ہے۔ یعنی آئینے کی آنکھ شاعرہ کی ظاہری اور باطنی کیفیتوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ آئینہ دیکھ کر شاعرہ بے چینی اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ بقول شاعر:

آئینہ دیکھ کر خیال آیا — زندگی تجھ پہ بھی زوال آیا

اس پر مزید اضافہ محبوب کی نگاہوں نے کیا۔ محبوب کی نگاہ بھی ظاہری اور باطنی کیفیات بھانپ لیتی ہے۔ چہرے کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے دکھ کو دیکھ لیتی ہے۔ چناں چہ شاعرہ کہتی ہے کہ آئینے کی آنکھ کیا کم اذیت میں مبتلا کرتی تھی، اب تمھارا دیکھنا جانے کس طرح کے اضطراب میں مبتلا کرے گا۔ "جانے اب کیا کیا دکھائے گا" کا مطلب ہے کہ معلوم نہیں اب کیا کیا انہونی اور انوکھی بات ہوگی۔

آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
(مرزا غالب)

اس شعر میں "آئینے کی آنکھ" کا مطلب ہے آئینے کی صاف، بے لاگ اور غیر جانب دار نگاہ۔ آئینہ انسان کے چہرے، بدن، حالت اور ظاہری تاثرات کو جوں کا توں دکھاتا ہے۔ یہاں آئینہ ایک زندہ گواہ کے طور پر آیا ہے، جو کسی جھوٹ یا بناوٹ کے بغیر شاعرہ کی اصل حالت کو عیاں کرتا ہے۔

شعر میں "کیا کیا دکھائے گا" اس انجانے خوف، خدشے اور اضطراب کو ظاہر کر رہا ہے جو انکشافِ حقیقت کے بعد پیش آنے والا ہے۔ شاعرہ کہتی ہے کہ تمھاری آنکھ کہیں میرے دل کے نہاں خانوں میں چھپے ان رازوں اور دکھوں کو سامنے نہ لے آئے جنھیں میں نے کبھی اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اگر وہ راز تم پر عیاں ہو گئے تو پتہ نہیں مجھے کن کن مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

شعر میں ایک اہم اور غور طلب بات "تمھارا دیکھنا" ہے۔ یہ ایک بہت گہری ترکیب ہے۔ یہاں تمھارا دیکھنا سے مراد محبوب کا دیکھنا ہے لیکن محبوب کی آنکھ کا دیکھنا محض دیکھنے کا عمل نہیں بلکہ پرکھنے، جانچنے اور دل کی گہرائیوں تک اترنے کی صلاحیت کا استعارہ ہے۔ محبوب کی نظر ایک زندہ، حساس اور ادراک رکھنے والی نظر ہے۔ محبوب کی آنکھ صرف ظاہری حقیقت نہیں دیکھتی بلکہ اندر کی شکست و ریخت کو بھی محسوس کر سکتی ہے۔

شاعرہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ آئینہ جو ہمیشہ ظاہری حقیقت کو پیش کرتا ہے۔ اس نے میری ظاہری تھکن، شکستگی اور مایوسی دکھا دی ہے۔ میں جو کچھ چھپانا چاہتی تھی، آئینے کی آنکھ نے وہ سب دکھا دیا ہے۔ اب تمھاری آنکھیں، جو دل کی گہرائیوں میں جھانک سکتی ہیں، شاید میرے باطن کی ساری کیفیات کو نمایاں کر دیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو پتہ نہیں مجھے کن کن رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاعرہ چاہتی ہے کہ اس کی دلی کیفیات کسی پر عیاں نہ ہوں تاکہ محبت کا بھرم رہ جائے۔

شعر میں "کیا کیا" کے الفاظ کی تکرار ہے۔ یہ صنعتِ تکرار کا خوب صورت استعمال ہے۔ "آئینے کی آنکھ"، "تمھارا دیکھنا" اور "کیا کیا دکھائے گا" کے الفاظ اپنے اندر گہرے مفاہیم رکھتے ہیں۔ شاعرہ نے مختصر الفاظ میں گہرے مفاہیم کو سمو دیا ہے۔

شعر نمبر 7

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

حل لغت مشت خاک (مٹھی بھر خاک، مراد انسان) زد میں (مقابل، سامنے) بے بسی (بے اختیاری، مجبوری)

استعارہ (علامت)

مفہوم میری بے بسی ملاحظہ کیجیے کہ میں ایک مٹھی بھر خاک کی مانند بے حیثیت ہوں اور ہوا کے مقابل کھڑی ہوں۔

تشریح

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ انداز بیان پروین شاکر کی شاعری کی خاص خوبیاں ہیں۔

تشریح طلب شعر میں شاعرہ کہتی ہے کہ میری زندگی کی بے اختیاری اور بے بسی دیکھیے کہ میں ایک مٹھی بھر خاک کی مانند بے حیثیت اور بے مایہ انسان ہو۔ زندگی کی مشکلات اور مصائب کے درمیان گھری ہوئی ہوں۔ ''مشتِ خاک'' سے مراد انسان ہے اور ''ہوا'' مشکلات اور مصائب کی علامت ہے۔ جس طرح مٹھی بھر خاک کو تیز ہوا کا جھونکا ایک لمحے میں اُڑا کر بکھیر دیتا ہے اور خاک کے ذرات ہوا میں دور دور تک بکھر جاتے ہیں، اسی طرح شاعرہ کی زندگی کا بھی کوئی بھروسا نہیں کہ وہ کب بکھر جائے وہ کب ختم ہو جائے۔ بقول شاعر:

آدمی بلبلا ہے پانی کا کیا بھروسا ہے زندگانی کا (مولوی عبدالرضا رضا)

شاعرہ مٹھی بھر خاک کی طرح بے حیثیت اور بے مایہ ہے جو زندگی کے مسائل، مشکلات اور مصائب کے درمیان گھری ہوئی ہے۔ مصائب کی تند و تیز آندھیاں اس کی ہستی کو بکھیرنا چاہتی ہیں لیکن شاعرہ عزم و حوصلے کے ساتھ ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہے اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کر رہی ہے۔ لیکن اسے امید نہیں ہے کہ وہ ان تند و تیز آندھیوں کا مقابلہ کر بھی پائے گی یا نہیں۔ وہ اپنی بے بسی اور بے اختیاری اور مجبوری کا گلہ کرتی ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(میر درد)

شعر کا عمومی تناظر میں مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ انسان کی حیثیت مٹھی بھر خاک جتنی ہے۔ جس طرح تیز ہوا مٹھی بھر خاک کو بکھیر کر اڑا دیتی ہے اسی طرح انسان کو مشکلات اور مصائب توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور اس کے وجود کو بکھیر دیتے ہیں۔ جس طرح مٹی بے مایہ و بے حیثیت ہوتی ہے اور ہوا کے رحم و کرم پر ہوتی ہے اسی طرح انسان کی زندگی بھی بے مایہ و بے حیثیت ہے اور وہ زمانے اور حالات کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ کسی بھی وقت، کہیں بھی ختم ہو سکتی ہے۔ انسان اس معاملے میں بالکل بے بس ہے۔ اس کا زندگی اور موت پر کچھ اختیار نہیں ہے۔ نہ دنیا میں آنے پر اس کا اختیار ہے اور نہ دنیا سے جانے پر اس کا کوئی اختیار ہے۔ اس معاملے میں وہ بے اختیار و بے بس ہے۔ صرف خدا کی مرضی چلتی ہے۔ بقول شاعر:

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے
(ابراہیم ذوق)

اس شعر میں ''مشتِ خاک'' اور ''ہوا کی زد میں ہے'' بہت عمدہ تراکیب ہیں۔ ''مشتِ خاک'' سے مراد انسان کی فطری حالت ہے۔ یعنی انسان مٹی سے بنا ہے اور آخرِ کار وہ مٹی میں مل کر مٹ جاتا ہے۔ یہ الفاظ انسان کی فانی نوعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ انسان کے کمزور ہونے اور اس کے وجود کے عارضی ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ہوا کی زد میں ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی تمام کوششوں اور ارادوں کے باوجود حالات کے رحم و کرم پر ہے۔ جس طرح ہوا کسی بھی وقت مٹی کے ذرے کو اڑا کر کسی بھی سمت لے جا سکتی ہے اسی طرح انسان بھی حالات کے تھپیڑوں کے زیرِ اثر

ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان پوری احتیاط اور کوشش کے باوجود قدرت کی طاقتوں اور حادثات کے سامنے بے بس ہے۔

شعر میں شاعرہ نے ''مشتِ خاک ہو کر انسان کے ہوا کی زد میں ہونے'' کو زندگی کی بے بسی کا استعارہ قرار دیا ہے۔ انسانی زندگی ابتدا ہی سے فنا کے سائے میں پروان چڑھتی ہے۔ انسان اپنے وجود کی بے ثباتی اور ناتوانی کو لیے، ہمیشہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ سب کوششوں اور جد و جہد کے باوجود آخر کار وہ وقت اور تقدیر کے سامنے بے بس ہی رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے۔

شعر میں انسان کی ہستی کے لیے ''مشتِ خاک'' کا استعارہ نہایت بلیغ ہے۔ ''ہوا کی زد میں ہونا'' کنایہ ہے۔ یعنی زندگی ہوا کے رحم و کرم پر ہے۔ یہ کمزوری، بے بسی اور بے یقینی کا اشارہ ہے۔ شعر دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائیداری کی عکاسی کرتا ہے۔

مشقی سوالات

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں۔

(الف) **پروین شاکر کو خوش بو کی شاعرہ کیوں کہا جاتا ہے؟**

جواب: پروین شاکر کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''خوشبو'' تھا جس نے انھیں بے پناہ شہرت اور مقبولیت عطا کی۔ اسی نسبت سے پروین شاکر کو خوش بو کی شاعرہ کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت، نسوانی حساسیت، محبت اور جدائی کو نہایت خوب صورتی اور گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔

(ب) **''سمندر'' اور ''کنارہ'' کن دو متضاد صورتوں کی علامتیں ہیں؟**

جواب: سمندر زندگی اور زندگی کی مشکلات کی علامت ہے جب کہ کنارہ منزلِ مقصود کی علامت ہے۔

(ج) **شاعرہ کے مقابل کون لوگ صف آرا ہوئے ہیں؟**

جواب: شاعرہ کہتی ہے کہ جن کی خاطر میں نے شکست قبول کی تھی وہی لوگ میرے مدمقابل صف آرا ہو گئے۔

(د) **پروین شاکر کے نزدیک جیت جانے میں ہار کا پہلو کس طرح پوشیدہ ہے؟**

جواب: شاعرہ کے نزدیک عشق کی بازی جیت جانے کی صورت میں بھی دل کا نقصان ہوتا ہے۔ دل ہارنا پڑتا ہے۔

(ہ) **شاعرہ نے آخری شعر میں انسانی بے بسی اور بے ثباتی کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے؟**

جواب: شاعرہ کہتی ہے کہ انسان کی ہستی ایک مٹھی بھر خاک کی مانند بے حیثیت ہے جو ہوا کے مقابل ہے۔ ہوا کا تیز جھونکا اسے کسی بھی وقت اُڑا کر بکھیر سکتا ہے اور اس کا نام و نشان مٹا سکتا ہے۔

۲۔ **مصرعے مکمل کریں:**

(الف) بادباں کھلنے سے پہلے کا ۔۔۔۔۔۔ دیکھنا
(ب) کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر ۔۔۔۔ ہوئے
(ج) جیتنے میں بھی جہاں جی کا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پہلے سے ہے
(د) ایک ۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
(ہ) ایسی بازی ۔۔۔۔۔ میں کیا خسارہ دیکھنا

جواب:

(الف) ۔۔۔ بادباں ۔۔۔۔۔ کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
(ب) کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر ۔۔ پسپا ۔۔ ہوئے

(ج) جیتنے میں بھی جہاں جی کا۔۔۔۔زیاں۔۔۔پہلے سے ہے
(د) ایک۔۔مشتِ خاک۔۔۔۔اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
(ہ) ایسی بازی۔۔۔۔ہارنے۔۔۔۔۔۔میں کیا خسارہ دیکھنا

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(الف) شاعر دیکھنے کا کہہ رہی ہیں:
(الف) کنارہ (ب) طوفان (ج) سمندر (د) ساحل

(ب) بچھڑنا نہ تھا:
(الف) دشوار (ب) آسان (ج) مشکل (د) قیامت

(ج) دروازے پر آیا:
(الف) چاند (ب) سورج (ج) ستارہ (د) سیارہ

(د) مقابلے پر وہ لوگ آ گئے جن کے نام پر ہوئے:
(الف) قربان (ب) بدنام (ج) پسپا (د) شکستہ

(ہ) شاعرہ کے لیے کچھ کم نہ تھی:
(الف) نرگس کی آنکھ (ب) آئینے کی آنکھ (ج) غزال کی آنکھ (د) بیمار کی آنکھ

۴۔ غزل کے درج ذیل اشعار کی تشریح فکری اور فنی حوالوں سے کریں۔

(الف) آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمھارا دیکھنا
(ب) ایک مشت خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

جواب: دیکھیے تشریح اشعار۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں:

بادباں شباہت صف آرا مشتِ خاک شبِ ہجراں

جواب:

الفاظ و تراکیب	معانی
بادباں	وہ پردہ جو بحری جہاز کا رخ بدلنے یا اسے ہوا کے زور پر چلانے کے لیے لگایا جاتا ہے
شباہت	ہم شکل
صف آرا	جنگ کے لیے آمادہ
مشتِ خاک	مٹھی بھر خاک، مراد انسان
شبِ ہجراں	جدائی کی رات

۶۔ پروین شاکر کی زیرِ نظر غزل پر ایک استحسانی اور تنقیدی نوٹ لکھیں۔

جواب:

پروین شاکر جدید لب و لہجے کی شاعرہ تھیں جنھوں نے عورت کے جذبات و احسات کو لطیف پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی شاعری نہ تو روایتی عشقیہ شاعری ہے اور نہ کھل کھیلنے والی رومانوی شاعری۔ جذبات و احساسات کی شدت اور سادہ لیکن فنکارانہ اندازِ بیان انھیں دیگر شاعرات سے بہت منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں ہمہ گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔

اس غزل میں انھوں نے جذبات کی شدت اور احساسات کی گہرائی کو انتہائی سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں نہایت مہارت سے کام لیا گیا ہے۔ تشبیہ، استعارہ اور محاورات کے برمحل استعمال نے شعر کی چاشنی کو مزید بڑھا دیا ہے۔ صنائع بدائع کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ صنعتِ تکرار، صنعت مراعات النظیر اور صنعتِ تضاد کا خوب صورت استعمال کیا گیا ہے۔ اشعار کی زبان اور شعر کی بُنت ایسی ہے کہ قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

۷۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں:

جواب:

الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب	الفاظ	اعراب
مقابل	مُقَابِل	زیاں	زِیاں	آئینہ	آئِینہ
استعارہ	اِستِعارَہ	شباہت	شَباہَت		

۸۔ پروین شاکر کی اس غزل کے قوافی اور ردیف کی نشان دہی کریں:

جواب:

قوافی: اشارہ، کنارہ، دوبارہ، ستارہ، صف آرا، خسارہ، تمھارا، استعارہ

ردیف: دیکھنا

سرگرمیاں برائے طلبہ:

اس غزل کو کمرہ جماعت میں درست تلفظ کے ساتھ بلند آہنگ کے ساتھ پڑھیں۔

پروین شاکر کی کلیات ''ماہ تمام''، سکول / کالج کی لائبریری سے جاری کروائیں اور منتخب اشعار ڈائری میں نقل کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ:

پروین شاکر کے سوانحی کوائف اور شاعری کی منفرد خصوصیات سے طلبہ کو آگاہ کریں۔

طلبہ کو پروین شاکر کی شاعری اس کے کسی شعری مجموعے سے پڑھ کر سنائیں۔

طلبہ کو پروین شاکر کی شاعری کے موضوعات کا تعارف کرائیں۔